حضرت محل

(ایک عظیم تاریخی ناول)

حضرت محل

(ایک عظیم تاریخی ناول)

○

آزادیٔ ملک کے لیے ایسے عظیم و جلیل کارنامے
انجام دینے والی خاتون کی داستانِ حیات، جس میں
شوخی بھی ہے اور حسرت بھی، حُسن کی کج کلاہی بھی
ہے، اور رعنائیٔ جمال کی جلوہ آرائی بھی!

◎

رئیس احمد جعفری

◎

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ∴ حیدرآباد ∴ کراچی

حضرت محل

(ایک عظیم تاریخی ناول)

آزادئ ملک کے لیے ایسے عظیم و جلیل کارنامے
انجام دینے والی خاتون کی داستانِ حیات، جس میں
شوخی بھی ہے اور حسرت بھی، حُسن کی کج کلاہی بھی
ہے، اور رعنائی جمال کی جلوہ آرائی بھی!

رئیس احمد جعفری

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور ∴ حیدرآباد ∴ کراچی

نگاہِ اوّلیں !

برِصغیر کی تحریکِ انقلاب کی جسے ۱۸۵۷ء کا غدر کہا جاتا ہے، اصل رہنمائی، اپنے لازوال اور غیرفانی کارناموں کی بدولت ایک عورت نے کی۔

اور یہ لڑکی کون تھی ؟

" اربابِ نشاط کے گھر میں پیدا ہوئی، بچپن میں فتنہ تھی، جوانی میں قیامت بن گئی۔ صورت سحر طراز، انداز دل فریب، چتون میں شوخی، باتوں میں لگاوٹ، تبسم جاں ستاں عشوہ و غمزہ، دشمنِ ایمان و رہزنِ تمکیں، رقص میں برق، نغمہ سرائی میں طاق، وہ ساقیِ گلفام بھی تھی اور مطربِ خوش نوا بھی۔ گھر میں صرف اُمراؤ تھی۔ واجد علی شاہ کے " پری خانہ " میں مہک پری بن گئی، اور جب ایک چاند سے لڑکے کی ماں بنی تو حضرت محل خطاب پایا۔

پھر جب !

آزادی کی جنگ چھڑی تو اس نے ایک سپاہی کی طرح تلوار سنبھالی، ایک فرماں رواں کی طرح حکومت کی، ایک مدبّر کی طرح سیاست کی گتھیاں حل کیں۔

(جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ)

طابع ــــــــــــــــــــ شیخ نیاز احمد
مطبع ــــــــــــــــــــ علمی پرنٹنگ پریس، لاہور
اشاعت اوّل ــــــــــــــــــــ ۱۹۶۹ء
قیمت ــــــــــــــــــــ ۲۰ روپے

ناشرین

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی، لاہور

دورِ شادمانی

اس نے رعایا کو نوازا ، سپاہیوں میں حوصلہ پیدا کیا ، اور بہت ہی مختصر مدت میں ایسے شاندار کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ میں ایک مستقل ، اور باعزت مقام حاصل کر لیا ۔

لوگ اس کا ذکر سنتے ہیں ، اور احترام سے سر جھکا دیتے ہیں ——————

دشمن تک !

یہ اسی کی کہانی ہے !

دلچسپ اور سبق آموز !!

(۱)

لکھنؤ کے ایک بالاخانے پر، جو چوک میں واقع تھا، ایک جہاں دیدہ، اور عمر رسیدہ عورت سگّن رہتی تھی۔

ایک زمانہ تھا کہ سگّن جوان تھی اور سارے شہر میں اس فتنۂ عالم آشوب کی دھوم تھی۔ امیر اور وزیر اس پیکرِ جمال کے حضور میں سر جھکا کر حاضر ہوتے تھے، کسی سے بات کر لیتی، تو وہ اپنی قسمت پر فخر کرتا، کسی کی طرف توجہ کا اظہار کرتی، تو وہ نقدِ جاں نثار کرنے پر تیار ہو جاتا۔ کسی سے ہنس کر مخاطب ہوتی تو ایسا معلوم ہوتا، جیسے اُس نے دنیا کی سب سے بڑی نعمت پالی۔

شہر میں سگّن کا سکّہ چلتا تھا۔ اس کے دیدار کے لیے خلقت کا ہجوم لگا رہتا!

لیکن —— یہ قصّہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا!

اب سگّن بوڑھی ہو چکی تھی، بال سفید، چہرے پر جھرّیاں، آواز میں نہ وہ لوچ، نہ رس، نہ نغمہ۔ لوگ سُنی کی اَن سُنی کر دیتے، اب بازار میں اس کی قیمت گر چکی تھی۔ جہاں ہر وقت دولت کی ریل پیل رہتی تھی، وہاں اب اندوختے پر گزارا چل رہا تھا۔

حسُن، ہو یا شباب، کتنی مختصر عمر ہوتی ہے ان کی، ایک سایہ تھا کہ آیا اور گیا۔ سگّن جب جوان تھی، فتنۂ محشر خرام تھی، جوانی ڈھلی تو نمونۂ عبرت بن کر رہ گئی!

(۲)

سگن ایک روز اپنے بالاخانے پر یاس و حرماں کی تصویر بنی بیٹھی تھی کہ استاد ننھے خاں وارد ہوئے۔ یہ سگن کے زمانۂ عروج میں اس کے رقص و نغمہ کی محفل میں، اپنے فن کا خوب خوب مظاہرہ کر چکے تھے۔ اب یہ بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔ لوگ انھیں اور ان کے فن کو بھول چکے تھے، بھولتے جاتے تھے۔ حال کے سامنے ماضی کو بھلا کون یاد رکھتا ہے۔ اب تو سگن عہدِ ماضی بن چکی تھی، اور استاد ننھے خاں بھی، دُوسری طوائفوں کی گرم بازاری تھی، اور ان کے ہاں جو سازندے اور موسیقار اور کلاونت مامُور تھے، ان کا سکّہ چل رہا تھا، سگن کو سب نے چھوڑ دیا تھا، لیکن استاد ننھے خاں رسم و وفا اب تک نباہے چلے جا رہے تھے۔ روز نہیں تو دُوسرے تیسرے ضرور آتے تھے، اور گھڑی دو گھڑی باتیں کر کے اور ایّامِ رفتہ کی یاد میں آنسو بہا کر چلے جاتے تھے۔

استاد ننھے خاں نے سگن سے کہا :

"آج کچھ افسردہ سی نظر آ رہی ہو کیا بات ہے ؟"

سگن نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور کچھ سوچتے ہُوئے کہا :

"نہیں کوئی خاص بات نہیں !"

وہ مسکرائے، اور پان کا بیڑا منہ میں رکھتے ہُوئے بولے :

"ہم سے نہ اڑو، جو کچھ ہے کہہ ڈالو، اس طرح دل کا بوجھ اُتر جاتا ہے۔"

سگن نے ایک آہِ سرد کے ساتھ جواب دیا :

نہ وہ ناؤ ونوش کے ہنگامے، نہ رقص وموسیقی کی مجلسیں، نہ بات بات پر جان فدا کرنے والے عاشق۔ اب تو ایک سنّاٹا تھا! —— اللہ رے سنّاٹا، آواز تک نہیں آتی۔ وہی بالاخانہ جہاں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی۔ اب ایک ویرانہ بن گیا تھا، جہاں سے کوئی مسافر گزرتے ہوئے ڈرتا، اور وحشت کھاتا تھا۔

دنیا کی یہی ریت ہے!

ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے! جشنِ عشرت کو مجلسِ ماتم میں تبدیل ہوتے کیا دیر لگتی ہے، جس طرح زندگی بے ثبات ہے، اسی طرح حُسن بھی، جمال بھی، رعنائی بھی، آنکھوں کا جادو بھی، اور باتوں کا سحر بھی، ——

جب آنکھ کُھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا!

اور سگن کی آنکھیں اب کُھلی تھیں، جب سود و زیاں کے جھمیلے سے وُہ آزاد ہو چکی —— تھی!

◎

"کہہ تو دیا کہ کوئی خاص بات نہیں، البتہ امراؤ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔"
استاد نے پوپلے منہ سے ایک قہقہہ لگایا، اور فرمایا :
"امراؤ کی فکر کھائے جا رہی ہے؟ یہ کیوں بھائی؟"
"ماشاء اللہ تیرھواں سال شروع ہو چکا ہے!"
"بس ایک سال اور گزرنے دو، پھر شہر میں وہی وہ ہو گی، دیکھ لینا، سب کا بازار سرد نہ کر دے تو استاد نتھّے خاں نام نہیں۔"
"(چڑتے ہوئے) بیکار باتیں نہ کرو، خالی رُوپ سے کیا ہوتا ہے؟"
"ارے بھئی رُوپ ہی تو سب کچھ ہے۔ اور میں کہہ سکتا ہُوں، اس جیسی رُوپ وتی شہر کیا سارے ملک میں چراغ لے کر ڈھونڈو، تب بھی نہیں مل سکتی!"
"نہیں اُستاد —— رُوپ کے ساتھ گُن بھی ہونا چاہیئے۔ تُم اس پر ذرا بھی توجہ نہیں کرتے۔"
"میں تو لاکھ توجہ کرتا ہُوں، لیکن وہ تو بجلی ہے بجلی۔ کمرے میں بھی ہرن کی طرح وہ چوکڑیاں لگاتی ہے کہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہُوں۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور اس کے بجائے سگّن کا چہرہ نظر کے سامنے آجاتا ہے، وہی شوخی، وہی شرارت، وہی نٹ کھٹ پن، اور وہی رُوپ، لیکن بھئی کہوں گا ایمان کی، روپ میں تم سے کچھ زیادہ ہی ہے!"
"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن استاد اسے کامل بنا دو، گانے پر وہ ذرا بھی توجہ نہیں کرتی۔"
"اوّل تو بوڑھا ہُوں۔ اب کسی کو کامل کیا بناؤں گا۔ رہا اس کا توجہ نہ کرنا، تو اس کا بس چلے تو دو چار چپت میرے شفّاف سر پر بھی جھاڑ دیا کرے، یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ایک دن میں اسے فن سکھانے کے لیے پہنچا، آئینہ سامنے تھا، وہ پیچھے

کھڑی تھی، اور صاف نظر آرہی تھی۔ اے بی! دیکھتا کیا ہُوں کہ چپت اٹھائے ہُوئے ہے، گویا اب میرے سر پر جھاڑا ہی چاہتی ہے، ———

" (ہنس کر) تم نے تو اسے اور زیادہ شوخ اور چنچل بنا دیا ہے ——— اور اپنے بڑھاپے کا رونا کیا لے کر بیٹھ گئے؟ جتنے جتنے بوڑھے ہو رہے ہو، تمہارا فن جوان ہو رہا ہے۔ ناقدروں کا ذکر چھوڑو، لیکن ایمان سے کہتی ہوں کہ تمہاری ٹکّر کا موسیقار، سارے ملک میں نہیں مل سکتا!"

" جبھی خوشامد کی کیا ضرورت ہے، میں تو ہر خدمت کو حاضر ہوں، کہو تو دن رات یہیں پڑا رہوں، لیکن ذرا صاحبزادی کو بھی تو سمجھاؤ، وہ نہ سیکھنا چاہیں تو کیا گھول کر پلا دوں اپنا فن ان کو!"

" سیکھے گی، سیکھنا پڑے گا، اپنے جیتے جی تو اپنے خاندان کو تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتی، میں اسے رنڈی بنانا نہیں چاہتی۔ رقص اور نغمہ میں کامل بنا دینا چاہتی ہُوں۔ رنڈیوں سے تو سارا چوک بھرا پڑا ہے، ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ تو کیا ہُوا!"

◎

"کیا کرتی ہے وہ؟"

"کرتی کیا ہیں؟ ——— کبھی گنگنا رہی ہیں، کبھی اپنی تصویریں دیکھ رہی ہیں، کبھی خود کہانی سنا رہی ہیں۔ کبھی مجھے حکم دیتی ہیں کوئی سناطلسم ہوش رُبا!"

استاد ننھے خاں یہ پروگرام سُن کر بول پڑے:

"ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ یہ ہیں صاحبزادی کے لچھن ——— فن بغیر ریاض کے آتا نہیں، اور جو لڑکی صبح ۱۱ بجے سو کر اٹھتی ہو، اور رات کو دو بجے سوتی ہو، وہ بھلا کیا ریاض کرے گی؟"

"ریاض تو کریں گے اس کے اچھے، لیکن استاد آپ تو رقص کے بھی استاد ہیں، یہ فن بھی آپ ہی کو سکھانا ہے!"

"بھئی، مجھے تو جو کچھ آتا ہے، سب سکھانے پر تیار ہوں ——— ایک بات بتاؤں؟"

"فرمایئے، پوچھ کیوں رہے ہیں؟"

"میرے دل میں خود خیال آیا تھا کہ اس لڑکی کو خدا نے اتنی اچھی کاٹھی دی ہے کہ اگر رقص سیکھ لے تو اس فن میں لاجواب ہوگی!"

"پھر ———؟"

"پھر یہ ——— ایک دن میں نے کہا: بیٹی تمھیں ناچنا بھی سیکھنا پڑے گا۔"

کہنے لگی:

"وہ تو میرا بھی جی چاہتا ہے، اور آپ ہی آپ کچھ مشق بھی کرتی رہتی ہوں۔ لیکن سکھائے گا کون؟"

میں نے جواب دیا: ——— "سکھائے گا کون؟ میں کس

(۳)

استاد ننھے خاں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سگن نے گھر کی ملازمہ اصغری کو بلایا، وُہ حاضر ہوئی تو کہا :

"جا بٹیا کو بُلا لا ذرا"

وہ بولی :

"سرکار وہ تو آرام کر رہی ہیں اس وقت !"

سگن نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا اور پوچھا :

"دس بج رہے ہیں اور وہ آرام کر رہی ہے اب تک ؟"

اصغری نے جواب دیا :

"وہ تو ہر روز گیارہ بجے کے قریب سو کر اُٹھتی ہیں، پھر نہاتی دھوتی ہیں، کوئی بارہ بجے کے قریب ناشتہ کرتی ہیں ——"

"اور دوپہر کا کھانا ؟"

"چار بجے سرکار !"

"اور رات کا کھانا ؟"

"دس بجے سرکار !"

"اور سوتی کس وقت ہے ؟"

"کبھی بارہ بجے، کبھی ایک بجے، کبھی دو بھی بج جاتے ہیں سرکار !"

لا یئے ـــــ اور ہاں اس کا لحاظ رکھیئے گا، وہ بوڑھی نہ ہو!"

سگن یہ باتیں سُن کر مسکرانے لگی،

استاد نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں نے کہا، بیٹی! فن تو بوڑھوں ہی کو آتا ہے، جوان کیا جانیں؟" ـــــ یہ سن کر جانتی ہو کیا کہا؟"

سگن نے، تبسّم کو روکتے ہوئے سنجیدگی اختیار کر کے کہا:

"بتایئے" ـــــ

استاد نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں فرمایا:

"کہنے لگیں، تو پھر میں باز آئی، ناچنا سیکھنے سے، خُود ہی مشق کر لیا کروں گی ـــ اچھا خاصا تو آتا ہے مجھے، دیکھیے، ـــــ

اور پھر صاحبزادی نے اپنا خود ساختہ رقص شروع کر دیا۔ جی چاہ رہا تھا خود کشی کر لوں، مگر رُک گیا ـــــ خود ہی سوچو بھلا یہ لچھن فن سیکھنے کے ہیں؟"

سگن نے کہا:

"ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے، بچہ ہے سمجھائے دیتی ہوں!"

◎

مرض کی دوا ہوُں ؟"

اپنا ہاتھ تقریباً میرے سینے تک لاتی ہوئی بولی :

" آپ سکھائیں گے ؟"

میں نے کہا :

" تو کیا ہوُا ؟"

" اے اب پھر جو اس پر ہنسی کا دورہ پڑا ہے تو کیا کہوں، ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھی !"

" دیکھ لوں گی اس حال زادی کو !"

" اجی وہ تو دیکھتی رہنا پوُرا ماجرا تو سُن لو ۔"

" سُن رہی ہوں کہے جائیے !"

" تھوڑی دیر کے بعد خود ہی کہنے لگی ، اچھا استاد سکھائیے !"

" میری تو شامت آ ہی چکی تھی، میں قسمت کا مارا راضی ہو گیا ۔"

" سکھایا بھی کچھ ؟"

" سکھایا کم سیکھا زیادہ ؟"

" یہ کیا بات ہوئی ؟ ———— سیکھا کیا ؟"

" یہ کہ بوڑھا ہونا ایک آفت ہے، اس سے مرجانا بہتر ہے ۔"

" ارے یہ کیوں ؟"

" میں نے صاحبزادی کی فرمائش کے مطابق پیشواز پہن ، رقص کا لباس زیب بدن کیا، اور ابھی پہلا دھاکہ مارا تھا کہ صاحبزادی فرماتی کیا ہیں۔ خدا کے لیے بس کیجیے، ورنہ میں دیوانی ہو جاؤں گی ، یہ سفید داڑھی ، یہ ناچنے کا لباس اور یہ رقص کی مشق ، نا بابا آپ سے تو یہ فن میں سیکھنے سے رہی، کسی اور استاد کا انتظام کر دیں، بلکہ بہتر یہ ہے کہ کسی عورت کو

"بیٹی ماشاء اللہ جوان ہو رہی ہو اب" ——

قطع کلام کرتے ہوئے، امراؤ نے استاد نھتے خاں سے پوچھا :

"جوان ؟ —— میں جوان ہو رہی ہوں ؟ —— کیا چیز ہوتی ہے جوانی ؟"

استاد نے سر پیٹ لیا، کہنے لگے :

"بھئی معاف کرو، مجھے، میں نے غلط لفظ استعمال کیا، کہہ یہ رہا تھا کہ اب تم بچّہ نہیں ہو" ——

پھر قطع کلام کرتی ہوئی بولی :

"واہ، امّی تو مجھے بچّہ ہی کہتی ہیں۔ وہ سچّی ہیں کہ آپ ؟"

استاد نے پھر پہلو بدلا :

"اچھا بچّہ سہی، لیکن کچھ گُن بھی تو سیکھو !"

"وہ تو سیکھ رہی ہوں۔"

"کیا خاک سیکھ رہی ہو ؟"

"ارے تو آپ مجھے گانا نہیں سکھاتے ہر دوسرے روز !"

"آتا تھیں سکھانے ہوں، لیکن جاتا تم سے سیکھ کر ہوں !"

"وہ کیسے استاد ؟"

"میں کچھ بتاتا ہوں، تم کچھ کرتی ہو —— سچ پوچھو تو ابھی تان لگانا تک نہیں آتی تھیں !"

وہ استاد کو چھوڑ کر اسی طرح ماں کے گلے میں باہیں ڈالے ڈالے کہنے لگی :

"دیکھیے امّی، استاد کی انہی باتوں سے میرے دل میں گھاؤ پڑ گئے ہیں۔"

سگن ہنسنے لگی۔ اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، اور کہا :

(۴)

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ امراؤ ماں کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔
آنکھیں اب تک خمار آلود تھیں، جیسے ابھی بستر سے اُٹھ کر آئی ہو۔ سن واقعی ۱۳-۱۴ سال سے زیادہ نہ تھا، لیکن اس عمر میں بھی چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ ہرن کی سی بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، کشیدہ قامت، دھان پان، لیکن کاٹھی مضبوط اور اچھی، اس نے آتے ہی ماں سے سوال کیا :

"آپ نے بُلایا امّی !"

سگّن نے ایک محبّت سے بھرپور نظر جس میں فخر بھی شامل تھا، اپنی بیٹی پر ڈالی اور کہا :

"ہاں میں نے بُلایا ہے ——— آؤ میرے پاس بیٹھو !"

وہ آکر ماں کے پاس بیٹھ گئی، اور بیٹھتے ہی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر اسے خوب سا پیار کیا، پھر کہنے لگی :

"امّی آپ مجھے اتنی اچھی کیوں لگتی ہیں ؟"

استاد نتھّے خاں نے دیکھا، پکائی تھی کھیر ہو گیا دلیا، بجائے اس کے کہ امراؤ پر ڈانٹ ڈپٹ ہوتی، اس پر فن نے آتے ہی بُری بُری پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے، اور وہ یقیناً اس کے جال میں پھنس جائیں گی۔ ——— لہٰذا خاموش رہنا مشکل ہو گیا، بول پڑے :

"یعنی میں تجھ سے جلتا ہُوں؟"

"ہاں جلتے تو ہیں!"

"وہ کیوں کر؟ وہ کیسے؟ بتا!"

"اس دن میں نے آپ کا مذاق جو اڑایا تھا ناچنے پر!"

"تو میں جل گیا؟"

"ہاں بہت زیادہ، اسی لیے تو اماں سے نہ جانے کیا کیا آپ نے میری شکایتیں کی ہیں، لیکن میں بھی کہے دیتی ہوں کہ ناچنا آپ سے نہیں سیکھ سکتی، نہیں سیکھ سکتی، وہ تو کسی عورت ہی سے سیکھوں گی اور وہ بھی کسی جوان عورت سے!"

بڑی بے بسی سے استاد نے سگّن کی طرف دیکھا اور کہا:

"لو سُن لو!"

سگّن نے امراؤ کو کلیجے سے لگا کر پیار کیا اور کہا:

"وہ تجھ پر جان فدا کرتے ہیں، ہر وقت بس یہی فکر رہتی ہے کہ تو ماہرِ فن ہو جائے، بھلا جل سکتے ہیں تجھ سے، اور بیٹی، فن میں مرد عورت کا کیا لحاظ؟ شہر میں جتنی بڑی بڑی اور مشہور رقاصائیں ہیں سب ہی استاد کی شاگرد ہیں۔"

"ناچنے میں؟"

"ہاں بیٹے اور کیا!"

"امّاں پھر میں ناچ نہیں سیکھوں گی!"

"کیوں بیٹی؟"

"انھیں ناچتے دیکھ کر کسی طرح بھی ہنسی ضبط نہیں کر سکتی! ——— پہلے کسی عورت کا انتظام کر دو، پھر دیکھا جائے گا، شاید ان سے بھی کچھ سیکھ لوں!"

"اچھا اچھا دیکھا جائے گا۔ تُو پہلے گانا تو سیکھ۔"

"کیوں ری تیرے دل میں گھاؤ پڑ گئے ہیں ابھی سے ؟"

امراؤ نے جواب دیا :

"اصل میں استاد مجھ سے جلے ہوئے ہیں ، اس لیے میری بُرائیاں کر رہے ہیں !"

سگن نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا :

"استاد ، تجھ سے جلیں گے پگلی ؟ اولاد کی طرح تو چاہتے ہیں تجھے !"

استاد نے دخل درمعقولات کرتے ہوئے کہا :

"یہاں بیوی بچوں کا جھگڑا ہی نہیں پالا ، شادی تک نہیں کی ، یا شادی کر لیتا ، یا فن کی طرف توجہ کرتا ، اب اس بڑھاپے میں تیرے سوا ، اور کسے بیٹی بنانے جاؤں گا جیسی تو سگن کی بیٹی ، ویسی میری بچی ۔ میں بھلا جل سکتا ہوں تجھ سے ؟ ذرا سوچ کر بات کیا کر !"

وہ بولی :

"چاہتے تو بے شک آپ مجھے بہت ہیں ، جب آتے ہیں ، میرے لیے کوئی مٹھائی ، یا کوئی اور چیز ضرور لاتے ہیں ۔ میں کھاتی جاتی ہوں ، اور دیکھتی رہتی ہوں۔ آپ اس محبت سے میرے کھانے کو دیکھ رہے ہیں جیسے یہ آپ کے پیٹ میں جا رہا ہے ، جیسے آپ خود کھا رہے ہیں !"

استاد آب دیدہ ہو گئے ، کہنے لگے :

"میری اس محبت کی یہ قدر کی تو نے کہ کہتی ہے میں تجھ سے جلتا ہوں !"

وہ بولی :

"بے شک آپ مجھے بہت چاہتے ہیں ، اولاد سے بھی زیادہ ، آپ کی سگی اولاد ہوتی ، تو بھی شاید اسے آپ کم چاہتے مجھے زیادہ ، لیکن سچ بہرحال سچ ہے !"

(۵)

اتنے میں اصغری آگئی، اس نے کہا :

" حمام تیار ہے۔ چلو بٹیا نہالو، پھر ناشتہ کر لو !"

وہ ماں کے پاس بیٹھی بیٹھی بولی :

" نہ نہائیں گے، نہ ناشتہ کریں گے۔"

اصغری نے پوچھا :

" یہ کیوں ؟"

وہ کہنے لگی :

" اماں کے پاس آکر کرنا دھرنا سب بھول جاتا ہے۔ ہم تو یہیں بیٹھیں گے اپنی اماں کے پاس !"

استاد بنّھے خاں کو ہنسی آگئی، کہنے لگے :

" واہ بھئی واہ، کمال حاصل ہے اس لڑکی کو بے وقوف بنانے میں، بی سگّن یہ باتیں سُن کر تمھارے دل میں محبّت کا طوفان اُٹھنے لگا ہوگا، خُوب پیار کر لو اِسے۔ اور پھر جب تعلیم کا وقت آئے، اور مجھے بے وقوف بنا کر یہ دھتکار دے تو کہہ دینا بچّہ ہے !"

سگّن نے ہنستے ہوئے کہا :

" استاد تم تو واقعی جلنے لگے ہو میری بچّی سے !"

اس سمجھوتے کو استاد برداشت نہ کر سکے، جل کر بولے :

"تمھی نے اسے بگاڑا ہے۔ بھئی ہر ماں کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے لیکن تم تو ہزار جان سے فریفتہ ہو۔ بس پھر عشق بازی کر لو، تعلیم گئی بھاڑ میں!"

سگّن ہنسنے لگی۔

"استاد آپ تو خفا ہو جاتے ہیں۔"

وہ بولے :

"یہاں خون کھولا جا رہا ہے، اور تم کہہ رہی ہو، آپ تو خفا ہو جاتے ہیں۔ اچھا مذاق ہے یہ بھی تمھارا۔"

"چکھ لینا، گرم ہوتا ہے، نہ کھانا ہی اچھا، ورنہ میں تجھے نہ دیتی!"
اصغری تو تعمیلِ حکم کے لیے چلی گئی۔
امراؤ نے ماں سے سوال کیا :
"گرم ہوتا ہے؟"
وہ بولیں :
"ہاں بیٹی!"
"تو پھر استاد کو بھی نہ کھانا چاہیئے!"
"اُونہہ انھیں کیا، وہ تو بوڑھے ہیں۔"
"میں بھی تو بچّہ ہوں!"
"تو ———؟"
"لوگ کہتے ہیں بوڑھا اور بچّہ ایک، لہٰذا اگر مضر ہے تو ہم دونوں کے لیے، مفید ہے تو ہم دونوں کے لیے!"
سگّن نے مسکراتے ہوئے استاد کی طرف دیکھا اور پوچھا :
"سُن رہے ہو اس بالشت بھر لڑکی کی باتیں!"
وہ اسی اکھڑے ہوئے لہجے میں بولے :
"ہاں بھئی، جو کچھ خدا سُنوا رہا ہے۔ سُن رہا ہوں!"
"اے لو، یہ بھی کوئی بری بات ہوگئی؟"
"بُری بات کیوں ہوتی، بڑے تو ہم ہیں!"
"استاد آج تمھیں ہُوا کیا ہے؟ کیا کسی سے لڑ کر آئے ہو؟"
"ہاں ———"
"کس سے بھلا؟"

وہ بہت ہی برہم ہوکر بولے :

" ہاں بھئی ، ہمارا زندگی میں اور کام ہی کیا رہ گیا ہے ؟ ———— اچھا بھئی چلیے !"

سگّن نے ہاتھ پکڑ کر استاد کو بٹھا لیا اور بولی :

" اب زیادہ بنو مت ، جاؤ گے کیسے ؟ ——— ابھی تمھیں تعلیم دینی ہے ، میری بچّی کو !"

وہ اُکھڑے ہُوئے لہجے میں کہنے لگے :

" آج تو مشکل ہے کل دیکھا جائے گا ۔"

" کیوں آج کیوں مشکل ہے ؟"

" آج کا دن تو تم لوگوں کی الفت اور محبّت کا دن ہے ، خوب ایک دوسرے کو پیار کر لو ، گلے لگ لو" ————

سگّن نے ہنستے ہوئے کہا :

" اب چھوڑو بھی یہ باتیں ، اور اصغری کہاں گئی ؟"

اصغری فوراً حاضر ہوگئی ، سگّن نے اس سے کہا :

" امراؤ کا ناشتہ یہیں لے آ ، میرے سامنے کرے گی ۔ حمام پھر کسی وقت دیکھا جائے گا ———— اور ہاں دیکھ کل شام کو میں نے انڈے کا حلوا بنایا تھا وہ بھی لیتی آنا استاد کے لیے ایک پلیٹ میں ، ارے موئی سنتی ہے ، ذرا سامنے لانا ، اچھا خاصا لانا ۔"

امراؤ کہنے لگی :

" امّاں ہم بھی انڈے کا حلوا کھائیں گے !"

سگّن نے جواب دیا :

ماں بیٹی ہیں !"

امراؤ نے کچھ شکایت آمیز لہجے میں کہا :

" واہ کہاں اماں، کہاں یئں ؟ ——— بھلا ان کا مقابلہ کون کر سکتا ہے ؟"

استاد نے چھیڑتے ہوئے کہا :

" اب تو بوڑھی ہو گئیں وہ !"

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا :

" خدا نہ کرے، اماں بوڑھی کیوں ہوتیں ؟ استاد ایسی باتیں نہ کیا کیجیے !"

" تو کیا کہہ دُوں جوان ہیں سگن بیگم ؟"

" آپ کہیں گے تب ؟ ہیں ہی !"

" کب تک رہیں گی ؟"

" ہمیشہ !" ———

" تو پھر ہم بوڑھے کیسے ہو گئے ؟"

" یہ مجھے کیا معلوم ؟"

" بھئی سگن مجھ سے عمر میں صرف ۵ سال چھوٹی ہیں !"

" ۵ سال ——— افوہ، اتنی چھوٹی ہیں اماں آپ سے ؟ ——— بہت چھوٹی ہیں پھر تو !"

" ہاں بھئی بہت، میں تو اس وقت بھی بوڑھا تھا، جب یہ بچہ تھیں !"

" لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

" سگن نہیں زبان بند کرو گی اس لڑکی کی ؟"

سگن نے ہنستے ہوئے کہا :

" اپنے مقدر سے، اپنے مقسوم سے!"

" ارے یہ کیوں؟"

" میں مرنے سے پہلے اس لڑکی کو کچھ بنا دینا چاہتا ہوں، اور تم اپنے چونچلوں میں اسے غارت کر دینے پر تلی ہوئی ہو۔ جناب امیرؓ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ اگر اسے سکھائے بغیر مر گیا تو قبر میں بھی میری پیٹھ نہیں لگے گی۔"

سگّن نے، امراؤ سے کہا :

" اٹھو، کھڑی ہو جاؤ!"

وہ کھڑی ہو گئی۔

سگّن نے حکم دیا :

" استاد سے معافی مانگو، اور، وعدہ کرو کہ اب انھیں شکایت کا موقع نہیں دو گی دل لگا کر ان سے تعلیم حاصل کرو گی۔"

امراؤ نے، یہ الفاظ استاد کو مخاطب کر کے دوہرا دیے۔ پھر کہنے لگی :

" لیکن اس تعلیم میں ناچ شامل نہیں ہے۔"

اس مرتبہ استاد کو بھی ہنسی آگئی۔ کہنے لگے :

" بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے اس لڑکی کی۔ نہ نچلی بیٹھ سکتی ہے، نہ خاموش رہ سکتی ہے، جو بات کہے گی، اس میں شوخی اور بذلہ سنجی ضرور ہوگی، اور ہاں بھئی کیوں نہ ہو، آخر کس کی لڑکی ہے، یہی حال ایک زمانے میں اس کی ماں کا بھی تھا۔"

سگّن نے کہا :

" استاد مجھے ہر بات میں کیوں شامل کر لیتے ہو؟"

وہ ایک آہِ سرد کے ساتھ گویا ہوئے :

" اسے دیکھ کر تم یاد آجاتی ہو، قسم ہے جناب امیرؓ کی، بال برابر جو فرق ہو

(۶)

تھوڑی دیر کے بعد استاد نتھے خاں چلے گئے ۔ سگن نے ان سے وعدہ لے لیا کہ کل سے روزانہ امراؤ کو تعلیم دینے آیا کریں گے ۔ سگن کی بات کار د کر دینا ان کے بس سے باہر تھا ، وعدہ کیا ، اور رخصت ہو گئے ۔

استاد نتھے خاں کے جانے کے بعد ، سگن نے امراؤ کو خوب سا پیار کیا ۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی :

" بیٹی ، ایک بات کہوں مان لے گی ؟ "

وہ بے کلی کے ساتھ گویا ہوئی :

" آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں اماں ، بھلا آپ کی بات نہ مانوں گی ؟ —— —— آپ کہیں تو ابھی یہاں سے نیچے چھلانگ لگا دوں ! "

سگن نے ایک مرتبہ پھر اسے بھینچ کر پیار کیا ، اور کہا :

" خدانخواستہ ایسا میں کیوں کہنے لگی ۔ "

امراؤ نے سوال کیا :

" اچھا تو پھر بتائیے کیا کہہ رہی تھیں آپ ؟ "

سگن نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا :

" بات یہ ہے بیٹی کہ ایک زمانے میں ہمارا یہ کوٹھا ، شہر میں سب سے اونچا تھا ۔ شہر کے رئیسوں اور امیروں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا یہاں ، دھن برستا تھا ،

"آخر اپنے بڑھاپے کے ذکر پر چڑ کیوں جاتے ہو؟"

"بڑھاپے میں تمھاری طرح جوان بن کر خوش ہونا میں نے نہیں سیکھا ہے!"

"مجھ سے سیکھ لو!"

"بجشو بھئی، کہاں تک سیکھوں؟"

اتنے میں اصغری، امراؤ کے لیے ناشتہ، اور استاد ننھّے خاں کے لیے انڈے کا ڈھیر سا حلوا لے کر آگئی۔ استاد نے بغیر کسی تکلّف اور انتظار کے، حلوے کی پلیٹ اپنی طرف کھسکا لی، اور کھانا شروع کر دیا۔

امراؤ اپنا ناشتہ کرنے لگی اور سگن محبّت بھری نظروں سے اسے تکنے لگی۔

◎

اصغری نے پوچھا :

"بی بی آج کیا پکے گا ؟"

سگّن نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور کہا :

"ہزار مرتبہ کہہ دیا ، یہ سوال کھانے والی سے کیا کر ؟ —— میری بچّی سے پُوچھ !"

اصغری نے امراؤ کو مخاطب کیا :

"بتاؤ بٹیا کیا پکاؤں ؟"

وہ بولی : "پلاؤ ، زردہ ، قورمہ ، شامی کباب ، فِرنی !"

اصغری نے حیرت سے یہ فہرست سُنی اور کہا :

"اتنی ساری چیزیں بٹیا ، ایک ہی وقت میں ؟"

سگّن نے تیوری چڑھا کر کہا :

"تو کیا ہُوا ؟ گھر میں ایک چھوڑ ، دو دو باورچی ہیں ، تو بھی اچھا خاصا پکا لیتی ہے ، یہ چیزیں کیوں نہیں پک سکتیں ؟ پکیں گی ، اور ساری کی ساری پکیں گی ، میں یہ نہیں چاہتی کہ میری بچّی کسی چیز کو ترسے ؟"

امراؤ نے اصغری سے پوچھا :

"سُن لیا —— ؟"

وہ زیرِ لب تبسّم کے ساتھ گویا ہوئی :

اس گھر میں، دولت کی ریل پیل تھی کہ دشمن حسد کے مارے مرے جاتے تھے مگر اب تُو دیکھ رہی ہے کیا حالت ہے؟"

"اب تو کوئی بھی نہیں آتا؟"

"ہاں بیٹی کوئی نہیں آتا!"

"پھر لوگوں کو کیسے بُلایا جائے؟"

"یہ کام تُو کر سکتی ہے؟"

"مَیں ——— ؟"

"ہاں تُو، صرف تُو!"

"وُہ کیسے امّاں؟"

"میری اُمیدوں اور تمنّاؤں کا چراغ تُو ہی روشن کر سکتی ہے، میری حسرتیں تُو ہی پُوری کر سکتی ہے!"

"تو بتایئے، آپ کہیں تو مَیں آسمان کے تارے توڑ لاؤں آپ کے لیے۔ مَیں چاند اور سُورج پر کمند ڈال سکتی ہُوں، آپ کو خوش رکھنے کے لیے مَیں کیا نہیں کر سکتی۔ امّاں آپ کو اندازہ نہیں ہے مَیں کو کتنا چاہتی ہُوں!"

"خوب اندازہ ہے بیٹی، اس لیے تو یہ بات چھیڑی ہے!"

"تو بتایئے پھر ———"

"ابھی بتاتی ہُوں، اصغری کسی کام سے ادھر آ رہی ہے وہ چلی جائے تو کہُوں؟"

◎

(۸)

یہ گفتگو ختم ہوئی، تو امراؤ نے ماں سے سوال کیا :

"ہاں اماں کیا کہہ رہی تھیں آپ ؟"

سگّن نے محبّت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :

"کہہ یہ رہی تھی بیٹی کہ اس ویرانے کو تُو ہی آباد کر سکتی ہے اور تجھے یہ کام کرنا پڑے گا !"

امراؤ بڑے غور سے ماں کی باتیں سُن رہی تھی، اور وہ کہہ رہی تھیں :

"میرا دور ختم ہو چکا، میں قصّہ ماضی بن چکی، اب اس خاندان کا نام تیرے دم سے چلے گا، تو چاہے گی تو ایک مرتبہ پھر یہ گھر رشکِ جناں بن جائے گا۔"

"میں تو چاہتی ہوں امّی !"

"تو پھر تجھے دل لگا کر تعلیم حاصل کرنا پڑے گی۔"

"وعدہ کرتی ہوں، اب کبھی اپنی طرف سے کوتاہی نہ کروں گی !"

"ہاں اور دیکھ استاد کا مذاق نہ اڑایا کر، ان کی بھونڈی اور بھدّی صورت پر نہ جا، سارے شہر میں، بلکہ ہمارے پورے ملک میں ان سے بڑا گویا، اور ان سے اچھا نچیّا، کوئی نہیں ہے، جس پر انھوں نے ذرا سی توجہ کر دی ہے وہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہو گی کہ وہ اپنا سارا فن دل و جان سے تجھے سکھانے کے لیے تیار ہوں، اور تُو نہ سیکھے !"

"ہاں بٹیا سُن لیا!"

امراؤ نے بڑے آمرانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا:

"بس تو جاؤ، اور تعمیل کرو ہمارے حکم کی! ــــــ اگر ذرا دیر بھی تم اور رُکیں تو یاد رکھو، اس فہرست میں اور اضافہ ہو جائے گا۔"

اصغری مُسکراتی ہوئی چلی گئی۔

اصغری کے جانے کے بعد، امراؤ نے کہا:

"اماں مَیں نے اپنی چار سہیلیوں کو کھانے پر بُلایا ہے، بُرا تو نہیں کیا؟"

"اچھا کیا ــــــ لیکن کون ہیں وہ بیٹی؟"

"ایک تو خالہ جان کی لڑکی زمرّد ہے۔ دوسری، لکھراج ہے، جو یہیں قریب ہی رہتی ہے، تیسری نیلم ہے اور چوتھی نازو!"

سگّن نے ان میں سے کسی پر اعتراض نہیں کیا، اور منظوری دے دی۔ البتہ لکھراج کے لیے یہ ضرور کہا کہ اس کی ماں مجھ سے ہمیشہ حسد کرتی رہی ہے۔ اب بھی اس کا یہی حال ہے، لہٰذا اپنی سہیلیوں سے اس کا نام خارج کر دو۔"

وہ بولی:

"تو کیا منع کرا دُوں؟"

سگّن نے کہا:

"بُلا چکی ہو تو خیر، لیکن آئندہ اس کا خیال رکھنا!"

(۹)

بڑے دلار سے سگن نے امراؤ کو ذرا پرے ہٹاتے ہوئے کہا :

" بیٹی تجھے اس خاندان کا نام روشن کرنا ہے ۔"

وہ بڑے یقین کے ساتھ بولی :

" کروں گی اماں !"

سگن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا :

" میرے قدموں پر، بڑے بڑے امیروں اور رئیسوں کے سر جھکتے تھے، ان میں سے اکثر قبریں پہنچ چکے، یا جو زندہ ہیں انھوں نے کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کر لیا، میری خواہش تیرے بارے میں جانتی ہے کیا ہے ؟"

" کوئی بڑی اچھی ہی ہوگی ———— بتائیے ؟"

" میری خواہش یہ ہے کہ تیرے قدموں پر وزیروں اور شہزادوں کے سر جھکیں، صورت میں تو چندے آفتاب، چندے ماہتاب ہے، تیری آواز میں رس ہے، تو اپنی تانوں سے جادو جگا سکتی ہے۔ جو ٹیڑھے میڑھے پیر تو بطور "ناچ" کے مارا کرتی ہے، وہ منظر میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے، ابھی بالکل اناڑی ہے تو، لیکن میں کہہ سکتی ہوں کہ تیری کمر میں جو بل اور پاؤں میں جو لوچ ہے، وہ تجھے سب سے بڑی رقاصہ بنا سکتا ہے !"

" اب میں نے عہد کر لیا ہے، استاد جو کچھ سکھائیں گے دل سے سیکھوں گی، اور

"وعدہ کر تو رہی ہوں کہ اُن سے سیکھوں گی !"

"ناچ بھی" ———

"امّاں، ناچ" !

"ہاں میری بچّی —— تجھے ان سے فن سیکھنا ہے، ان کی صُورت نہیں دیکھنا ہے دل لگا کر اُن سے سیکھ لے گی تو یقین کر لکھنؤ میں تجھ سے بڑی گانے والی، اور تجھ سے اچھی ناچنے والی کوئی اور نہیں ہوگی کسی میں ہمّت نہیں ہوگی کہ تجھ سے ٹکر لے سکے !"

"لیکن مجھے ہنسی جو آجاتی ہے !"

"وہ روکی جا سکتی ہے۔"

"اچھا کوشش کروں گی !"

"وعدہ کر۔"

"وعدہ کرتی ہوں، اپنی پیاری ماں سے !"

یہ کہہ کر وہ بھرسگّن کے گلے میں بانہیں ڈال کر، اس کے جھریوں پڑے گالوں پر اپنا پھُول سا شاداب گال رکھ کر، کچھ ایسے فخر سے اسے دیکھنے لگی، جیسے اُس کی بیٹی ہونے پر اسے بے انتہا ناز ہے !"

"تو ——— ؟ ——— بیٹی خدا انظرِ بد سے تجھے محفوظ رکھے، تجھ سے زیادہ خوب صورت آج تک کوئی پیدا نہیں ہُوا، میری بھلا کیا حیثیت ہے تیرے سامنے!"

"واہ اماں ایسا نہ کہیے ——— مَیں ہرگز یہ نہیں سُن سکتی کہ آپ دنیا میں کسی سے بھی کم خوب صورت نہیں۔ آپ کو دیکھ کر کیا بتاؤں، میرے دل کی کیا حالت ہونے لگتی ہے؟"

"یہ تیری محبّت ہے!"

"لیکن وہ لوگ بھی تو محبّت ہی کے مارے سر جھکاتے ہیں!"

"اس میں محبّت کے سوا، کچھ اور چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں!"

"وہ کیا اماں؟"

"یہ باتیں ابھی تُو نہیں سمجھ سکتی، ابھی تیرا سن ہی کیا ہے؟ بڑی ہو لے تو خود بخود سمجھ میں آجائیں گی۔"

"لیکن اماں ایک بات ہے!"

"وہ کیا بیٹی؟"

"یہ لوگ سر جھکاتے ہوں گے تو عجیب سا لگتا ہوگا؟"

"(ہنس کر) پگلی سچ مچ تھوڑے ہی قدموں پر سر رکھ دیتے ہیں!"

"پھر ——— ؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ بندۂ بے دام بن جاتے ہیں۔ ایک اشارے پر سب کچھ کر گزُرنے کو تیار ہو جاتے ہیں!"

"اچھا ——— ورنہ مجھے تو یہ اچھا نہیں لگتا کہ کوئی سر رکھ دے کسی کے قدم پر!"

پُوری ریاضت کر دں گی۔ اب آپ کو یا انھیں کسی شکایت کا کبھی موقع نہیں دُوں گی۔ میں آپ کو رنجیدہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس وقت میں نے آپ کو رنجیدہ دیکھا ہے، اور میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے، آپ کو خوش رکھنے کے لیے، میں سب کچھ کر گزروں گی۔"

سگّن نے ایک مرتبہ پھر امراؤ کو گلے سے لگا لیا، اور کہا :

"مجھے تجھ سے یہی اُمید تھی!"

وہ بولی :

"میں آپ کی ہر اُمید پُوری کروں گی، میری طرف سے بالکل بے فکر رہیے —— لیکن اماں ایک بات تو بتایئے!"

"پوچھ ——"

"کیا واقعی شہر کے امیر اور رئیس آپ کے قدموں پر سر جھکایا کرتے تھے؟"

"ہاں بیٹی، بھلا جھوٹ کیوں بولنے لگی!"

"پھر آپ یقین رکھیے، وزیروں اور شہزادوں کے سر اپنے قدموں پر میں جھکاؤں گی۔"

"مجھے یقین ہے!"

"لیکن اماں لوگوں کو سر جھکانے کی آخر کیوں ضرورت پیش آتی ہے؟"

(مسکرا کر) —— "تاب نہیں لا سکتے حسُن و جمال کی، بے ساختہ سر جھکا دیتے ہیں۔"

"لیکن اماں —— میں آپ سے زیادہ خوب صُورت تو نہیں ہُوں، پھر وزیر اور شہزادے میرے در پر کیُوں آنے اور میرے قدموں پر کیوں سر جھکانے لگے۔"

امراؤ باورچی خانے کی طرف گئی، اور وہاں کچھ ہدایتیں دے کر، اپنے کمرے میں واپس آئی، جیسے ہی آئی دیکھتی کیا ہے کہ زمرّد سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔

امراؤ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دونوں ہم عمر تھیں، دونوں میں بڑا قریبی رشتہ تھا، دونوں کے مزاج میں بھی خاص یکسانیت تھی، اور دونوں کے تعلقات و مراسم بھی حد درجہ دوستانہ اور مخلصانہ تھے!

امراؤ نے اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا، اور پوچھا :

"اری مربھکّی تو ابھی سے کیسے آ گئی؟ ابھی تو کھانے میں کم سے کم دو گھنٹے کی دیر ہے!"

زمرّد نے جواب دیا :

"مربھکّی ہوگی تم ——— کھانا کھانے کون آیا ہے؟"

"تو کیا کھاؤ گی نہیں؟"

"کھائیں گے اپنے وقت پر، کیا یوں ہی چلے جائیں گے!"

"پھر وقت سے پہلے کیوں آ گئیں؟"

"آج تو موقع ملا تھا، تم سے جی بھر کے باتیں کرنے کا، کھانے کے وقت اور سب بھی آجاتیں، پھر باتیں کیا ہوتیں خاک؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے ——— بڑا اچھا کیا تم نے جو آ گئیں، اور کہو گھر

" اچھا بیٹی، تم نے سہیلیوں کی دعوت کی ہے تو سب کچھ باورچیوں اور اصغری پر نہ چھوڑ دو، خود بھی ذرا باورچی خانے کا ایک چکّر لگاؤ، اور دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ کوئی چیز خراب نہیں ہونی چاہیئے، ورنہ وہ لوگ نام رکھیں گی۔ اسے کہتے ہیں نقصانِ مایہ، اور شماتتِ ہمسایہ، اتنا خرچ بھی کرو، اور پھر الٹی شکائتیں اور طعنے بھی سُنو!"

" اچھا مَیں چلی ————"

◎

"بہت بڑے !"

"کتنے بڑے ؟"

"یوں سمجھ لو کہ تین سو تو اُن کے گاؤں ہیں !"

"تین سو گاؤں ؟ غضب !"

"ہاں ——— ایک بہت بڑا محل ہے !"

"تو اب تم محل میں رہو گی ؟"

"بے شک رہیں گے !"

"اور کیا کیا ہے ان کے پاس ؟"

"جائداد، جاگیر، مکانات، باغات وغیرہ کے علاوہ لاکھوں روپیہ نقد ہے۔ لاکھوں روپے کے زیورات ہیں، لاکھوں روپے کے نقرئی اور طلائی ظروف ہیں۔ ہاتھی ہیں، گھوڑے ہیں، کیا نہیں ہے ان کے پاس ؟"

"تو یہ سب تمھارا ہو جائے گا ؟"

"میرا بھی اس میں حصّہ ہوگا۔"

"کیا کوئی اور بھی حصّے دار ہے ؟"

"ہاں پہلی بیوی ہیں۔ ان کی اولاد ہے !"

"تمھیں کیا دیں گے ؟"

"دو ہزار ماہوار پاندان کا خرچ !"

"ہائے اللہ، اتنے سارے پان کھا جاؤ گی۔"

"پگلی ——— پاندان کا خرچ یعنی جیب خرچ !"

"اور ———"

"ایک لاکھ کے زیورات دیں گے، پانچ گاؤں میرے نام لکھ دیں گے، گھر کا

میں سب خیریت ہے ؟"

" خیریت کہاں ہے بھئی ؟"

" ہمارا وقت تو آگیا !"

" تیرے منہ میں خاک ——— وقت کیوں آتا تیرا ؛ مریں تیرے دشمن ۔"

" میں کچھ اور کہہ رہی ہوں ، تم کچھ اور سمجھ رہی ہو !"

" ہمیں پہیلیاں بجھانا نہیں آتا ۔"

" اماں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میری نتھ اتارنے کی رسم ، تین ماہ بعد ادا کر دی جائے !"

" یعنی ———"

" ہاں ———"

" واہ بھئی ابھی سے ؟ ——— ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے ؟"

" عمر میں تو تم سے سال ڈیڑھ سال بڑی ہوں ——— لیکن وُہ نہیں مانتے کسی طرح ؟"

" وہ کون ؟"

" نواب منن خاں"

" یہ کون بزرگ ہیں ؟"

" نواب ہیں ، اور کیا ہیں ؟"

" لیکن ان سے تمھارا تعلق ؟"

" بھئی وہ ریجھ گئے ہیں بُری طرح اس بندی پر ، اماں سے اصرار کیا ، انھوں نے مان لیا ۔"

" کیا بہت بڑے آدمی ہیں ؟"

"چل ہٹ ———"

"کیوں، یہ کیوں؟"

"زر پرست، آدمی کو نہیں دیکھتی، روپے پر ریجھی جاتی ہے ——— بیچارے شمسُ الدّولہ کو کتنا غم ہوگا!"

"غم تو مجھے بھی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کی ریت یہی ہے کہ دولت نہیں چھوڑتے اور نواب پانچ گاؤں میرے نام لکھ رہا ہے، زیورات دے رہا ہے، جئے گا کتنے دن؟ آج مرا کل دُوسرا دن، پھر میں ہوں اور شمسُ الدولہ!"

"تھُو کا پھر شمسُ الدولہ نے تجھ پر۔"

"یہ گُر میں جانتی ہوں کہ اسے کس طرح، اور کب اسیرِ دام کر لوں، وہ میرے پنجے سے نہیں نکل سکتا۔"

"نہ نکل سکتا ہوگا، ہماری سمجھ میں تو یہ باتیں آتیں نہیں بھئی!"

◎

سارا خرچ وہی چلائیں گے ——— بہت سے بیش قیمت ملبوسات پیش کریں گے!"

"واہ بھئی تم تو بڑی خوش قسمت ہو ——— لوٹ لیا بیچارے نواب کو! لیکن ایک بات کھٹک رہی ہے!"

"وہ کیا؟"

"جب ان کی بیوی موجود ہے، اور اس سے اولاد بھی ہے، تو انھیں تمھاری ضرورت کیا تھی؟"

"وہ بوڑھی ہو چکی ہے!"

"بوڑھی ہو چکی ہے؟"

"ہاں ———"

"اور خود نواب صاحب جوان ہیں؟"

"وہ بھی کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہیں؟"

امراؤ نے ایک دوھتڑ زمرد کی پیٹھ پر جمایا، اور کہا:

"کمبخت پھر وہاں مرنے کی کیا ضرورت تھی ——— اس سے اچھے تو شمس الدولہ تھے، جوان ہیں، شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، دولت مند ہیں اور تجھ پر ہزار جان سے بقول تیرے فدا ہیں، انھیں چھوڑ کر، اس بڈھے کھوسٹ کے پاس کیوں مر رہی ہے جا کر؟"

زمرد نے ایک آہِ سرد کے ساتھ کہا:

"سچ پوچھو تو مجھے محبت شمسُ الدولہ ہی سے ہے، لیکن وُہ صرف کھاتے پیتے آدمی ہیں، نواب منن خاں، نواب ہیں، جو کچھ وُہ مجھے دے رہے ہیں، اس کا چوتھائی بھی شمسُ الدولہ نہیں دے سکتے!"

(۱۱)

زمرّد نے ایک چٹکی لی اور کہا :

" وہ وقت بھی آ جائے گا میری بہن ، جب خوب سمجھ جاؤ گی ، ہم تو بے وقوف مشہور ہیں ، تمہاری عقل کی تو دھوم مچی ہوئی ہے ۔"

امراؤ نے سسکی بھرتے ہوئے کہا :

" واہ بھئی یہ بھی اچھا مذاق ہے —— اتنے زور سے چٹکی لے لی ، پھر یہیں بھی ——"

زمرّد قطع کلام کرتی ہوئی بولی :

" تم بھی کیا کرلوگی ، چٹکی لے لوگی ؟ گردن کاٹ لو ، خدا کی قسم جو اُف کرجاؤں ، وہ بڈھا نواب منن خاں ، اور غزال رعنا شمس الدولہ مجھ پر جان دیتے ہیں ، میں ان دونوں سے بے نیاز ہزار جان سے تم پر فریفتہ ہوں ، اللہ جانے تمھیں دیکھ لیتی ہوں ، طبیعت خوش ہو جاتی ہے !"

" جب ہی تو ہفتوں صورت نہیں دکھاتیں ۔"

" کیا کروں میری بہن ، آج کل تو اماں جان ایک منٹ کی فرصت نہیں دیتیں —— سارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ بس ناچ اور گانے میں طاق ہو جاؤں ۔"

" وہ تو ہو ۔"

" تمہارے کہنے سے ؟ اماں جان تو کہتی ہیں ، تجھے کچھ نہیں آتا ۔"

"ہم لوگوں کی مائیں، ہمیں کچھ سمجھتی نہیں ــــــ ہماری اماں بھی، یہی کہہ رہی تھیں کل میرے بارے میں!"

"یہ تو ظلم ہے امراؤ!"

"کیا ظلم ہے زمرّد؟"

"تیری آواز میں جو رس ہے وہ کسی اور میں تو آج تک دیکھا نہیں!"

"واہ استاد ننھّے خاں تو کہتے ہیں، مجھے تان لگانا تک نہیں آتا!"

"(ہنس کر) وہ تو سٹھیا گئے ہیں۔"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پکھراج، نیلم اور نازو بھی آ گئیں، اور ان کے آتے ہی ایک ہنگامہ بپا ہو گیا، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ امراؤ نے سب کا بڑی اپنائیت کے ساتھ استقبال کیا۔ اصغری نے فوراً سب کو ایک ایک گلاس تازہ زعفران کا شربت بنا کر پلایا، اور پھر باتیں ہونے لگیں ان سب میں!

پکھراج نے زمرّد کی طرف گھورا پھر کہنے لگی:

"ہم نے کچھ سُنا ہے تمھارے بارے میں!"

زمرّد کچھ لجا سی گئی، لیکن ابھی جواب نہیں دے پائی تھی کہ نیلم بول پڑی:

"ہاں بھئی سنا تو ہم نے بھی ہے ــــــ نہ جانے سچ ہے یا جھوٹ!"

زمرّد کا رنگِ رُخ اور بدل گیا، وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

نازو نے کہا:

"کیا زمانہ آ گیا ہے، خوش ہونے والی خبریں دوستوں اور یاروں سے چھپائی جانے لگی ہیں" ــــــ

زمرّد نے ایک دوہتّڑ لگایا، نازو کی پیٹھ پر۔

"چل ــــــ بڑی آئی یار بننے والی، اب تک بات کرنے کا سلیقہ بھی

" تمھاری جہالت کا میرے پاس تو کچھ علاج ہے نہیں !"

پکھراج نے پھر ایک سوال نازو سے کیا :

" اچھا بھئی مان لیا، نیلم کو نواب اختر الزماں لے جا رہے ہیں، زمرّد نواب مِنن خاں کے پلّے باندھی جا رہی ہے، لیکن تم ؟"

وہ مُسکراتی ہوئی بولی :

" مَیں کیا ؟

" ماشاءاللہ، یہ حُسن، یہ رُوپ، یہ جوانی، یہ ناچ، یہ گانا، ہر چیز میں تو طاق ہو۔ مگر تمھارا خریدار کب پیدا ہوگا ؟"

نازو نے شرارت بھری نظروں سے امراؤ کی طرف دیکھا اور کہا :

" سُن رہی ہو امراؤ، اس جاہل کی باتیں ؟"

وہ بولی :

" سُن تو رہی ہُوں، لیکن کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی ہے !"

بڑی سادگی کے ساتھ نازو نے جواب دیا :

" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھیں بھی بسنت کی خبر نہیں ہے ؟"

سب ہمہ تن شوق بن کر نازو کے گرد بیٹھ گئیں، نیلم نے سب کی طرف سے ترجمانی کرتے ہوئے کہا :

" تو کیا ——————"

وہ خوشی کا جھولا جھولتی ہوئی بولی :

" ہاں بھئی ہاں "——————

پکھراج نے پوچھا :

" تمھارا معاملہ بھی طے ہو گیا ہے کہیں ؟"

نہیں آیا، یہ مرد بولتے ہیں آپس میں، عورتیں نہیں بولتیں!"

نازو نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا :

"نہ بولتی ہوں گی۔ ہم تو بولتے ہیں، اور بولتے رہیں گے، مساواتِ مرد و زن ہمارا ایمان ہے۔ کیا دوسروں کی خوشنودی کی خاطر ایمان چھوڑ دیں؟"

امراؤ ہنسنے لگی۔ اس نے ایک ہلکی سی چٹکی لی، اور کہا :

"واہ بھئی واہ، تم تو سب سے بڑھ گئیں!"

نازو نے کہا :

"ارے ہمیں سمجھتی کیا ہو؟ یہ بے وقوف لڑکی زمرّد جو بیٹھی ہے، اسے ایک بوڑھا نواب منن خاں خرید رہا ہے ——— لیکن منہ مانگے داموں پر۔"

نیلم بولی :

"لیکن کیا کرے بے چاری، ——— ہاں مجھے شمسُ الدولہ کا خیال آتا ہے، تو کلیجہ مسلنے لگتا ہے۔"

زمرّد بولی :

"تو کرلو ان سے شادی، میں سفارش کر دُوں گی!"

نازو پھر بول پڑی :

"جی ہمیں آپ کی سفارش کی ضرورت نہیں، ہمارے خریداروں کی کیا کمی ہے کچھ؟ یہ نیلم جو ہے اس کا سودا، نواب اختر زماں سے ہو رہا ہے، وہ بھی کسی سے کم نہیں، پھر جوان الگ، اور خوب صُورت جُدا۔"

پکھراج نے سوال کیا :

"نواب اختر زماں کون بزرگ ہیں۔ ہم نے تو یہ نام آج تک نہیں سُنا!"

وہ بے پروائی سے بولی :

"دیکھو نازو، ہم لوگ بچپن سے ایک دُوسرے کے راز دار اور غم گسار چلے آ رہے ہیں، ہمارے بارے میں ایسا نہ سوچو!"

"اچھا بتا دُوں گی۔"

"تو بتاؤ نا!"

"ابھی نہیں، پھر کسی وقت اکیلے میں بتا دوں گی، ——— سب کے سامنے نہیں!"

"لیکن میں تو سب کے سامنے سن کر رہوں گی، ——— اسی پر ہماری دوستی کا دار و مدار ہے!"

"اور اگر کسی نے وہاں ڈورے ڈالے تو ———؟"

"تو میں اسے اتنا رسوا اور ذلیل کروں گی، منہ اٹھانے کے قابل نہ رہ جائے!"

"تو بتا دُوں پھر؟"

اب تو امراؤ بھی خاموش نہ رہ سکی، وہ بھی اس اصرار میں شریک ہو گئی ——— کہنے لگی:

"اب زیادہ نہ ترساؤ بتا دو، شاباش، ناز و نہیں ہماری!"

"کیوں نیلم بتا دوں؟"

"ضرور بتا دو، میں تو گوش بر آواز ہُوں۔"

"بس اسی سے ڈر لگتا ہے؟"

"کس بات سے؟"

"تمھارے گوش بر آواز ہونے سے!"

"یعنی تمھیں مجھ پر شبہ ہے کہ میں بیچ میں نہ کود پڑوں، اری پگلی میرا معاملہ تو نواب منن خاں سے بالکل پختہ ہو چکا!"

"کیوں نہ ہوتا!"

"بڑی اچھی خبر ہے، لیکن کہاں؟"

"کیوں بتائیں؟"

"یہ لو دوستوں سے پردہ!"

"پردہ کاہے کا؟ میرا ڈولا تو اس شان سے جائے گا کہ سارا شہر انگلیاں دانتوں تلے داب لے گا کہ ہاں یُوں ہوتی ہے دھوم دھام۔"

"خدا مبارک کرے، لیکن کچھ اتہ پتہ تو بتاؤ؟"

"آخر کیوں بتاؤں؟ تاکہ تم جاکر وہاں کوئی کھنڈت ڈال دو، اور اپنا ڈول ڈالنے لگو!"

"تمھیں مجھ سے یہ اُمید ہے؟"

"بھئی امید تو نہیں، لیکن سچ پوچھو تو ہے بھی!"

"یہ کیا بات ہُوئی؟"

"اگر میں نے اتہ پتہ بتایا، تو اتنی بڑی سرکار کا نام سُن کر نہ جانے کس کس منہ سے رال ٹپکنے لگے گی ــــــــــ تمھیں نہیں کہتی، ایک عام بات کہتی ہُوں۔ اسی لیے اماں جان نے منع کر دیا ہے کہ دیکھو مردی خبردار جو نواب صاحب کا نام بتایا کسی کو، ورنہ ایسی خبر لوں گی کہ زندگی بھر یاد کرے گی!"

"نواب صاحب؟"

"ہاں بھئی بہت بڑے نواب ہیں۔"

"اللہ نام بتادو گی تو کیا ہو جائے گا، کیا ہم چھین لیں گے انھیں تم سے؟"

"تم تو نہیں، ممکن ہے کوئی اور اُچک لے، اور میں بے چاری منہ دیکھتی رہ جاؤں!"

کے ساتھ پوچھا :

"عمر کیا ہے ؟"

"امید ہے ساٹھ پینسٹھ سال کے ہوں گے ۔"

لیکن نازو کے جواب نے سب کو چونکا دیا ۔

"عمر ؟ وہ تو بیس سال بتا رہے تھے ۔ لیکن جب سودا ہو رہا تھا، میں بھی جھانک رہی تھی، میرا خیال ہے، ۴۴ سال کے لگ بھگ ہوں گے !"

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ زمرد نے ایک اور سوال کیا :

"صورت شکل کے تو اچھے ہوں گے ؟"

وہ بولی :

"لوگ تو کہتے ہیں، اپنے وقت کے یوسفِ ثانی ہیں، لیکن یہ تو مبالغہ ہے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اچھی صورت شکل ہے۔ مسکراتے ہوئے بڑے اچھے لگتے ہیں اور آنکھیں تو غضب کی ہیں ۔"

اب نیلم کچھ نہ پوچھ سکی، لیکن نازو نے خود ہی کہا :

"وہ اپنے بھائی پر حساب فہمی کا مقدمہ کر رہے ہیں، امید کیا یقین ہے، جیت جائیں گے، اس صورت میں بہت سے گاؤں، باغات، مکانات اور لاکھوں روپیہ نقد اور ملے گا۔ کہہ رہے تھے پھر میرے خاندان کا خرچ اور بڑھا دیں گے !"

پکھراج نے سراپا حیرت بن کر سوال کیا :

"بھائی پر مقدمہ ؟"

نازو نے سادگی کے ساتھ جواب دیا :

"ہاں بھئی، باپ کے مرنے کے وقت یہ بہت چھوٹے تھے اور ہیں بھی دوسری ماں سے، لہٰذا بڑے بھائی نے قبضہ کر لیا، اور جب یہ بالغ ہوئے تو آدھوں آدھ ہر چیز

"اچھا تو بتائے دیتی ہوں!"

پکھراج نے کہا:

"یا اللہ توبہ ہے، اس لڑکی نے تو پریشان کر دیا ہے —— بتاتی نہیں چکتی کسی طرح!"

دفعتہً نازو کے منہ سے نکلا۔

"چنن خاں!"

سب پر حیرت سی طاری ہو گئی، کچھ دیر تو سب محوِ حیرت ہو کر ایک دوسرے کو یہ عجیب و غریب نام سن کر دیکھتی رہیں، پھر پکھراج نے کہا:

"یہ نام تو آج ہی سنا ہے!"

"تو میں کیا کروں!"

نیلم نے پوچھا:

"کون ہیں؟ —— کیا کرتے ہیں —— آمدن کیا ہے؟ —— دیں گے کیا؟"

"ارے بھئی نواب ہیں اور کیا ہیں، کرتے کیا ہیں نوابی! بھلا نواب لوگ کوئی اور کام بھی کر سکتے ہیں نوابی کے سوا—. رہی آمدنی تو پانچ سو گاؤں اُن کی ملکیت ہیں— بہت سے باغات ہیں، عمارتیں ہیں، زرِ نقد کی کوئی انتہا نہیں۔ توشہ خانہ ہیرے جواہرات سے بھرا پڑا ہے، نقرئی اور طلائی زیورات منوں کے حساب سے تول تول کر رکھے جاتے ہیں، پانچ لاکھ نقد اتارنے کے دن دیں گے اور دس گاؤں کا قبالہ میرے نام لکھ دیں گے پانچ ہزار روپیہ پاندان کا خرچ دیں گے۔ ایک بہت بڑی حویلی خرید کر دی ہے، جہاں میں رہوں گی، یہاں کے تمام مصارف وہی برداشت کریں گے۔"

یہ تفصیلات سُن کر واقعی زمرّد کے مُنھ میں پانی بھر آیا —— بڑی اُمید

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اصغری آئی، اور کہنے لگی :

"چلیئے حضور دسترخوان بچھ گیا ہے !"

امراؤ نے کہا :

"ان لوگوں کو لے جاؤ، کھانا کھلا دو، مجھے تو بھوک نہیں ہے !"

پکھراج بولی :

"سچ پوچھو تو میری بھی بھوک مر گئی ہے ۔"

نیلم نے کہا :

"کاش ہم نے یہ باتیں نہ چھیڑی ہوتیں، سارا مزہ کرکرا ہو گیا ۔"

نازو اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے زمرد کا ہاتھ پکڑا، اور اسے اٹھاتے ہوئے کہنے لگی :

"آؤ چلیں بڑی بھوک لگ رہی ہے، غضب خدا کا باتوں باتوں میں دو بج گئے !"

زمرد اٹھ کھڑی ہوئی اس نے کہا :

"چلو ———"

نازو نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا :

"آؤ ہم تم عہد کریں کہ نواب منّن خاں اور نواب چنّن خاں چاہے ایک دوسرے کا گلا لڑ لڑ کاٹ ڈالیں، لیکن ہماری دوستی سدا قائم رہے گی !"

ایک بے جان معمول کی طرح زمرد بولی :

بانٹ دی، مگران کا کہنا ہے میرے بچپن سے لے کر اس وقت تک مجھ پر جو صرفہ دکھایا گیا ہے وہ بہت زیادہ ہے!"

پکھراج نے کہا:

"پھر تو وہ ضرور جیت جائیں گے۔"

نیلم نے سوال کیا:

"نواب چنّن خاں کے بھائی کا نام کیا ہے؟"

وہ بولی:

"نواب منّن خاں!"

سب پر سناٹا چھاگیا۔ امراؤ نے بڑے دل گرفتہ انداز میں سوال کیا:

"وہی ہمارے نواب منّن خاں، یعنی زمرّد کے ——"

نازو — آنکھیں نیچی کر کے بولی:

"اور کون؟"

بے ساختہ نیلم کے منھ سے نکلا:

"یہ تو بڑا غضب ہُوا۔"

وہ بولی:

"اور دنیا میں ہوتا بھی کیا ہے؟"

زمرّد کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، یارا نہ تھا، کہ ایک لفظ بھی کہہ سکے!

◎

یہ نازو تھی بڑی نٹ کھٹ، اس نے سگن کے کمرے کی طرف جانے کا جو قصد کیا، تو سب ہی پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ خاص طور پر امراؤ تو بدحواس ہوگئی۔ اس نے سوچا اگر یہ بات اماں کے کان تک پہنچی تو معاملہ بڑی نازک صورت اختیار کرے گا، کہنے لگی :

"نازو، خبردار جو قدم آگے بڑھایا ؟"

وہ تن کر کھڑی ہوگئی، اور پوچھا :

"کیا کرو گی ؟"

امراؤ نے جواب دیا :

"کچھ بھی نہیں ——— ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں بھوک لگ آئی ہے، چلو کھانے کے کمرے میں، ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا !"

پکھراج نے بھی امراؤ کی تائید کی اور کہنے لگی :

"اب تو ڈھائی بج رہے ہیں، آنٹیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں !"

نیلم کیسے چپ رہتی۔ وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی :

"بارش کا پہلا قطرہ چلا، اب جس کا جی چاہے پیچھے آئے !"

سب ہی کو زمرد کے سوا ہنسی آ گئی، اور ان نقرئی قہقہوں کے ہجوم میں یہ قافلۂ رنگ و بو کھانے کے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔

نازو نے زمرد کو اپنے پاس بٹھایا اور کہا :

"ہم دونوں ساتھ ساتھ کھائیں گے !"

"ہاں رہے گی ——— تمھاری کیا خطا ؟"

نازو نے پکھراج، نیلم اور امراؤ سے کہا :

"چلو بھئی، تم لوگوں پر نہ جانے یہ کیسی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ چنّن خاں میرے حصے میں آئے ہیں، منّن خاں زمرّد کے، اور ہم دونوں دوستی قائم رکھنے کا عہد کر چکے ہیں۔ ہمیشہ ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکے گی، لیکن تم لوگ ہو کہ ہماری قسمت کا سوگ منا رہی ہو !"

نازو کے یہ کہنے کے بعد کوئی ٹس سے مس نہ ہُوا، نہ کسی نے کوئی جواب دیا۔ نازو نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا :

"چلتی ہو، یا جا کر خالہ اماں (سگّن) سے یہ سارا ماجرا بیان کر دُوں ——— واہ بھئی، یہ بھی اچھی دوستی ہے، زمرّد کا سودا نواب منّن خاں سے ہوا تو سب نہال ہوئے جا رہے تھے، میرا دامن نواب چنّن خاں سے باندھا جانے لگا تو سب پر اوس پڑ گئی، کیا یہی دوستی ہے ؟ تمھارے لیے ہم دونوں کو یکساں ہونا چاہیئے، خیر میں فیصلہ خالہ جان پر چھوڑتی ہوں۔ زمرّد تو بیٹھ میں اُنھیں لے کر ابھی آئی !"

◎

"نواب چھنن خاں کا!"

لقمہ امراؤ کے ہاتھ سے گر پڑا۔

"کمبخت انھیں کیا ہوا؟"

وہ ایک بڑا سا لقمہ منھ میں رکھتی ہوئی بولی :

"بے چارے کا انتقال ہو گیا۔"

سب نے بہ یک آواز پوچھا :

"کب ——— ؟"

وہ بولی :

"بہت دن ہوئے، سنا ہے صرف چھ ماہ کی عمر پائی مرحوم نے!"

امراؤ نے ایک دوہتڑ اس کی پیٹھ پر مارا، اور پوچھا :

"پھر تو بلّو کس کے باندھے جا رہی ہے؟"

وہ سادگی اور سنجیدگی کے ساتھ بولی :

"کسی کے بھی نہیں ——— یہ تو مذاق کیا تھا میں نے!"

وہ بغیر کچھ کہے ـــــ نازو کے پاس بیٹھ گئی۔

درحقیقت اس وقت اس کے دل میں ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی یہ کمبخت چنّن خاں کہاں کہاں سے نکل آیا۔ پھر جوان بھی ہے، خوبصورت بھی ہے، دولت مند بھی، اور لڑکا بھی، اگر یہ مقدمہ جیت گیا تو ایسا نہ ہو نواب صاحب میرا درماہہ کم کر دیں۔ خیر ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے، یہاں سے کھانا کھاتے ہی جاکر اماں جان کو سارا ماجرا سناتی ہوں، وہ ٹھہریں ایک جہاں دیدہ، جو فیصلہ مناسب سمجھیں گی کریں گی اور وہی بہتر ہوگا، لیکن اب جلد یہاں سے کھسکنا چاہیئے۔

سب لوگوں نے خوب بڑھ بڑھ کے ہاتھ مارے۔

لیکن زمرد بس ٹونگتی رہی، اس سے واقعی کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا، منہ میں لقمہ رکھتی تھی اور وہ حلق میں پھنس جاتا تھا، نازو کن انکھیوں سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہی تھی اور لطف لے رہی تھی، اس نے زمرّد سے کہا :

"کھاؤ بھئی، کیا روزے سے ہو؟"

اس نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا :

"کھا تو رہی ہوں!"

نازو بولی :

"کیوں نہ اس کھانے پر فاتحہ پڑھ دیا جائے تاکہ مرحوم کی روح کو ثواب بھی پہنچ جائے اور ہمارا پیٹ بھی بھر جائے۔"

سب نے نازو کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں، لیکن کسی میں سوال کرنے کا یارا نہیں تھا۔

آخر امراؤ نے کہا :

"آج تمھیں کیا ہو گیا ہے نازو، عجب طرح کی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو، فاتحہ کس کا پڑھو گی بھلا؟"

وہ بڑی سنجیدگی سے بولی :

بھی نہیں سکتی تھی !"

اب زمرّد بھی موڈ میں آگئی تھی ، کہنے لگی :

" چل ہٹ ——— ہاں مجھے یہ فکر ضرور تھی کہ ان دونوں نوابوں کی جنگ ہمارے باہمی تعلقات پر ضرور بُرا اثر ڈالے گی اور مَیں چونکہ تجھے بہت چاہتی ہُوں اس لیے واقعی دلگیر ہوگئی تھی۔"

نازو نے اسے گلے لگا لیا ———

پھر پیار بھرے لہجے میں کہا :

" احمق ، ——— تُونے یہ نہیں سوچا ، اگر خدانخواستہ یہ واقعہ بھی ہوتا تو مَیں تجھ سے چھپاتی ، نہ کہ ظاہر کرتی ، اور وہ بھی اس طرح نمک مرچ لگا کر کہ تیرے قلبِ نازک کے ٹکڑے ہو جائیں۔"

زمرّد نے جواب دیا :

" ہاں ، حیرت تو مجھے بھی ہو رہی تھی ، لیکن تم اتنی منہ پھٹ ہو کہ تم سے کوئی بات بھی خلافِ توقع نہیں !"

نازو بولی :

" مَیں کچھ بھی سہی ، لیکن دس ہزار نواب چنّن خاں کو تجھ پر قربان کر دینے کا حوصلہ رکھتی ہُوں ، سمجھیں بی زمرّد !"

پھر وہ امراؤ کی طرف مخاطب ہوئی ———

کہنے لگی :

" آیا سمجھ میں ، ——— تم تو ایسا معلوم ہو رہا تھا ——— جیسے اب رو یا ہی چاہتی ہو ، بہن سے اتنی محبت اور ہم کچھ نہ ہوئے ——— ہاں بھئی ——— خون ، خون ہوتا ہے ——— کہاں زمرّد ،

(۱۴)

یا تو محفل پر افسردگی اور سوگ کی کیفیت طاری تھی یا نازو کے ایک لفظ نے ساری محفل کو کشت زار زعفران بنا دیا۔ ہر کوئی ہنسی سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔

نیلم نے کہا :

" آخر یہ تجھے سوجھی کیا تھی ؟ "

پکھراج بھی برس پڑی ، کہنے لگی :

" کمبخت نے سارا مزہ کرکرا کر دیا —— غضب خدا کا سنجیدہ کیسی تھی ، جیسے واقعی سچ بول رہی ہو ! "

امراؤ نے کہا :

" اسی سنجیدگی سے تو ہم سب دھوکا کھا گئے ! "

نازو نے فرنی کی طشتری اپنی طرف بڑھاتے ہوئے کہا :

" لیکن میرے اس جھوٹ نے ، بہتوں کی پول کھول دی ! "

نیلم نے سوال کیا :

" کیسی پول ؟ "

وہ بولی :

" یہی کہ اگر واقعی نواب چھنّن خاں زندہ ہوتے ، اور ان کے دامن سے میرا دامن باندھ دیا جاتا تو زمرّد کی تو حرکتِ قلب بند ہو جاتی ، اتنی بزدل ہے یہ ، مَیں تو سوچ

پکھراج نے ———— جو اب تک بڑی توجہ سے نوک جھونک کی یہ باتیں سُن رہی تھی کہا :

" واقعی نازو ، بڑی ظالم ہو تم !"

وہ اٹھلاتی ہوئی بولی :

" کون سا ظلم توڑا ہے میں نے تم پر ؟"

وہ تیوری چڑھا کر بولی :

" کیا لڑو گی ؟"

اس نے جواب دیا :

" ہاں ، ———— آؤ ، ہو جائیں دو دو ہاتھ ، کیا سمجھتی کیا ہو ، اپنے آپ کو !"

پکھراج نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا :

" معاف کرو بھئی ، لڑنے کی مجھ میں سکت نہیں ، میں نے تو یُوں ہی ایک بات کہہ دی تھی ، معافی چاہتی ہوں ۔"

نازو نے شریر نظروں سے اسے گھُورا ، اور پوچھا :

" اگر میں معاف نہ کروں تو ؟"

کہاں نازو !"

امراؤ کچھ جھینپ سی گئی ——

کہنے لگی :

" اب تم کچھ کھاؤ گی ؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ۔

" نا بابا پیٹ بھر گیا ، بلکہ زیادہ کھا گئی !"

◎

" اماں جان بے تکلفی کی انتہا یہ ہے کہ شاید اصغری کے لیے بھی کچھ بچا ہو!"
وہ ہنسنے لگیں۔ پھر یک بیک ان کی نظر نازو پر گئی۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، اور کہنے لگیں :

" اس کی ماں سے اور مجھ سے ایسا سہلاپا تھا، جس کی اس زمانے میں مثال نہیں مل سکتی ——— (ایک آہ سرد بھر کر) ——— ہائے کیا زمانہ تھا وہ بھی، اب وہ لوگ کہاں، وہ زمانہ کہاں، وُہ باتیں کہاں ——— !"

◎

وہ بولی :

" پھر تمھارے منھ پر ایسا تھپیڑ کس کر رسید کردوں گی کہ منھ ٹیڑھا ہو جائے گا آیا خیال میں !"

وہ امراؤ سے لپٹ گئی ۔

" مجھے بچاؤ ــــــ مجھے بچاؤ ، اس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا ہے ۔ یہ مار ڈالے گی مجھے !"

امراؤ ہنسنے لگی ــــــ

اس نے کہا :

" تجھے کوئی مار سکتا ہے ؟ ــــــ جب تک میں زندہ ہوں ایسا نہیں ہو سکتا !"

زمرد نے کہا :

" نازو ، تم کمال کی نقلیں کرتی ہو ، لکھنؤ میں کئی ناٹک کمپنیاں ، اور منڈیاں ہیں ، کسی میں بھی شریک ہو جاؤ ، خوب کماؤ گی ، اور اس کمپنی یا منڈی کے دن بھی پھر جائیں گے ــــــ !"

نازو نے آمادگی کے ساتھ کہا :

" تو پھر سفارش کر دو کہیں ؟"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سگن بھی آ گئیں ، انھیں دیکھ کر سب لڑکیاں مؤدب اور خاموش ہو گئیں ۔

انھوں نے ایک طائرانہ نظر سب پر ڈالی اور پوچھا :

" کیوں بھئی تکلّف تو نہیں کیا کسی نے ؟"

امراؤ بول پڑی :

تھا، ہلکی ہلکی بارش پڑ رہی تھی، پھوار عجب مزہ دے رہی تھی۔ آموں کا سلسلہ جاری تھا
ایک درخت پر جھولا پڑا تھا، جو ذرا پرے ہٹ کر تھا، وہ کہنے لگی :

"چلو سگّن جھُولا جھُولیں!"

بچپن کا زمانہ تھا، یہی ۱۰–۱۱ سال کی ہماری عمریں ہوں گی۔ میں بھی تیار ہو گئی۔ اور جھولا جھولنے لگی، ہم دونوں کی مائیں، خالائیں، ان کی سکھیاں، سہیلیاں، اُن کی لڑکیاں، لڑکے سب ہی باغ میں تفریح کے لیے آئے تھے، لیکن اس وقت آم کھانے میں لگے ہوئے تھے۔ بس ہم دونوں جھولا جھول رہے تھے۔ اتنے میں کسی بات پر ہم دونوں میں لڑائی ہو گئی ——— میں نے کہا ——— جاؤ، ہم اکیلے جھولیں گے، تمھیں نہیں جھلاتے اپنے ساتھ، ——— بے چاری بڑی نیک، اور سیدھی سادی تھی، اتر گئی، اور پاس ہی کھڑی ہو کر مغموم صورت کھڑی ہو گئی، مجھے ترس آ گیا، میں نے سوچا، اسے پھر اپنے ساتھ جھلانا شروع کر دوں۔ لیکن پینگ بہت بڑا لے چکی تھی، اور اسی حالت میں، میں نے اسے آواز دی۔

"آؤ، لڑائی ختم، ہم ساتھ ساتھ جھولیں گے!"

وہ خوش خوش جھولے کی طرف لپکی، لیکن تختے کا کونا، پینگ روکتے روکتے بھی اس کے ماتھے سے ٹکرایا، خون کی دھار جاری ہو گئی اور وہ لہولہان ہو گئی، اتنے میں پاس سے اس کا بھائی گزرا۔ وہ بھی ہمارا ہم عمر تھا، اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا، سب لوگ، اسی طرف بھاگ آئے، میں بھی جھُولے سے اُتر کر مجرم کی طرح ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

نازو کی نانی نے جو اپنی بیٹی کو یوں لہولہان دیکھا، ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، بادل کی طرح گرج کر بولیں۔

"کس نے زخمی کیا ہے، میری بچّی کو، کلیجہ چبالوں گی اس کا!"

۱۶

امراؤ نے محبت بھری نظروں سے ماں کو دیکھا، اور کہنے لگی :

"تھوڑی دیر ہمارے پاس بھی بیٹھ جائیے اماں جان !"

وہ جاتے جاتے رک گئیں، کہنے لگیں :

"کیا کروں بیٹھ کر، تم لوگ اپنے آپس میں باتیں کرو۔"

امراؤ ضد کرنے لگی۔

"اماں نہیں ——————"

زمرد اور پکھراج نے بھی بہت اصرار کیا۔ آخر وہ بیٹھ گئیں۔

نیلم نے پوچھا :

"نازو کی اماں سے واقعی آپ کی بڑی دوستی تھی ؟"

"ارے بیٹی کچھ نہ پوچھ !"

امراؤ نے فرمائش کرتے ہوئے کہا :

"کوئی واقعہ بتائیے اماں جان !"

زمرد بھی مچل گئی۔

"ہاں خالہ جان —————— تاکہ ہم بھی تو سُن جائیں !"

وہ اطمینان سے بیٹھتی ہوئی بولیں :

"بیٹی ایک دفعہ ہُوا یہ کہ نازو کی ماں اور میں، باغ میں گئے۔ برسات کا زمانہ

بات آ ئی گئی ہو گئی۔ پھر اسی دن سے اس جانِ وفا کے مرتے وقت تک ہماری دوستی بڑھتی ہی گئی۔ نہ جانے کیوں اسے دق ہو گئی تھی، یہ چھوت کا مرض ہوتا ہے، اماں جان، خدا انھیں جنّت نصیب کرے، منع کر کر کے ہار گئیں، دو چار دفعہ مارا پیٹا بھی، دروازے میں قفل لگا دیا، مگر میں کسی نہ کسی طرح یاقوت کے ہاں پہنچ جاتی تھی۔ وہ منع کرتی تھی۔

"خدا کے لیے نہ آیا کرو، میرے لیے اپنی جان کی دشمن کیوں ہوئی ہو!"

یاقوت کی اماں مجھے روکا کرتی تھیں۔

"بیٹی سگن، تیری دوستی دیکھ لی، لیکن اپنی ماں پر، اور اپنے اوپر رحم کر، یہاں مت آیا کر!"

مگر میرا جواب ایک ہی تھا۔

"چاہے جیوں، یا مروں، یاقوت کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

مَیں اس کے پاس گھنٹوں بیٹھتی، اس کی تیمارداری کرتی، دلچسپ باتیں سنا سنا کر اسے ہنسانے کی کوشش کرتی، اس کا دل بہلاتی، لیکن یہ سب تدبیریں رائیگاں گئیں، آخر وہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔"

یہ کہتے کہتے سگن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ——— اور آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

پھر اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے امراؤ سے کہا:

"دیکھو یہ ہوتی ہے دوستی!"

وہ بولی:

"بے شک، کمال کر دیا آپ نے تو!"

وہ کہنے لگیں:

"میری خواہش ہے ——— تیری اور نازو کی دوستی بھی ایسی ہی

نازو کے ننھے ماموں نے جھٹ میری طرف اشارہ کر دیا، اور کہنے لگے :

" اس نے ! "

یہ سنتے ہی قبل اس کے کہ نانی جان کچھ کہیں، نازو کی ماں، یاقوت، نے دوپٹے سے خون پونچھتے ہوئے کہا :

" جھوٹ، جھوٹا کہیں کا ! "

نانی اماں نے یاقوت سے پوچھا :

" وہ جھوٹا ہے تو بتا، کس طرح زخمی ہوئی تو ؟ "

یاقوت نے جواب دیا :

" جھولے سے اتر کر میں آم کھانے جارہی تھی۔ بارش کی وجہ سے بھاگنے لگی، بھاگتے میں درخت کی ایک باہر نکلی ہوتی موٹی سی شاخ سے ٹکرا گئی، اسی نے زخمی کر دیا۔ "

نانی جان کا غصّہ کچھ دھیما ہوا، انہوں نے پوچھا :

" سچ کہہ رہی ہے ؟ "

یاقوت نے جواب دیا :

" ہاں امّاں ———— بھلا سگن بھی زخمی کر سکتی تھی، اتنا تو چاہتی ہے اسے ! "

تمھارے ماموں کو یقین تھا یہ حرکت میری ہے، کہنے لگے :

" مَیں یقین نہیں کرتا۔ "

یاقوت نے اس کے منھ پر ایک تھپّڑ جمایا، حالاں کہ وہ اس سے سال بھر بڑا تھا اور کہنے لگی :

" میری سہیلی پر تہمت لگاتا ہے ! "

تہمت کا لفظ یاقوت کے منھ سے ایسا بے ساختہ نکلا کہ سب کو ہنسی آگئی، اور

"ہائے مَیں مری ، ہائے مَیں مری !"

سگنؔ پھر بھاگی بھاگی آئیں۔

"کیا ہوا ، میری بچّی ، مَیں تجھ پر قربان !"

امراؤ نے کہا :

"بھڑ نے کاٹ لیا پنڈلی میں ——— بڑا درد ہو رہا ہے امّی۔"

وہ اسے برا بھلا کہتی واپس چلی گئیں۔

◎

پختہ ہونی چاہیئے !"

امراؤ نے بڑی معصومیت کے ساتھ سوال کیا :

" اماں جان ، ———— اگر نازو کو دق ہوئی ، اور حکیموں نے لوگوں کا اس کے پاس آنا جانا روکا ، تو میں ضرور جایا کروں گی ، اس کا دل بہلاؤں گی ، اس کی تیمار داری کروں گی ———— اماں جان آپ مجھے روکیں گی تو نہیں اس کے پاس جانے سے !"

یہ حد درجہ عجیب اور بے ڈھنگا سوال سن کر ، کچھ دیر کے لیے تو سگّن پر سکتہ سا طاری ہو گیا ۔

پھر انھوں نے ایک دو ھتّڑ اس کی پیٹھ پر جمایا ، اور کہا :

" کمبخت ، ایسی بد فالی کی باتیں منھ سے نکالتے شرم نہیں آتی ، اسے کیوں دق ہونے لگی ، اس کے دشمنوں کو ہو !"

نازو نے اماں جی کا مُوڈ بدلنے کے لیے کہا :

" امراؤ ، اماں جان اگر تمھیں میرے پاس آنے سے روکیں گی ، تو میں خود تمھارے پاس آجایا کروں گی !"

سگّن ان باتوں سے لطف لیتی ہوئی ، اور امراؤ کے عجیب اور بے ڈھنگے سوال سے بُز بُز ہوتی ہوئی واپس چلی گئیں ۔

ان کے جانے کے بعد نازو نے ایک نہایت زبردست چٹکی امراؤ کے لی ، اور کہنے لگی :

" کیوں بی امراؤ ———— مجھے دق ہوئی ؟ اور تم میری تیمار داری کیا کرو گی ؟"

لیکن چٹکی کی شدّت سے وہ چیخ پڑی ۔

پکھراج نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :

" ارے بھئی چھوڑو، امراؤ کو، یہ تو جب تک ہر فن میں طاق نہیں ہوجاتی، اس کے بارے میں کچھ سوچنا بے کار ہے!"

نازو نے کہا :

" اچھا بھئی، چھوڑ دیا اس پگلی کو، پھر کس کے بارے میں سوچیں ؟"

" جو بالکل خاموش بیٹھا ہے !"

" خاموش تو نیلم ہے !"

" ہاں وہی ۔"

" تو کیا ان حضرت کا وقت بھی آگیا ؟"

" جی جناب آگیا، اور شاید سب سے پہلے آجائے گا۔ "

" کیوں نیلم، سچ کہہ رہی ہے یہ ؟"

" یہ جھوٹوں کی بادشاہ، سچ کہنا کیا جانے ——— تم بھی کس کی باتوں میں آگئیں !"

پکھراج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا :

" تو نام بتادوں ؟"

نیلم کچھ جھینپ سی گئی، کہنے لگی :

" نام کا کیا ہے، جو نام چاہو لے دو، کوئی زبان پکڑ سکتا ہے تمھاری ؟"

" میں ایسا نام لوں گی جو تمھاری زبان بند کر دے گا !"

نازو نے اسے ہشکایا ،

" تو پھر پہیلیاں کیوں بھجوا رہی ہو، نام لیتی کیوں نہیں ؟"

پکھراج نے مسکراتے ہوئے اور نیلم کو چھیڑتے ہوئے کہا :

(۱۷)

سگن کے جانے کے بعد نازو نے بڑے ناز و انداز کے ساتھ کہا :

" تم نے ہم سب کی تو ٹوہ لگالی بی امراؤ ——— ذرا کچھ اپنا حال بھی تو بیان کرو !"

وہ منہ بنا کر، اور تیوری چڑھا کر بولی :

" اپنا حال کیا بتاؤں ؟ دیکھ رہی ہو بہت اچھا ہے !"

نازو نے مسکراتے ہوئے کہا :

" ہم سے اڑو گی، ہم تو ان لوگوں میں ہیں جو ——— خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر !"

" ہوگا یہ کمال تم میں، لیکن بندی نے آج تک تو کسی کو خط لکھا نہیں !"

" نہ لکھو گی ؟"

" ہزار بار لکھوں گی ۔"

" کسے ؟ کس کو ؟"

" جسے جی چاہے گا، تم کوئی خدائی فوجدار ہو جو پوچھنے چلی ہو ؟ جب لکھوں گی تو ایک وعدہ کرتی ہوں بے شک تم سے ؟"

" کرو وعدہ جلدی سے !"

" یہ کہ لفافہ تمھیں دکھلا دوں گی، تم خط کا مضمون بھانپ لینا !"

"ایک صاحب رضی الدین حیدر ہیں!"

یہ نام سُن کر نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

پکھراج نے پوچھا :

"جانتی ہو ان صاحب کو؟"

"اکثر آیا کرتے ہیں ہمارے گھر!"

نازو کو موقع مل گیا، کہنے لگی :

"او ہو، تو یہاں پانی مرتا ہے، کیوں بی نیلم، کیوں اکثر آیا کرتے ہیں، تمہارے گھر؟"

"شوقین مزاج آدمی ہیں آتے ہیں!"

"لیکن اپنے گھر میں لے دے کے تمھی تو دہکتا ہوا شعلہ اور بھڑکتی ہوئی چنگاری ہو باقی سب بڑے بوڑھے ہیں، ظاہر ہے تمھارے ہی پاس آتے ہوں گے!"

"اچھا آتے ہیں، پھر؟ کون سا غضب ہو گیا؟"

"خدا نہ کرے غضب کیوں ہوتا، یہ تو بڑی مبارک خبر ہے، ——— ہاں تو کچھ سلسلہ چل رہا ہے؟"

وہ بے پروائی کے ساتھ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی :

"ہو گا بھئی، اب ختم کر دو یہ قصہ ——— تمھیں تو لے دے کے یہی فکر ہے کس کا کس کے ساتھ سلسلہ چل رہا ہے، اپنی خبر تو لو!"

بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا :

"اپنی خبر کیا لوں؟ میں تو چشم براہ بیٹھی ہوں انتظار میں آنے والے کے!"

زمرّد نے ہنستے ہوئے کہا :

"بڑی بے غیرت ہے!"

امراؤ بولی :

"اور بے شرم بھی ــــــ جھوٹ موٹ سہی، ذرا تو لجاتی !"

نازو نے بڑے اطمینان سے پان کا بیڑہ منھ میں رکھا اور بولی :

"لجاؤں کیوں ؟ یہ کون سی نئی بات ہوگی، یہ سلسلہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ جب بات یہ ٹھہری تو پھر لجانا کیسا ؟"

امراؤ نے عاجز آکر کہا :

"ہاں بھئی سچ کہتی ہو۔ ہم نے غلطی کی تھی یہ کہہ کر اب معاف کر دو !"

نازو نے اٹکھیلی کرتے ہوئے جواب دیا :

"جاؤ معاف کر دیا، لیکن اب کبھی ایسی گستاخی نہ کرنا ! ــــــ لیکن ایک بات زمرد سے طے کرنا ہے !"

"یہ لو اب میری شامت آگئی !"

"شامت کی نہیں، پیار کی بات ہے۔"

"خدا خیر کرے !"

"ہاں بھئی خیر ہی خیر ہے ــــــ کہنا یہ ہے کہ جب نواب منّن خاں تمھیں باقاعدہ اپنالیں تو ظاہر ہے بڑی یادگار تقریب ہوگی۔ اس میں شہر کی سب ہی طوائفیں، اور ڈیرے دارنیاں، اور ان کی لڑکیاں مدعو ہوں گی ــــــ ہوں گی نا ــــــ ؟"

"بے شک، ــــــ امّاں نے تو بڑا زبردست پروگرام بنایا ہے۔ وہ کہتی ہیں، اس تقریب کو ایسے شاندار طریقے پر مناؤں گی، کہ برسوں لکھنؤ والے یاد رکھیں گے !"

"ٹھیک ہے، ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے ــــــ لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ ہم لوگ

استاد منگھو خاں اور سگّن کی باتوں کو جو پہلی مرتبہ، امراؤ کی بے پروائی اور بدشوقی کے بارے میں ہوئی تھیں، آج چھ مہینے سے زائد گزر چکے ہیں، اس وقت بھی، وہ سگّن کے پاس بیٹھے ہیں اور بہُت خوش نظر آرہے ہیں۔

سگّن نے کہا :

"استاد، آج تو بہُت خوش دکھائی دیتے ہو!"

وہ پہلو بدل کر بولے :

"ہاں بھئی واقعی بہُت خوش ہوں!"

"کیوں خوش ہو، ہمیں بھی بتاؤ، تاکہ ہم بھی ذرا دیر کو خوش ہولیں، ورنہ ہمارا اور خوشی کا کیا ناطہ!"

استاد نے اور زیادہ خوش ہوتے ہوئے، بلکہ خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے کہا:

"سگّن، خوش ہو جاؤ، اب تمھاری خوشی کا زمانہ آگیا ہے، تم ہمیشہ خوش رہوگی ——— !"

"لیکن آخر کیوں؟"

"تم نے وہ پالا مارا ہے کہ کوئی تمھاری ٹکّر نہیں لے سکتا۔"

"پالا؟ ——————— میں نے پالا مارا ہے؟ استاد آج ضرور تم بہت زیادہ افیم کھا گئے ہو!"

جو یہاں جمع ہیں اس تقریب میں شریک نہیں ہوں گے !"

زمرّد کچھ گھبرا سی گئی، اس نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا :

" کیوں بھائی، کس جرم میں ؟ کیا خطا کی ہے میں نے ؟"

بڑی بے تکلفی کے ساتھ نازو نے کہا :

" خطا کیسی ؟ اور تم ہزار خطائیں کرو ہماری طرف سے معاف ہیں، ——— تمھیں چاہتے جو ہیں !"

" پھر یہ بائیکاٹ کیوں ؟"

" بائیکاٹ بھی نہیں دکھاوے کو آ بھی جائیں گے !"

" صرف دکھاوے کو ؟"

" ہاں ——— اس تقریب کے بعد ہم سب کی دعوت نہایت شاندار پیمانے پر الگ ہونی چاہیئے کسی اور کو اس میں شرکت کی اجازت نہ ہوگی !"

زمرّد خوش ہوگئی، کہنے لگی :

" ایک نہیں، دس دعوتیں دُوں گی تم لوگوں کو ——— سچ پوچھو تو زندگی کا لطف تمھارے ہی دم سے ہے !"

◎

رکھ دیں، استاد نے للچائی ہوئی نظروں سے طشتری کو دیکھا، پھر اسے اپنی طرف کھینچا اور بغیر کسی مزید بات چیت کے جلدی جلدی صاف کر گئے، اصغری طشتری اٹھا کر لے گئی۔

سگّن نے کہا :

"لو استاد تمھارا منھ بھی میٹھا کر دیا، اب ذرا صاف صاف بتاؤ، اصل بات کیا ہے؟ کیوں تم جوشِ مسرت سے بے قابو ہوئے جا رہے ہو؟ دیکھو کچھ چھپانا نہیں، سب کچھ رتی رتی کہہ ڈالو!"

استاد نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ مشتری آ گئی، یہ نیلم کی ماں تھی، اور سگّن سے اس کے دیرینہ تعلقات تھے، مشتری کو آتا دیکھ کر استاد نے منھ بنا کر بڑی خفگی سے کہا :

"حرامزادی کو اسی وقت آنا تھا؟ رنگ میں بھنگ کر دیا اس نے، یہ دفع ہو لے تو اپنی بات شروع کروں!"

◎

استاد نے ایک کمزور سا قہقہہ لگایا اور کہا :

" افیم ، ارے بھئی اب تو میرے لیے شراب جائز ہے ، ٹھرّا نہیں ، پرتگالی شراب پیوں گا ، پلاؤں گا ، جھوموں گا ، اور سارے شہر کو جھومنے پر مجبور کر دوں گا ۔"

" آخر کس تقریب میں ؟ "

" اب تو تقریبوں کا سلسلہ چل پڑے گا ، روز تقریبیں ہُوا کریں گی اس ویرانے میں ——— سگّن ، سُنتی ہو ، اب تمھارے خزاں رسیدہ گلشن میں بہار آگئی ہے ، اب یہ خرابہ ہیر شبستانِ عشرت میں تبدیل ہو جائے گا ، اب تک حالت یہ ہے ، کہ جاننے والے بھی اِدھر سے گزرتے کتراتے ہیں ، نظر بچا کر نکل جاتے ہیں ، لیکن اب نہ جاننے والے بھی آئیں گے اور دیکھ لینا ، سر کے بل آئیں گے ! "

" (اکتا کر) استاد تمھارا دماغ چل گیا ہے شاید ! "

" واقعی زیادہ خوشی انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے ——— اور آج مجھ پر دیوانگی بھی طاری ہے ! "

" لیکن اس خوشی کا سبب ؟ اس دیوانگی کی وجہ ؟ "

" سگّن ، مایُوسی کے اندھیرے میں امید کا چاند روشن ہُوا ہے ! "

" ہُوا ہوگا ، خدا مبارک کرے ، ——— لاؤ تمھارا منہ میٹھا کرا دُوں ! ——— اری اصغری ! "

اصغری فوراً سامنے آ کر کھڑی ہوگئی ۔

سگّن نے کہا :

" حمید حلوائی کے ہاں سے مٹھائی کا جو خوان آیا ہے ، اس میں سے اُستاد کا حصّہ نکال لا ۔ "

وہ چلی گئی اور ذرا دیر میں ایک بڑی سی طشتری میں کئی قسم کی مٹھائیاں لا کر سامنے

"لیکن میرا قصور؟ میری خطا؟"

"میں نے تمھیں تعلیم دی، مگر کبھی ایک پھوٹی کوڑی نہ ملی، تمھاری اماں جان ہمیشہ حساب دوستاں در دل کہہ کر ٹالتی رہیں، تمھاری لڑکی کو سکھایا، مگر تم اپنی ماں سے زیادہ کنجوس نکلیں، بس مسکرا کر دیکھ لیا اور مطمئن ہو گئیں کہ مجھے بہت کچھ دے دیا۔ میں قبر میں گیا تو فرشتوں نے پوچھا: "تو نے کبھی خیرات بھی کی تھی اللہ کے نام پر؟" "میرے پاس تم لوگوں نے چھوڑا کیا تھا جو خیرات کرتا، میں نے کہا۔" چند دن کے لیے دُنیا میں جانے کی اجازت دے دیں، جس جس پر میری رقم باقی ہے، گلا گھونٹ کر وصول کروں گا اور خیرات کر کے چلا آؤں گا۔" فرشتوں نے رحم کھایا اور اجازت دے دی، بی سگن نے تو حساب بیباق کر دیا۔ اب تمھاری باری ہے، لاؤ سیدھے ہاتھ رکھ دو، ایک ہزار اس طرف!"

مشتری نے کہا :

"کیا پاگل خانے جانے کا جی چاہا ہے، دس نہ بیس ایک ہزار دے دُوں بڑے میاں کو۔"

سگن نے ہنستے ہوئے استاد سے کہا :

"اچھا بھئی ہماری خاطر معاف کر دیں، اس بے چاری کو آج کل ذرا پریشانی بھی ہے!"

وہ فاتحانہ لہجے میں بولے :

"جاؤ معاف کیا۔"

مشتری اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ ماتھے تک لے جا کر بڑے ادب سے کہا :

"شکریہ استاد جی! زندگی بھر یاد رکھوں گی آپ کا یہ احسان!"

سگن کو اس وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ استاد آج اتنے غیر معمولی طور پر خوش کیوں نظر آ رہے ہیں اس کا راز معلوم کرے۔ اس وقت مشتری کا آنا اسے بھی ناگوار گزرا تھا، لیکن اخلاقاً کچھ کہہ نہ سکی، مگر زیادہ منہ نہیں لگایا، مشتری نے بھی یہ بات محسوس کر لی کہ دونوں میں کوئی خاص بات ہو رہی تھی۔ میرا بیچ میں ٹپک پڑنا اچھا نہیں ہوا، لہٰذا تھوڑی دیر بیٹھ کر اُٹھ

(۱۹)

مشتری نے آتے ہی استاد نبقے خاں پر چوٹ کی :

"ارے تم زندہ ہو ابھی استاد ؟"

وہ بے حد جل کر بولے :

"مدت ہوئی مر چکا !"

وہ ہنستی ہوئی سگن کے پاس بیٹھ گئی اور کہنے لگی :

"مر چکے تو یہاں کیسے بیٹھے ہو ؟"

استاد نے بے رُخی کے ساتھ جواب دیا :

"تم نے سُنا نہیں بعض دفعہ قبر سے کفن پھاڑ کر مُردے باہر نکل آتے ہیں، میں بھی نکل آیا، تلاش میں تمھاری تھا، غلطی سے آ اس طرف گیا !"

مُشتری نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا :

"اُوئی، میری تلاش میں کیوں تھے ؛ میں تو مرنا نہیں چاہتی !"

وہ کڑک کر بولے :

"مَیں تو مارنا چاہتا ہُوں !"

مُشتری نے فریادی نظروں سے سگن کی طرف دیکھا اور کہا :

"مجھے مارنا چاہتے ہو ؟"

"ہاں تمھیں !"

کھڑی ہوئی :

"اچھا بہن اب چلتی ہوں !"

سگن نے اخلاقاً کہا :

"واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی ؟ ابھی آئیں ، ابھی چلیں ، بیٹھو ، کون سے کام رُکے ہوئے ہیں تمہارے بغیر گھر گے !"

مشتری نے کھڑے کھڑے جواب دیا :

"دراصل ایک ضروری کام یاد آگیا ہے اس وقت ، اس وقت اجازت دو ، پھر کسی وقت اطمینان سے آؤں گی ، کچھ ضروری باتیں بھی کرنا ہیں تم سے !"

سگن نے اجازت دی اور مشتری دل ہی دل میں "نگوڑے نتھے خاں" کو بُرا بھلا کہتی واپس چلی گئی !"

مشتری کے جانے کے بعد، استاد منّقے خاں نے ایک مرتبہ پھر بڑی بھاری بھرکم گالی دے دی اور کہنے لگے :

"کمبخت کو اسی وقت مرنا تھا!"

سگن نے استاد کی گالی سے کافی لطف لیا، پھر کہنے لگی :

"آخر بے چاری نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، کیوں اس سے خفا ہو؟"

کہنے لگے :

"بھئی ہم تو کھرے آدمی ہیں، خالص پٹھان ——"

"وہ تو میں جانتی ہُوں، اور تمھارے کھرے پن کی بڑی قدر کرتی ہُوں —— صرف قدر ہی نہیں عزّت بھی!"

وہ سینہ ٹھونک کر بڑے جوش کے عالم میں گویا ہُوئے :

"جو تمھارا دشمن وہ ہمارا دشمن!"

سگن چونک سی پڑی، کہنے لگی :

"مجھے یقین ہے جو میرا دشمن ہے تم بھی اس کے دشمن ہو، لیکن مُشتری کا اس سے کیا تعلق؟ وہ تو دشمن نہیں ہے!"

پان کی بڑی سی پیک تھوکتے ہوئے استاد نے کہا :

"تمھاری انھی ناسمجھیوں نے تمھیں تباہ کیا ہے۔ وہ تو کہو قسمت اچھی ہے جو

بہانے کا!"

"لیکن ایک بات تو سُنیے!"

"سُن رہا ہوں، کہے جاؤ۔"

"بے شک مُشتری نے نواب معین الدّین کو مجھ سے چھین لیا، اور مَیں بقول آپ کے، مُنھ دیکھتی رہ گئی، لیکن نتیجہ کیا ہُوا؟"

"ہُوا ہوگا کچھ، ہمیں کیا؟"

"صرف ایک سال کی مدّت میں نواب معین الدین کا جی اس سے اتنا بھرا کہ متنفّر ہو گئے، پھر میرے پاس آئے، قدموں پر گرے، معافی مانگی، محبّت کی دُہائی دی اور مرتے دم تک اپنی وضع نباہتے رہے، خدا انھیں جنّت نصیب کرے۔ میرا گھر انھوں نے سونے، چاندی سے بھر دیا۔"

"وہ تو خیر نیک مرد تھا، اور پٹھان بھی تھا۔ جنّت میں ضرور جائے گا۔ لیکن اس حرامزادی نے تو اپنی ایسی کر لی!"

"ہاں ——— اور منھ کی بھی کھائی!"

"ذرا دیکھو تو بے غیرت کو پھر بھی تمھارے پاس آتی ہے، شرم نہیں آتی!"

"میں نے تو اسے نواب صاحب مرحوم کے زمانے میں بھی آنے سے نہیں روکا۔ اس کا آنا ندامت کا آنا تھا، آتی رہی، میں اس کی پیشوائی کرتی رہی، دعوتوں میں بلاتی رہی، نواب صاحب کی موجودگی میں بھی مَیں اسے بلاتی رہی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کا دل ایسا کھٹّا ہو گیا تھا کہ انھوں نے کبھی منھ نہیں لگایا!"

"وہ لگانے کے قابل ہے؟"

سگّن کو پھر ہنسی آ گئی۔ اس نے کہا:

"خدا کیلئے استاد معاف کر دیں بے چاری کو، کبھی تو مان لیا کیجیے ہماری بات!"

تباہ ہوئیں نہیں، ورنہ دشمنوں نے کوئی کسر اٹھا رکھی تھی؟ ——— اور اس مُشتری کو بھُول گئیں؟"

"وہی تو پوچھ رہی ہُوں اس نے کیا کیا؟"

"یہ تم سے حسد کرتی ہے، یہ تم سے جلتی ہے، یہ تم سے خار کھاتی ہے۔ اب تو خیر تم دونوں سن سے اتر گئی ہو، لیکن جب تک تمھارا چراغ جلتا رہا، یہ ہمیشہ پھونک مار مار کر اسے بجھانے کی کوشش کرتی رہی، ویسے ظاہر میں دوست بھی بنی رہی!"

"اُونھ، جس نے جیسا کیا ہے، ویسا پائے گا۔ ہمارا دل صاف ہے۔ ہم نے نہ کسی کا بُرا چاہا، نہ کسی سے دشمنی کی!"

"کیا کہنا ہے بڑی دلی زادی!"

"لیکن اس وقت آپ مُشتری پر ادھار کھائے کیوں بیٹھے ہیں؟"

"بتا تو چکا ——— نواب معین الدّین تمھاری طرف مائل تھے، چاہتے تھے تمھیں، لیکن یہ قطامہ بیچ میں کُود پڑی، اس نے یہ جانتے ہوئے کہ ان کا دل تمھاری طرف مائل ہے، ان پر ڈورے ڈالے، تم ٹھہریں اللہ میاں کی گائے۔ وہ نخرے کیا جانو، جو اس بڑھیا میں بھرے ہُوئے تھے ——— نتیجہ یہ ہوا کہ تم منھ دیکھتی رہ گئیں اور یہ بازی لے گئی، قسم ہے جناب امیرؑ کی آج تک یہ سوچ کر دل میں ہُوک اٹھتی ہے، جی چاہتا ہے خنجر گھونپ دوں حرامزادی کے سینے میں اور اس سے جو اُبلتا ہوا لال لال خون نکلے، اسے پی جاؤں کھڑے کھڑے!"

سگّن ہنسنے لگی، اس نے کہا:

"استاد، اپنے دل سے انتقام کا جذبہ نکال دیجیے!"

"کیسے نکال دُوں ——— میں تو پٹھان ہوں، دوست ہُوں تو دوست کے پسینے پر خون بہادُوں گا، دشمن ہُوں تو اُس کے خون پر پسینہ

"آ گئی پھر بہار گُلشن میں"

وہ بولے :

"معاف کرتی ہے میری جُوتی، میرے سامنے اس کا نام بھی نہ لیا کرو۔ کمبخت نے ہماری باتوں کا رُخ ہی بدل دیا۔ اصغری کو حکم دو، تھوڑی سی مٹھائی اور لا ئے، ذرا منھ میٹھا کر لوں تو پھر اپنی اصل باتیں شروع کروں۔"

سگن نے بڑی آمادگی کے ساتھ کہا :

"ہاں ضرور ——"

پھر اس نے اصغری کو بُلا کر مٹھائی لانے کا حکم دیا، اور منتظر رہی کہ کھا چکیں تو باتیں شروع ہوں!"

◎

(۱)

جب خوب سیر ہو کر استاد بنتھے خاں نے مٹھائی کھالی، ——————— تو سگن نے تقاضا کیا :

"ہاں تو کیا کہہ رہے تھے آپ ؟"

اب استاد کا مُوڈ بالکل بدل چکا تھا، ساری بدمزگی دُور ہو چکی تھی اور نشاط و مسّرت کی کیفیت ان پر طاری تھی، کہنے لگے :

"بھئی، کہہ یہ رہا تھا کہ تمھاری لڑکی تو عقل اور ذہن کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک ہے !"

یہ سُن کر سگن خوش تو ہُوئی لیکن اسے یقین نہیں آیا، کہنے لگی :

"بہت ستاتی ہو گی !"

"ابجی ہزار مرتبہ ستالے، اپنی بچّی ہے، اس کی باتوں کا بُرا کون مانتا ہے، لیکن میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ صرف چھ مہینے کی مدّت میں وہ میری استاد بن گئی ہے !"

سگن نے حیرت سے استاد کی طرف دیکھا اور پوچھا :

"یعنی تعلیم میں ذرا بھی جی نہیں لگاتی ؟"

وہ بولے :

"ایسا ہوتا تو شکایتوں کا ڈھیر لگا دیتا تمھارے سامنے، آخر اس کی زندگی ہمی

ناچ دیکھو گی تو جی چاہے گا خود اس کے ساتھ ناچنے لگو۔ عام طور پر، یہ دونوں فن ایک ساتھ کسی کو نہیں آتے۔ کسی ایک ہی میں ماہر ہوتا ہے، لیکن یہ تو دونوں میں طاق ہے! ——— اور غضب خدا کا صرف چھ مہینے!"

"تعجب ہے!"

"تعجب تو مجھے بھی ہے، لیکن میری سمجھ میں ایک وجہ آتی ہے!"

"وہ کیا؟ کون سی وجہ؟"

"بات یہ ہے کہ تمھیں وہ بہت زیادہ چاہتی ہے!"

"ہاں ——— اسی چیز نے تو اسے چھیل چھبیلا بنا دیا ہے!"

"تم تو بس شکایتوں کا طومار لیے بیٹھی ہو، میری سنو!"

"فرمائیے، سُن تو رہی ہوں!"

"سُن کیا خاک رہی ہو؟ ——————— میں کچھ کہتا ہوں، تم کچھ اور شروع کر دیتی ہو!"

"اچھا اب نہیں بولوں گی، کہیے!"

"مَیں کہہ یہ رہا تھا کہ تمھیں وہ بہت زیادہ چاہتی ہے۔ اس دن تم نے جو اسے نصیحت کی وہ اس کے دل میں بیٹھ گئی، اور تن من دھن سے فن سیکھنے میں لگ گئی، ورنہ کہاں وہ، اور کہاں تعلیم کا شوق؟ میں گانا سکھا رہا ہوں۔ وہ پتنگوں کا مقابلہ دیکھ رہی ہے اور مجھ سے فرمائش کر رہی ہے کہ دیکھیے، آج تو غضب کا مقابلہ ہے۔ میں ناچ سکھا رہا ہوں اور وہ میری ہیئت کذائی دیکھ کر ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی ہے۔"

"اور اب؟"

"اور اب یہ حال ہے کہ میں تھک جاتا ہوں، مگر وہ ریاضت کرتے کرتے نہیں تھکتی، ایک ایک بات کو بار بار پوچھتی ہے اور جب تک اچھی طرح حاصل نہیں کر لیتی، میرا

لوگوں کو بنانی ہے، شرارتوں سے عاجز آکر کیا اسے چھٹا چھرید ا چھوڑ دیں گے کہ جو چاہے کرتی پھرے، تعلیم حاصل کرے یا نہ کرے ؟"

"تو آخر ہُوا کیا ؟"

"بتا تو رہا ہوں بھئی، اب وہ اپنے فن میں طاق ہوگئی ہے!"

"یعنی گانا سیکھ لیا ہے ؟"

"صرف گانا ؟ ارے بھائی ناچ بھی۔ اور دونوں میں وہ کمال حاصل کرلیا ہے، اس مختصر سی مدّت میں کہ روز اس پر قل ھو اللہ پڑھ کر پھُونکتا ہُوں کہ خدا نظرِ بد سے بچائے ______ سگّن، اس نے میرا پورا فن حاصل کر لیا ہے، تم بھی اس کے سامنے ہیچ ہو! ______ تھیں پُرانے زمانے میں بُہت کچھ، لیکن کہاں امراؤ، کہاں سگّن۔ زمین آسمان کا فرق ہے!"

"اتنی ماہر ہوگئی ہے ؟"

"ہاں بھئی ہاں !"

"مجھے تو یقین نہیں آتا استاد !"

"یقین کرنے کی بات بھی نہیں ہے، لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے، اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا!"

"کیسے مان لوُں استاد ؟"

"امتحان لے لو، ______ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے ؟"

"اور اگر ذرا بھی مَیں نے اس میں خامی پائی ؟"

"تو جیسی چاہو قسم لے لو۔ فوراً چھت سے چھلانگ لگا دُوں گا!"

"ناچ بھی اور گانا بھی ؟"

"ہاں بی سگّن ہاں، ______ گانا سنو گی تو کہو گی، ناچ اسے کیا آتا ہوگا۔

(۲)

سگن نے امتحان کے بارے میں امراؤ سے کوئی بات چیت نہیں کی، بلکہ استاد ننھّے خاں سے بھی تاکید کر دی کہ اسے "امتحان" کی خبر نہ دیں، کل جب معمول کے مطابق اسے تعلیم دینے جائیں، تو "اتفاق" سے وہ بھی آ جائے گی اور وہ خود فرمائش کر کے اسے مجبور کریں کہ امراؤ کا ناچ دیکھ لے، اور گانا سن لے۔

استاد ننھّے خاں نے بھی اس رائے سے اتفاق کر لیا تھا، چنانچہ دوسرے روز جب وہ معمول کے مطابق آئے تو انھوں نے سگن سے کہا :

"میں امراؤ کے کمرے میں جا رہا ہوں۔ لیکن تم فوراً پہنچ جاؤ!"

سگن نے سوال کیا :

"فوراً کیوں اُستاد ؟"

وہ کہنے لگے :

"میں چاہتا ہوں تم ایسے وقت آؤ کہ اس نے ابھی ناچ یا گانا شروع نہ کیا ہو، دوران میں اگر تم آئیں تو اس کا نفسیاتی اثر اچھا نہیں پڑے گا!"

سگن نے اس رائے سے اتفاق کر لیا۔

استاد ننھّے خاں کو، امراؤ کے کمرے میں پہنچے ہوئے مشکل سے تین منٹ ہوئے ہوں گے کہ سگن پہنچ گئی ——

اس نے استاد سے کہا :

پیچھا نہیں چھوڑتی، مَیں گھنٹہ بھر تعلیم دیتا تھا، یہ گھنٹہ بھر اس کے لیے دوبھر ہو جاتا تھا، کبھی سر میں درد، کبھی انگڑائی، کبھی جمائی، کبھی خود بخود یہ فیصلہ اب کل، اور اب یہ حال ہے کہ مَیں کہتا ہُوں بیٹی بہت ہو لیا، مگر وہ نہیں مانتی، نتیجہ یہ ہے کہ ایک گھنٹے کے بجائے مجھ بوڑھے کو چار چار پانچ پانچ گھنٹے تک سر مغزی کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ، لیکن خدا کا شکر ہے، محنت اکارت نہیں گئی، آج سے اس کی تعلیم بند!"

"ارے استاد، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں بھئی ہاں، اب اپنا اور لڑکی کا وقت کیوں ضائع کروں، اسے سب کچھ آچکا ہے اسے کچھ بھی اب سیکھنے کی ضرورت نہیں!"

"لیکن مجھے امتحان تو لے لینے دیں، اس کا؟"

"ابھی چلو!"

"ابھی نہیں کل ——— کل اس کا بھی امتحان ہے اور (مسکرا کر) آپ کا بھی، اگر میری بچی کامیاب ہوگئی تو آپ کا منھ موتیوں سے بھر دوں گی!"

"جی وہ موتی میری طرف سے اسی کو دے دیجیے گا ——— شکریہ!"

◎

اور اپنی بچّی پر !"

اب امراؤ بول پڑی :

" امّاں جان دیکھ تو لیجیے ——————— مَیں نے کیا سِیکھا ہے
اتنے دنوں میں !"

وہ بولیں :

" تو کہتی ہے تو یہی سہی !"

"جاتے وقت مجھ سے ذرا مل لیجئے گا ——— آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں !"

یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔

استاد نے پوچھا :

"چلیں کہاں بھئی ؟"

وہ بولی :

"گھر کے بہت سے کام انجام دینا ہیں !"

استاد نے اصرار کیا :

"ذرا دیر تو بیٹھ جاؤ !"

سگّن نے کھڑے کھڑے پوچھا :

"کیا بات ہے ؟ کیوں بیٹھ جاؤں ؟

استاد کہنے لگے :

"ذرا میرا ، اور اپنی لڑکی کا امتحان تو لے لو !"

سگّن نے انجان بن کر سوال کیا :

"لڑکی کا تو خیر ، لیکن آپ کا امتحان کیا لُوں ؟"

وہ بولے :

"——— یہ کہ ماشاء اللہ تمھاری بچّی ——— کتنی ذہین ہے اور خدا کے فضل سے ——— مَیں نے اس چھ مہینے کی مدّت میں جھک نہیں ماری ہے !"

وہ بیٹھتی ہوئی بولی :

"آپ کہتے ہیں ، تو بیٹھی جاتی ہُوں ، ویسے مجھے آپ پر بھی بھروسا ہے ،

"یہ کچا گانا کیا ہوتا ہے؟ ——— ہمیں تو آپ نے نہ کبھی سنایا، نہ سکھایا؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولے :

"ہوتا ہے ——— لیکن اس کے سوال کا جواب دو ——!"

سگن نے کہا :

"تو بیٹی دونوں سہی پھر!"

امراؤ نے ——— ماں کو پکا اور کچا گانا ——— کوئی ایک گھنٹے تک سُنایا۔

اور واقعی سگن حیران ہو ہو گئی۔ اسے ہرگز یہ توقع نہیں تھی، کہ یہ بدشوق لڑکی اس قدر جلد ماہر اور کامل بن جائے گی۔ گانا سُن کر اس نے امراؤ کو اپنے پاس بلایا، اسے خوب سا پیار کیا، اور کہا :

"ماشاءاللہ ——— تُو واقعی کامل ہو گئی ہے، اس فن میں، میں قربان ——!"

استاد نے مداخلت کرتے ہوئے امراؤ سے کہا :

"بیٹی ——— ناچ رہا جاتا ہے، ——— وہ بھی دکھا کر اپنی ماں کو تڑپا دے!"

وہ مسکراتی ہوئی دوسرے کمرے میں گئی ——— اور رقص کا لباس زیب تن کر کے آ گئی

اور پھر اپنے رقص بے مثال کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ یہ سلسلہ بھی کوئی ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ اب امراؤ کچھ تھک چلی تھی ———

اس نے پوچھا :

(۳)

سگن وہیں استاد کے قریب بیٹھ گئی ——————

امراؤ نے پوچھا :

" امّاں جان ، ————— گانا سناؤں یا ناچ دکھاؤں ؟ ——————

بتائیے ——— ! "

وہ پیار بھرے لہجے میں بولیں :

" بیٹی ، جو تیرا جی چاہے ——————— اب بیٹھی ہُوں تو تیرے دونوں

ہی کمال دیکھوں گی ! "

امراؤ نے کچھ شرماتے ہوئے مسکرا کر کہا :

" کمال ———— اچھا پہلے گانا سُنیئے ! "

سگن نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا :

" ہاں بٹیا ، گانا سہی ! "

امراؤ نے پھر ایک سوال جڑ دیا :

" پکّا گانا ، یا کچّا ؟ "

سگن کو ہنسی آگئی ——————

اس نے استاد ننھّے خاں سے پوچھا :

سگن کے پیچھے پیچھے استاد نھتّے خاں بھی رونق افروز ہو گئے آکر، اور کہنے لگے :

"کہو بھئی کیا کہتی ہو؟"

پُرغرور، اور ممنون نگاہوں سے سگن نے استاد کی طرف دیکھا اور کہا :

"خدا مبارک کرے، آپ نے اس پر واقعی اتنا ہی ریاض کیا ہے، جتنا ایک بیٹی پر کیا جا سکتا ہے!"

استاد نے بھی بڑے فخر اور جوش کے ساتھ کہا :

"اس دنیا میں اس کے سوا میرا اور ہے کون؛ بیٹی کہہ لو، بیٹا کہہ لو، سب کچھ وہی ہے، کیا اپنا فن اپنے ساتھ قبر میں لے جاتا؛ میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا جانشین پیدا کر دیا، اب بڑی خوشی سے مروں گا!"

سگن نے شکایت آمیز لہجے میں کہا :

"استاد یہ باتیں ہمیں اچھی نہیں لگتیں، خدا نے چاہا تو آپ بہت دن جئیں گے اپنے فن کو، جسے زمانہ مُردہ کر چکا تھا، زندہ ہوتے دیکھیں گے۔ ابھی امراؤ کو، کوئی بھی نہیں جانتا، آپ دیکھیں گے کہ کس قدر جلد شہرت اور عروج کی منزلیں طے کرتی ہے یہ گھر ایک خرابہ ہے، امراؤ پھر اسے گلشن بنا دے گی، اس گلشن پر خزاں کا قبضہ تھا، اب یہاں پھر بہار کا دور دورہ ہو گا۔ آپ یہ سب کچھ دیکھیں گے، آپ ہی نے نہ دیکھا اور

"امّاں ، بس یا اور ؟"

ماں نے اسے کلیجے سے لگالیا ، اور کہا :

"ماشاء اللہ ، ماشاء اللہ ، میری بچّی تو ہر فن میں طاق ہوگئی ہے ——!"

امراؤ نے کہا :

"اب وزیروں اور شہزادوں کو بُلائیے کہ میرے قدموں پر سر رکھیں !"

سگّن نے بڑے اعتماد سے کہا :

"ایسا ہی ہوگا ، میری بچّی —————— آیئے استاد ، پروگرام طے کریں !"

"ٹھیک ہے، بالکل مناسب!"

"اور دیکھ لیجئے گا، انھی میں سے کوئی نہ کوئی امراؤ کو دل دے بیٹھے گا!"

"کوئی نہ کوئی؟ —— کیسی باتیں کرتی ہو سگن؟ یہاں سے ہر شخص دل پکڑے ہوئے جائے گا، یہ تمھارا کام ہوگا کہ جسے چاہو قبول کر لو، جسے چاہو رد کر دو!"

"دیکھا جائے گا استاد!"

"مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات پر ہوتی ہے کہ ہماری امراؤ نہ حسن و جمال میں اپنا جواب رکھتی ہے، نہ نغمہ و موسیقی اور رقص میں —— دیکھ لینا، کتنی بڑی بڑی سرکاروں سے مجرے کی مانگ آئے گی، وہ مجرا کرنے جائے گی اور سیم و زر سے بھری ہوئی ہتھیلیاں لے کر واپس آئے گی —— یہ استاد بنتے خاں کا قول ہے کسی اور کا نہیں!"

"آپ کے منھ میں گھی شکر، خدا ایسا ہی کرے؟"

"اجی کیا باتیں کرتی ہو؟"

"کیوں استاد؟"

"خدا ایسا ضرور کرے گا، نہ کرنے والا ہوتا تو اسے بدصورت پیدا کرتا، نغمہ اور رقص سے بے بہرہ رکھتا، جب یہ تینوں نعمتیں اس نے اسے پوری فیاضی کے ساتھ عطا کی ہیں تو فکر کیسی اور اندیشہ کیوں؟"

"آپ کی بات دل کو لگتی تو ہے استاد!"

"ہمیشہ ایچ پیچ کی بات کرو گی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پہلی مرتبہ ہماری بات سن کر کہہ دیا ہو تا کہ ہاں استاد آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں!"

"غلطی ہوئی —— اب کہتی ہوں، آپ کا کہا برحق، انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا!"

مر گئے، تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ زہر کھالوں گی اور مر جاؤں گی!"

استاد نھتّے خاں نے بڑے عزم اور تیوّر کے ساتھ کہا:

"انشاء اللہ ہم دونوں، وہ مبارک گھڑی، اور وہ مبارک دن دیکھنے کے لیے زندہ رہیں گے!"

دل کی گہرائی کے ساتھ سگّن نے تائید کرتے ہوئے کہا:

"انشاء اللہ!"

استاد نھتّے خاں نے پوچھا:

"تو پھر اب پروگرام کیا ہے؟"

سگّن خوشی کا جھولا جھولتی ہوئی کہنے لگی:

"اب خیر سے وہ جوان ہو چکی ہے، سب سے زیادہ فکر مجھے یہ تھی کہ ناچنے گانے میں کوری تھی، سو اللہ نے آپ کے ذریعے سے وہ فکر بھی دُور کر دی ——!"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر آگے ——؟"

"اب میرا ارادہ یہ ہے کہ ایک، لکھنؤ کے امیروں اور رئیسوں، وزیروں اور شہزادوں کی دعوت کروں، بڑی شاندار دعوت، اس موقع پر امراؤ اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرے، مجھے یقین ہے کہ ایک ہی مرتبہ کا مظاہرہ کام کر جائے گا اور یہ سونی دکان پھر چمک جائے گی، پھر یہاں سے نغمہ و موسیقی اور رقص کا طوفان اٹھے گا اور وہ سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا!"

"امید تو مجھے بھی یہی ہے!" ———— لیکن بُلاؤ گی کس کس کو ——؟"

"میرا نام کون نہیں جانتا ———— نئے اور پُرانے، جوان اور بوڑھے تمام رئیس اور امیر مدعو ہوں گے!"

"ضرور، کیوں نہیں بلانا پڑے گا، اور مشتری کو خاص طور پر، بلکہ میں خود اسے رقعہ دینے جاؤں گا!"

"یہ کیوں آخر؟"

"تاکہ جل کر بھسم ہو جائے۔"

"(ہنس کر) ابھی تک آپ نے اسے معاف نہیں کیا!"

"اجی ہٹو بھی، معاف کرتی ہے ہماری پیزار، اس نے کوئی کسر اٹھا رکھی تھی، جو ہم معاف کر دیں!"

"اچھا بھئی اسے ضرور بلائیے گا اور آپ خود رقعہ دے آئیے گا اسے جا کر، لیکن ـــ"

"توبہ ہے، بھئی میں تو تمہاری "لیکن" سے عاجز آ چکا ہوں، کہہ ڈالو کیا "لیکن"؟"

"دعوت نامہ بھی تو لکھنا ہے بڑی عبارت میں!"

"جی یہ بندہ بے شک جاہل ہے، لیکن دعوت نامہ ایک سے ایک لکھ لیتا ہے اس کی فکر نہ کیجیے!"

"بس تو مجھے منظور ہے، کام شروع کر دیجیے اللہ کا نام لے کر!"

◎

"اچھا ایک بات تو بتاؤ؟"

"جی فرمائیے!"

"یہ جشن کب کر رہی ہو؟"

"پروگرام بنانے میں، اور انتظام کرنے میں دو تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے!"

"(انتہائی برہمی کے ساتھ) غلط، بالکل غلط؟"

"کیوں استاد —— اتنے بڑے جشن کا انتظام کیا چند دن میں ہو سکتا ہے؟"

"چند دن میں؟ —— مجھ سے کہو تو چند گھنٹوں میں کر کے دکھا دوں!"

"آپ کے خیال میں کب ہونا چاہیئے؟"

"میں زیادہ سے زیادہ پندرہ دن کا وقت دے سکتا ہوں۔"

"پندرہ دن؟ —— بہُت کم ہیں!"

"نہیں بہت زیادہ ہیں!"

"سوچ لیجیے استاد، ایسا نہ ہو کہ بعد اُڑ جائے!"

"خوب سوچ لیا ہے، پندرہ دن کی مدّت بہت کافی ہے۔"

"خدا کے فضل سے جشن کے سلسلے میں خرچ کی طرف سے تو کوئی فکر نہیں ہے، سب کچھ ہو جائے گا!"

"پھر فکر کیا ہے یہ بھی بتا دو؟"

"جن لوگوں کو بُلایا جائے گا، ان کی فہرست بننا ہے، اس میں بار بار کانٹ چھانٹ ہوگی!"

"فہرست اپنے ساتھ کل لیتا آؤں گا، کانٹ چھانٹ کا کوئی سوال نہیں۔ ہم ہر اہم اور قابلِ ذکر آدمی کو مدعو کریں گے!"

"ٹھیک ہے —— پھر اپنے پیشے کی عورتوں کو بھی تو بلانا پڑے گا۔"

نازو نے جواب دیا :

" اور کیا ———— سَو دن سُنار کی، ایک دن لوہار کی۔ ہمیشہ ان کی چلتی رہی۔ آج ہماری باری ہے!"

امراؤ کو بھی ہنسی آگئی۔ کہنے لگی :

" خدا پناہ میں رکھے تجھ سے، زبان ہے کہ کترنی کی طرح چل رہی ہے!"

یہاں امراؤ کے کمرے میں تو یہ ہو رہا تھا ———— وہاں حویلی کے وسیع اور کشادہ صحن میں زرق برق شامیانہ نصب کیا گیا تھا، نہایت اعلیٰ درجہ کے قیمتی ایرانی قالین، سارے فرش پر بچھے ہوئے تھے، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گاؤ تکیے، اگالدان پانوں کی ڈبیہ رکھی تھی، مردوں کی نشست الگ تھی، عورتوں کی الگ۔ لیکن بالکل آمنے سامنے، اس لیے کہ مردوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کا ان عورتوں میں کسی نہ کسی سے ربط ضبط اور میل جول نہ ہو، اور عورتیں بھی اس موقع پر، اپنا جاہ و جلال دکھانے کے لیے بار بار ادھر سے ادھر آجا رہی تھیں۔

یہ مرد جو اس مجمع میں موجود تھے معمولی لوگ نہیں تھے۔

شہر کے چوٹی کے امراء، رؤساء، اعلیٰ حکام، خاندانِ شاہی کے بعض افراد اور دو ایک وزیر بھی موجود تھے۔

اسی طرح یہ عورتیں بھی کوئی معمولی نہ تھیں۔

شہر کی نامور ترین، طوائفیں، گانے والیاں، رقاصائیں اور ڈیرے دارنیاں، اپنی خوش جمال اور پری مثال لڑکیوں کے ساتھ رونق افروز تھیں۔ آمنے سامنے کی دونوں صفوں میں خوب چہلیں ہو رہی تھیں، فقرے کسے جا رہے تھے، ایک دوسرے پر طنز و تعریض ہو رہی تھی۔

استاد نتھے خاں اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھے!

(۵)

امراؤ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھی، کچھ شرمائی شرمائی سی، کچھ لجائی لجائی سی، زمرّد اور نازو، پورے انہماک کے ساتھ اس کے حسن و جمال کو زیادہ سے زیادہ تاب دار کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ واقعی اس وقت وہ شہزادی معلوم ہو رہی تھی۔ خود سگن اور استاد نتھّے خاں کو بھی اس وقت سے پہلے یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اتنی زیادہ خوب صورت ہے، نازو بار بار اس کا لباس بدلتی، اور مختلف زاویوں سے دیکھتی، کہ کپڑے کا یہ رنگ پھبن دکھا رہا ہے یا نہیں؟ اسی طرح زمرّد کے سامنے گہنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، ایک سے ایک بڑھ کر قیمتی اور نظر فروز، وہ چھانٹ رہی تھی، کبھی ایک ہاتھ میں اٹھا لیتی، کبھی دوسرا۔ کبھی نازو سے مشورہ کرتی، کبھی نیلم سے کہ یہ ٹھیک رہے گا؟ جب سب کا اتفاق ہو جاتا، اور پکھراج کی تائید بھی حاصل ہو جاتی، تو وہ اسے پہنا دیا جاتا۔

امراؤ اس اہم کام سے گھبرا رہی تھی، اس کا کہنا تھا:

"مجھے تو سادگی پسند ہے، اس سے اچھا نہ کوئی زیور ہے نہ لباس!"

نازو نے ہلکے سے ایک چپت رسید کی:

"چُپ ——"

زمرّد نے مسکراتے ہوئے اس کے گلے میں ہار ڈال کر کہا:

"اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھو، آج تو جو ہم چاہیں گے وہ ہوگا، کیوں نازو؟"

"ورنہ ابھی تو چلیے کسی طرح ؟"

سگّن نے اس تلخ کلامی کا ذرا بھی برا نہیں مانا ، کہنے لگی :

"چل کر ذرا امراؤ کو ایک نظر دیکھ لیجیے !"

استاد کے ہاتھ میں چینی کی ایک پلیٹ تھی جسے وہ خود اپنے رومال سے صاف کر رہے تھے ، وہ ان کے ہاتھ سے چھُوٹ کر چھن سے گری ، اور انھوں نے بڑی بے کلی کے ساتھ پوچھا :

"اسے کیا ہوا میری بچّی کو ؟"

استاد کی اس جذباتیت سے سگّن بہت متاثر ہوئی ۔

اس نے کہا :

"خدا نخواستہ اسے کچھ ہوتا ، کیوں اچھی بھلی ہے !"

وہ آگ بگولہ ہو کر بولے :

"سبحان اللہ ، لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور اردو بھی بولنا اب تک نہیں آئی ۔ ارشاد فرمایا ——— "چل کر ایک نظر دیکھ لیجئے !" یہ بھی نہیں معلوم کہ خدا نخواستہ یہ لفظ کس موقع پر بولا جاتا ہے ، خیر ، ———

لیکن سگّن کا اصرار قائم رہا :

"آپ کو میری قسم چلیے تو سہی ذرا دیر کے لیے !"

آخر استاد کو اس کے ساتھ جانا پڑا ———

راستے میں سگّن نے کہا :

"خدا نظرِ بد سے بچائے ، بالکل شہزادی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی سج دھج اور پھبن دیکھنے کے قابل ہے !"

استاد نے اکڑ کر کہا :

اس انہماک کے ساتھ جیسے اکلوتی بیٹی کی شادی کر رہے ہوں۔ وہ انتظام و انصرام میں مصروف تھے۔ دو مرتبہ شربت کا دور چل چکا تھا۔ اب کھانے کا وقت آ گیا تھا۔ سگن بھی، ساری حویلی کا چکر لگا رہی تھی اور براہ راست تمام انتظامات کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ لپکتے لپکتے وہ استاد کے پاس گئی اور کہنے لگی :

"اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے، کھانا ختم ہو تو اصل پروگرام شروع ہو!"

بے پروائی کے ساتھ استاد نے جواب دیا :

"معلوم ہے ہمیں بھی!"

اس نے پوچھا :

"تو مہمانوں کو کب کھانا ملے گا؟"

وہ جل کر بولے :

"دیکھ تو رہی ہو، لگوا رہا ہوں، کیا خود مرغ مسلم بن کر دستر خوان پر بیٹھ جاؤں ــــــ ابھی پندرہ منٹ کی دیر ہے!"

سگن کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ خاموشی کے ساتھ کھسک جائے۔ وہ سیدھی امراؤ کے کمرے میں پہنچی اور اس کی سج دھج دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ وہاں سے ایک مرتبہ پھر استاد نیتھے خاں کے پاس آئی اور کہنے لگی :

"استاد، استاد!"

وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولے :

"فرمائیے، فرمائیے، کوئی نیا حکم، کوئی نیا اعتراض؟"

سگن نے بڑے نرم لہجہ میں کہا :

"آپ تو ہوا سے لڑتے ہیں، میں تو ایک دوسری بات کہنے آئی تھی!"

وہ اپنے اہتمام و انصرام کی مصروفیت برقرار رکھتے ہوئے گویا ہوئے :

"شاہزادیاں بھی اس کے سامنے پانی بھرتی ہیں، اللہ نے اسے جو حُسن دیا ہے وہ چیز ہی کچھ اور ہے۔"

اتنے میں امراؤ کا کمرہ آگیا۔ استاد کو دیکھ کر امراؤ نے نظریں نیچی کیے کیے، بڑے ادب کے ساتھ ماتھے تک ہاتھ لے جاکر آداب کہا۔ استاد نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور کہا:

"جیو بیٹی، دنیا کی بہاریں دیکھو، خدا تمھارا سورج ہمیشہ چمکتا رکھے!"

نازو کے منھ سے بے ساختہ نکلا:

"آمین!"

اس کے اس آمین میں شرارت نہیں تھی، خلوص تھا، جسے استاد نے بھی محسوس کرلیا اور سگّن نے بھی۔ پھر دونوں باہر آئے۔ کھانا دستر خوان پر لگ چکا تھا۔

لکھنؤ کے بہترین باورچیوں کے خدمات حاصل کیے گئے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنا سارا ہنر صرف کر دیا تھا۔ طرح طرح کے کھانوں کا دستر خوان پر ڈھیر لگا تھا، لیکن کسی ایک کو کسی دوسرے پر ترجیح دینا مشکل تھا۔

کوئی ۹ بجے رات کو دستر خوان بڑھایا اور مہمان پھر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ سگّن حاضرین کے سامنے آئی، آداب اور تسلیمات بجالائی، پھر اس نے کہا:

"میری ایک ہی بچّی ہے امراؤ، اب ماشاء اللہ وہ سیانی ہوچکی ہے، اور ناچنے گانے کا فن بھی اس نے بہُت اچھی طرح حاصل کرلیا ہے۔ مَیں نے آپ لوگوں کو، جس میں سے اکثر میرے پُرانے قدر دان ہیں، اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ بھی میری بچّی کو دیکھ لیں اور جو کچھ ناچنا گانا سیکھا ہے اس سے محظوظ ہولیں۔"

ہر طرف سے آوازیں آئیں اور شور بلند ہُوا:

"ضرور، ضرور!"

سگن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

"اگر میری بچی، اپنے فن میں یکتا نظر آئے تو یہ استاد ننھّے خاں کا کمال ہے، اور اگر اس میں کوئی کمی نظر آئے تو یہ میرا قصور ہے۔"

استاد ننھّے خاں اپنی سفید مونچھوں پر تاؤ دیئے جا رہے تھے، اور سگن کی تقریر سنتے جا رہے تھے۔

سگن جب تقریر کر چکی تو اس نے استاد کو اشارہ کیا، وہ اس کے ساتھ ہو لیے۔ دونوں امراؤ کے کمرے میں گئے، اور اعلان کیا :

"اسٹیج، تیار ہو چکا ہے۔ حاضرین سراپا انتظار ہیں، لڑکیو ——— امراؤ کو لے کر چلو۔

امراؤ، ——— نیلم، زمرد، پکھراج اور نازو وغیرہ کے جلو میں اسٹیج کی طرف روانہ ہوئی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا!

آج تک اس نے کسی ایک مرد کے سامنے بھی، ناچ اور گانے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، آج اسے بہت سے آدمیوں کے سامنے یہ مظاہرہ کرنا تھا۔

اس کا دل دھڑک رہا تھا، پاؤں کانپ رہے تھے، سارا جسم لرز رہا تھا، وہ دل میں سوچ رہی تھی۔

"اگر اس مظاہرے میں وہ ناکام ہو گئی، تو استاد ننھّے خاں کو کتنا افسوس ہوگا اور اماں کو کیسا غم ہوگا اور اگر وہ کامیاب ہو گئی ——— تو دونوں کتنے خوش ہوں گے!"

بے ساختہ اس کے دل سے دعا نکلی :

"یا اللہ ——— میری لاج رکھ لینا، میرا فن دیکھ کر سب عش عش کر

لکھنؤ جیسے شہر میں رقاصاؤں کی کیا کمی، لیکن، امراؤ کے رقص میں بات ہی کچھ اور تھی، اس کے پاؤں کا ہر دھماکہ دل پر گھونسہ بن کر لگتا تھا۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک یہ سلسلہ بھی جاری رہا — پھر جب سلام کر کے شورِ تحسین میں وہ شرماتی ہوئی، اسٹیج سے اتر کر بھاگی ہے، تو اس ادا نے اور نہ جانے کتنے دِلوں کو پامال کر دیا۔

تقریب کے اختتام کے بعد، مردوں اور عورتوں نے بہت پُر جوش مبارک باد، استاد نتھے خاں، اور رگّن کو دی، اور اس کی خوشگوار یاد لے کر، آہ سرد بھرتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے!

◎

اٹھیں، کوئی اس میں خامی نہ نکال سکے ——— "

یہی سوچتی ہوئی، وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں اسٹیج تک آئی۔

یہاں سہیلیوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا!

اور وہ اکیلی رہ گئی ———

اس کا جی چاہا زور زور سے رونے لگے، اور بھاگ جائے، مگر ماں کی صورت پر نظر پڑی، اس صورت پر امید و بیم کی کیفیت طاری تھی۔ اس منظر نے اس میں حوصلہ پیدا کر دیا، ساری گھبراہٹ دُور ہوگئی!

اس نے اپنے دل میں کہا:

" یہ لوگ میرے جیسے آدمی ہی ہیں، کوئی شیر تو نہیں ہیں جو مجھے کھا جائیں گے، ان سے ڈروں کیوں؟ ——— نہیں میں نہایت اطمینان سے اپنے فن کا مظاہرہ کروں گی، اپنے استاد کو ہرگز رسوا نہیں ہونے دُوں گی۔ اپنی ماں کو کسی قیمت پر شرمندہ نہیں ہونے دوں گی!"

وہ آئی، ———

اس کا حسن بے مثال دیکھ کر سب پر رعب طاری ہوگیا، بے شک سگن اپنے زمانے میں بہت کچھ تھی، اس کی لڑکی کے بارے میں بھی عام خیال یہی تھا کہ خوب صورت ہوگی، لیکن قتالۂ عالم ہوگی یہ کسی نے نہیں سوچا تھا۔

اس نے بڑے ادب سے حاضرین کو آداب کیا اور اس کے بعد نغمہ سرائی شروع کر دی، کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک وہ "پکا" اور "کچا" گانا سناتی رہی، حاضرین کا یہ عالم تھا، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ——— یہ عمر، اور یہ فن کا کمال، ایک ناممکن سی بات تھی جو اس وقت ممکن ہوگئی تھی۔

نغمہ سرائی کے بعد، امراؤ نے رقص شروع کیا۔

تک کوئی وزیر یا شہزادہ اس کے قدموں پر سر جھکانے کیوں نہیں آیا؟ —— کب آئیگا؟
پھر اس کی نظر اپنے گورے گورے قدموں پر جاکر رک جاتی اور وہ ایسا محسوس کرنے لگتی،
جیسے یہ قدم واقعی اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ان پر سر رکھتے جائیں —— بڑے
بڑے لوگوں کے، ——

مشق اور ریاض کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، وہ اپنے فن میں اور زیادہ کمال حاصل کرلینا
چاہتی تھی، لیکن سر جھکانے والا اب تک کوئی نہیں آیا تھا۔

پہلے استاد ننھّے خاں کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑا کرتی تھی!

لیکن اب ایسی بات نہیں تھی!

یہ کچھ اس کے پاس تھا، سب انھی کا دیا ہُوا تھا اور یہ جو کچھ انھوں نے دیا تھا، مال و زر
کے لالچ میں نہیں دیا تھا، دلی محبت اور خلوص سے دیا تھا۔

لہٰذا اب وہ استاد ننھّے خاں کا بہت ادب کرنے لگی تھی۔ ان کی کوئی بات نہیں ٹالتی
تھی، وہ خود بھی یہ بات محسوس کرنے لگے تھے اور دل ہی دل میں اپنی بیٹی کی اس سعادت مندی
پر بہت خوش تھے —— آخر انھیں بے لوث محبت تھی نا اس لڑکی سے؟

◎

(۶)

امراؤ کی کامیابی نے، سارے شہر میں تھلکہ مچادیا۔ اس کے حُسن وجمال کا چرچا کوچہ و بازار میں ہونے لگا۔ اس کی نغمہ سرائی کی تعریف میں ہر پیر و جواں رطب اللسان تھا، اور اس کے رقصِ بے مثال کو تو لوگ زندہ جادو سے تعبیر کرتے تھے۔

چند روز پہلے جو لڑکی، اپنے بالا خانے کی دنیا میں ایک گم نام مکین کی طرح زندگی بسر کر رہی تھی۔ اب وہی تھی جس کا ڈھنڈورا سارے شہر میں پٹ رہا تھا، رؤسا اور امراء کے طبقے میں تو کئی لوگ تھے جو اس کی ایک نگاہِ ناز پر جان دے دینے کو تیار تھے۔

خود امراؤ نے بھی، اپنے اس جادو سحر کو محسوس کر لیا تھا، گانے اور ناچنے کے دوران میں اس کی نگاہ کئی نوابوں اور رئیسوں سے لڑی، اور اس نے محسوس کر لیا کہ ان نگاہوں میں حرص و ہوس کی چنگاریاں چاہے جتنی فروزاں ہوں، لیکن تحسین و تعریف، بلکہ مرعوبیت کے اثرات بھی موجود تھے۔

خود پسند تو ہمیشہ سے تھی، اس کی کامیابی نے اس کا دماغ اور زیادہ عرشِ معلّٰی پر پہنچا دیا۔ اب وہ اور زیادہ کسی کو خاطر میں نہ لاتی، اس کی آن، شان، بے پروائی، اور استغناء میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

البتہ ایک بات کا اسے شدت کے ساتھ انتظار تھا!

مظاہرۂ فن کو، دو دن گزر چکے تھے، یہ مُدت کچھ ایسی کم بھی نہیں ہوتی۔ آخر اب

"اچھا بٹیا، اچھا بٹیا!"
پھر کہنے لگے :
"مَیں اس لیے آیا تھا کہ وہ اس دن جو ایک نئی دُھن تجھے سکھائی تھی، ——— یاد کر لی ——؟"
وہ مسکراتی ہوئی بولی :
"آپ تو مشکل سے مشکل چیز میرے لیے پانی کر دیتے ہیں۔ واقعی بڑی مشکل دُھن ہے لیکن آپ نے اس طرح سکھایا کہ ازبر ہوگئی!"
فخر سے استاد پھُول گئے!
کہنے لگے :
"اتنی مشکل ہے بیٹی کہ بعض دفعہ تو مَیں خود بہک جاتا ہوں، اور مَیں کیا بڑے بڑے استادوں اور کلاونتوں کو بہکتے دیکھا ہے!"
امراؤ نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا :
"لیکن آپ کی سکھائی ہوئی چیز، میرے دل میں تو اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ پھر نہ بھولنے کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ بہکنے کا!"
استاد ننھّے خاں بہت خوش ہوئے ——————— جی چاہا، آنکھوں میں بٹھا لیں اپنی اس بچّی کو، ———
پھر کہنے لگے :
"تو بیٹی ایک دفعہ سُنا دو پھر، تاکہ دل مطمئن ہو جائے!"
بڑی آمادگی اور مستعدی کے ساتھ اس نے کہا :
"ابھی لیجیے!"
پھر استاد سازے کر بیٹھے، اور امراؤ نے اس تازہ سیکھی ہوئی دھن میں گانا

(۷)

افیم کی گولی کو بٹیر کی طرح انگلیوں میں دبائے، اور رنگ سک سے درست کرتے ہوئے استاد نھتے خاں، امراؤ کے کمرے میں آئے ——— وہ اس وقت قدِآدم آئینے کے سامنے کھڑی، اپنے حسنِ غارت گر کا مشاہدہ کر کر کے خود ہی خود شرما بھی رہی تھی اور خوش بھی ہو رہی تھی۔

انھوں نے آواز دی:

"امراؤ بیٹی!"

وہ جلدی سے آئینے کے سامنے سے ہٹی، دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھا، اور معصوم صورت بنائے استاد کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی:

استاد اسے دیکھ کر پھول کی طرح کھل گئے ———

کہنے لگے:

"کیا کر رہی تھی میری بچّی؟"

اس نے دروازے کے سامنے سے ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا:

"وہاں دھوپ میں کیوں کھڑے ہیں اندر آ جائیے!"

وہ اندر آ گئے!

(۸)

آج زمرد اور نازو، امراؤ کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ تینوں سہیلیوں میں بے حد بے تکلفی اور سچی دوستی تھی۔ جب چاہتیں آجاتیں۔ کبھی کبھی امراؤ بھی ان کے ہاں چلی جاتی۔ زمرد نے نازو سے کہا :

"بھئی اس بالشت بھر کی چھوکری نے تو اس دن کمال کر دیا تھا۔"

نازو ہنستی ہوئی بولی :

"کیا کہوں، اتنے زور سے دانتوں تلے میں نے انگلیاں دابیں کہ خون نکل آیا، اب تک درد ہو رہا ہے!"

امراؤ نے دونوں کے ایک ہلکی سی چٹکی لیتے ہوئے کہا :

"اچھا اب میرے سامنے تو مجھے بناؤ نہیں، خوب سمجھتی ہوں!"

دونوں نے سنجیدگی سے کہا :

"قسم لے لو، یہ ہمارے دل کی آواز ہے ——————— اس دن تمھارا روپ، تمھارا ناچ، اور تمھارا گانا، سب کو مدہوش بنائے ہوئے تھا، لیکن ہماری نگاہیں چک پھیریاں کر رہی تھیں اور سب جائزہ لے رہی تھیں۔

امراؤ دلچسپی سے یہ باتیں سنتی رہی! ———

پھر اس نے پوچھا :

"کیا معلوم کیا تم نے؟"

شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انھوں نے ساز ایک طرف رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے، اور کہنے لگے :

ماشاء اللہ، ماشاء اللہ، اب میرے کان بھی کترنے لگی ہے تُو، واقعی خوب گایا، اور دُھن کا حق ادا کر دیا۔ جاتا ہُوں شگن سے مٹھائی کھاؤں گا۔"

وہ بولی :

"ان سے تو کھا یئے گا جتنی جی چاہے، لیکن آج مجھ سے بھی کھا لیجیے۔ رات گلاب جامن کا بڑا جی چاہ رہا تھا، تھوڑی آپ کے لیے بھی رکھ لی ہیں، مَیں نے سوچا مٹھائی کا بہُت شوق ہے آپ کو!"

◎

بہت اچھی طرح جانتی ہوں، اماں کے علاوہ بس تم دونوں ہو، جو میری خوشی پر خوش ہوتی ہو اور میرے رنج پر غمگین ہوتی ہو ——— لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی !"

نازو نے پوچھا :

" وہ کیا ؟ "

امراؤ نے کہا :

" آخر میں نے کیا بگاڑا ہے ان دونوں کا ؟ ——— اگر میں نے فن سیکھ لیا ہے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے، خدا نے سب کو عقل دی ہے، ذہن دیا ہے، جو جی چاہے سیکھ لے، اور مجھے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے !"

نازو کہنے لگی : " ناممکن !"

زمرد نے کہا :

" میں نے یہ بات اماں جی سے بھی کہی تھی، مگر انھوں نے تو ایک بڑی عجیب بات بتائی !"

امراؤ نے سراپا گوش ہو کر سوال کیا :

" کیا بتایا خالہ نے ؟"

" وہ کہنے لگیں، جوانی میں مشتری ہماری خالہ (سگن) کی بڑی دشمن تھی، اور ایک مرتبہ اس نے زک بھی انھیں پہنچائی تھی، یہ دوسری بات ہے کہ کچھ عرصے کے بعد منھ کی کھائی !"

حیرت کی کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے امراؤ نے سوال کیا :

" واقعی ——— ؟"

" ہاں بھئی ہاں !"

" لیکن اماں نے مجھ سے تو کبھی ذکر نہیں کیا !"

نازو بولی :

" بھائی چاہے بھلا لگے، یا بُرا، لیکن کہوں گی ایمان کی۔ سب سے بُرا حال مشتری کا اور ان کی صاحبزادی کا تھا، تمھاری ہر تان پر معلوم ہوتا تھا، ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی، اور تمھارے ناچ کی ہر دھمک پر ایسا معلوم ہوتا تھا، بجلی بن کر گر رہی ہے ان پر!"

زمرّد نے تصدیق کی :

" ہاں نازو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے، بالکل یہی رائے میں نے بھی قائم کی ہے ـــــــــ یُوں تو ہمارے طبقہ میں جو عورت بھی تھی آہ سرد بھر رہی تھی کہ کاش میری لڑکی بھی ایسی ہوتی، لیکن مشتری اور ان کی صاحبزادی کا چہرہ تو اتنا اُترا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے ان بے چاریوں پر!"

نازو نے کہا :

" میرا خیال ہے، اپنے گھر جا کر دونوں ماں بیٹی خوب ایک دوسرے کے گلے لگ لگ کر روتی ہوں گی!"

امراؤ ہنسنے لگی،

" ہٹو بھی ایسا بھی کیا اندھیر ہو سکتا ہے!"

زمرّد نے کہا :

" ہمیں جھوٹا سمجھتی ہو!"

نازو بولی :

" ہماری توہین کی ہے تم نے!"

امراؤ نے دست بستہ معافی مانگتے ہوئے کہا :

" بھلا ایسا غضب بھی ہو سکتا ہے کہیں؟ تم دونوں سے بڑھ کر میرا پیارا کون ہے؟

اس جشن کو تقریباً ایک ہفتہ گزر چکا تھا جو امراؤ کے سلسلے میں سگن نے کیا تھا اور جس کی یاد شہر بھر، اور خاص طور پر امرا و رؤسا کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی، لیکن ابھی تک کسی شکار نے اس طرف رُخ نہیں کیا تھا۔

سگن اسی فکر میں بیٹھی تھی کہ استاد نتھّے خاں آئے اور آتے ہی کہنے لگے :

" اجی سُنتی ہو ! "

وہ اپنی مشغولیّت قائم رکھتی ہوئی کہنے لگی :

" کہو استاد کیا بات ہے ؟ "

" تم نے نواب ضرغام الدولہ کا نام سنا ہے ؟ "

" ہاں سنا ہے، لیکن وہ تو بے چارے مر گئے، دو سال ہُوئے ! "

" ہاں، لیکن ان کا بیٹا نواب صمصام الدولہ تو زندہ ہے۔ "

" اچھا تو پھر ! "

" کیسا ہے یہ خاندان ؟ "

" کیا کہنا، شریف ابن شریف۔ نجیب ابن نجیب، دولت کی کوئی تھاہ نہیں، جاگیر، اور جائیداد بے حساب، اس خاندان کو کون نہیں جانتا ؟ "

" ٹھیک " ———

" لیکن اس وقت ضرغام الدولہ اور صمصام الدولہ کیوں یاد آ گئے تمھیں ؟ "

"ہاں بھئی بڑی دوستی ہے ناتم دونوں سہیلیوں میں۔ واقعی سہیلی کو سہیلی سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیئے، بہرحال تم اپنی سہیلی (سگن) سے پوچھنا اتنی اہم خبر کیوں چھپائی تم سے؟"

امراؤ نے ہنستے ہوئے کہا:

"کچھ کھانے کا جی چاہ رہا ہے تمھارا؟"

نازو بول پڑی:

"کھانے کا جی تو ہمارا بھی چاہ رہا ہے! —— کیا کھلاؤگی؟ کوئی خاص چیز پکی ہے؟"

امراؤ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"ہاں بڑی خاص چیز —————— جوتے!"

نازو کھلکھلا کر ہنس پڑی: "اب تمھارے ہاں جوتے پکنے لگے ہیں اور مہمانوں کی ان سے تواضع کی جانے لگی ہے؟ —— جاتی ہوں خالہ (سگن) سے پوچھتی ہوں!"

یہ کہہ کر نازو اٹھی، امراؤ نے اس کا دامن پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا اور کہا:

"خبردار جو قدم باہر نکالا، اس کمرے سے!"

پھر اس نے اصغری کو آواز دے کر کھانا منگایا اور تینوں سہیلیاں کھانا کھانے لگیں بیچ بیچ میں باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ زمرّد، اور نازو، مشتری کو وہ وہ صلواتیں سنا رہی تھیں کہ بس اللہ دے اور بندہ لے!"

◎

"استاد ویسے تو معدے کی بڑی شکائتیں کیا کرتے ہو۔ یہ ثقیل مٹھائیاں اور حلوے کس طرح ہضم کر لو گے؟"

وہ پان کا بیڑہ منھ میں رکھتے ہوئے بولے:

"فکر نہ کرو ——— بہترین قسم کی چورن بھی ہر وقت اپنے پاس رکھتا ہوں۔ دیکھ لینا ابھی چند منٹ میں، سب ہضم ہُوا جاتا ہے!"

سگن جل کر بولی:

"تو اور منگوا دُوں کچھ؟"

انھوں نے ایک بڑی سی ڈکار لی، اور فرمایا:

"اصغری خفا ہو جائے گی، ابھی تو نشست رہے گی، جب جانے لگوں تب!"

◎

" ننھے خاں کے منھ سے کوئی بات بے وجہ نہیں نکلتی !"

" بات تو معلوم ہوگئی، لیکن وجہ نہیں معلوم ہوئی !"

" وہ بھی معلوم ہو جائے گی، پہلے مٹھائی کھلاؤ !"

" بھاڑ میں جائے تمھاری مٹھائی، اس نے تو ناک میں دم کر دیا ہے، ایسا بھی کوئی رسیا نہ ہو کسی چیز کا، بہت جی چاہ رہا ہے تو جاؤ امراؤ سے کہو، جو کچھ ہوگا پیش کر دے گی، تمھارے سامنے !"

" ابھی ہم تو تمھارے ہاتھ سے کھائیں گے، سمجھتی کیا ہو ؟"

سگن نے اصغری کو آواز دی۔ وہ آئی تو اس سے کہا :

" گھر میں جتنی میٹھی چیزیں، مٹھائی، حلوے، شکر، گڑ، راب سمیت موجود ہوں۔ سب لاکر استاد کے سامنے ڈھیر کر دے !"

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی !

اور ذرا دیر میں ایک خوان کے اندر کئی طشتریوں میں طرح طرح کی مٹھائیاں، اور حلوے لے کر آئی۔ اور استاد کے سامنے رکھ دیا، یہ ترمال دیکھ کر استاد کی باچھیں کھل گئیں، کہنے لگے :

" غضب خدا کا، یہ خزانۂ غیب چھپائے بیٹھی تھیں ؟"

سگن مسکرانے لگی، اس نے کہا :

" باتوں میں وقت نہ ضائع کرو، پہلے پیٹ پوجا کر لو، پھر باتیں کر لینا !"

استاد خود یہی چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے جواب بھی نہیں دیا اس بات کا، اور نہایت اطمینان سے خوان اپنے سامنے سرکایا اور جو کچھ اصغری لائی تھی، سب صاف کر دیا ———— !

سگن یہ خوش خوری دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس نے کہا :

"کیوں بلایا تھا نواب صاحب نے تمھیں ؟"

استاد نے بڑی روانی سے جواب دیا :

"ظاہر ہے کیوں بلایا تھا ؟"

"یعنی ــــــ"

"ہاں ــــــ"

"کیا چاہتے ہیں وہ ؟"

"وہ اس دن جشن میں شریک ہوئے تھے !"

"ہاں میں نے دیکھا تھا !"

"بس تو ہماری امراؤ کا روپ دیکھ کر دل دے بیٹھے۔ اس کا گانا سُن کر اور ناچ دیکھ کر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے۔"

"پھر آگے ــــــ ؟"

"وہ چاہتے ہیں کہ امراؤ کی نتھ اتاریں۔ اسے اپنا پابند کر لیں، پانچ ہزار ماہوار دیں گے، بارہ گاؤں اس کے نام لکھ دیں گے۔ ایک بڑی سی حویلی بھی اس کے نام کر دیں گے۔ یہ پانچ ہزار تو پاندان کا خرچ ہوگا۔ حویلی کے جملہ مصارف انھی کے ذمّے ہونگے زیور جتنا کہو، اور ملبوساتِ فاخرہ حسبِ طلب !"

سگّن کی باچھیں کھل گئیں یہ پیش کش سُن کر !

جب سے اس پر بڑھاپا طاری ہوا تھا، کسی نے اس گھر کا رُخ نہیں کیا تھا۔ اب تک جو اندوختہ تھا ــــــ اور بہت تھا ــــــ اسی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ اب یہ پہلا موقع ملا تھا کہ ساری کسر آناً فاناً نکل جائے، وہ بولی :

"دو لاکھ روپیہ نقد بھی انھیں ادا کرنا ہوگا۔"

استاد نے، جیسے خود ہی نواب صمصام الدولہ ہوں، کہا :

(۱۰)

استاد نتھّے خاں نے پہلو بدلا، اور گویا ہوئے :

" اب تو سُن لو اصل بات !"

سگّن نے ریجھتے ہوئے کہا :

" تو کیا میں نے روک رکھا تھا ؟ تمھی کو مٹھائی کھانے کی سوجھی تھی !"

استاد اس وقت موڈ میں تھے، فرمانے لگے :

" بھئی بار بار اس چیز کا نام نہ لو، رال ٹپکنے لگتی ہے منھ سے !"

سگّن ہنس پڑی، کہنے لگی :

" استاد خدا تم سے پناہ میں رکھے، کسی پہلو قرار نہیں، نہ یوں مانتے ہو، نہ یوں!

ـــــــ اچھا اب نام نہیں لیتی کسی چیز کا، اپنی بات شروع کرو !"

بڑے اطمینان سے نشست بدلتے ہوئے استاد نے کہا :

" کل نواب صمصام الدولہ نے مجھے بلوایا تھا !"

یہ سُن کر سگّن کی نبض تیز ہوگئی اور دل خوشی کے مارے بلّیوں میں اُچھلنے لگا - اس نے سوچا، اب میری بچّی کا ستارۂ اقبال چمکا ہے، نواب صاحب اگر جال میں پھنس جائیں، تو وارے نیارے ہیں، شہر کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہوتا ہے، اور آدمی تماشبین ضرور ہیں، لیکن ہیں بہرحال شریف، اس کے چہرے پر مسرت کی سُرخی جھلکنے لگی، اس نے پوچھا :

اشرفیاں سمیٹتے ہوئے سگّن نے استاد ننھّے خاں سے کہا :

" اس کا مطلب یہ ہے کہ واقعی نواب صاحب ہزار جان سے میری بچّی پر فریفتہ ہیں؟ "

بڑے فخر اور بڑے پندار کے ساتھ استاد نے جواب دیا :

" ماشاء اللہ وہ ہے اسی قابل جو دیکھے گا کلمہ پڑھے گا اس کا ! "

" کل کس وقت آئیں گے ؟ "

" مغرب کے بعد ——— وہی وقت مناسب ہے ! "

" مجھے کیا کیا انتظامات کرنے چاہییں ؟ "

" انتظامات کیسے ؟ ——— کھانا کھا کر آئیں گے ، بس کچھ یُوں ہی کھلا پلا دینا ، شربت ، حلوا ، مٹھائی وغیرہ ، ان کا اصل مقصد ، تو ذرا امراؤ سے واقفیت پیدا کرنا ، اور اسے قریب سے دیکھنا ہے ! "

" ٹھیک ہے ، لے آنا ——— لیکن لانے سے پہلے دو لاکھ کا معاملہ طے کر لینا ! "

" ابھی دو لاکھ کیا ، تین لاکھ انشاء اللہ طے کر کے آؤں گا ، بے فکر رہو ——— اب ایک کام تمھیں اور کرنا ہے ! "

" وہ کیا ؟ "

" ذرا امراؤ کو بھی آج کسی وقت سب باتیں اچھی طرح سمجھا دو ، اور اسے بتا دو کہ

" چلو یہ بھی سہی ـــــ اور کچھ ؟ "

اس کے بعد کچھ کہنا بے کار تھا ، کہنے لگی :

" بس اتنا ٹھیک ہے ! "

استاد نے فرمایا :

" دو لاکھ کا ذکر میں آج کر دُوں گا ، اور مجھے یقین ہے ، قطعاً مان لیں گے ، وہ چاہتے ہیں کہ قبل اس کے کہ امراؤ کو اپنا پابند بنائیں ، ایک مرتبہ گھر پہ آ کر اس سے باتیں کریں ، اس کا گانا سُنیں ، اس کا ناچ دیکھیں ، اس موقع پر بھی وہ ۲۵ ہزار نذر کرنے کو تیار ہیں ـــــــ یہ لو ! "

سگّن نے دیکھا ، ۲۵ ہزار کی اشرفیاں سامنے جھلملا رہی تھیں !

سگن نے استاد کو بتایا :

"ہمارے ہاں تو ہمیشہ سے یہی ریت چلی آ رہی ہے !——— خود میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہُوا تھا !"

"اور خوب گزری تھی !"

"جانتے تو ہو !"

"بس تو پھر میں اب سیدھا وہیں جاتا ہُوں ——— دو لاکھ کا مُعاملہ طے کر لُوں !"

"سدھارو ، خدا تمھیں کامیاب لائے !"

◎

اتنے بڑے آدمی سے بہت ادب اور سلیقہ سے پیش آئے اور یہ بھی بتادو کہ کس رقم پر اور کن شرائط پر نواب صاحب اسے اپنا پابند بنا کر رکھنا چاہتے ہیں ؟"

سگن نے شوخ نظروں سے استاد کو دیکھا، اور بولی :

" ویسے کے ویسے ہی رہے !"

" یعنی بے وقوف کا بے وقوف ؟"

" اور کیا ؟"

" کیا حماقت سرزد ہوئی اس ذرۂ بے مقدار سے ؟"

" امراؤ کو پٹی پڑھانے کی کیا ضرورت ہے ؟ ــــــــــ ماشاء اللہ سمجھدار لڑکی ہے نواب صاحب کو یہاں دیکھ کر، ان کا برتاؤ دیکھ کر، ہمارا اُن سے سلوک دیکھ کر خود بخود سب کچھ سمجھ جائے گی، پہلے سے بتا کر، اس کے دل میں ایک اندیشہ، ایک ڈر پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟"

" اندیشہ ؟ ڈر ؟ یہ کیا کہا تم نے ؟"

" ہاں بھئی غلط نہیں کہا، لڑکی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ کسی مرد کے پلّو سے باندھی جارہی ہے، تو ایک انجانا سا خوف محسوس کرنے لگتی ہے کہ نہ جانے یہ نئی زندگی کیسی گزرے ؟ نہ جانے یہ آدمی کیسا ہو ؟ لیکن ان باتوں سے باخبر کیے بغیر جب وہ ایسے مرد کے سامنے آجاتی ہے اور وہ اس سے اپنانے والی باتیں کرتا ہے، اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہے، اس کی خاطر تواضع کرتا ہے، اسے تحائف پیش کرتا ہے، اس سے اُنس اور الفت کا اظہار کرتا ہے، تو وہ انجانا سا ڈر نکل جاتا ہے۔ وہ گھل مل جاتی ہے۔ مانوس ہوجاتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو تیار ہوجاتی ہے !"

استاد نے بڑے تاثر کے عالم میں جواب دیا :

" خوب کہا بھئی۔ واقعی یہی بات ہے، میری تسلی ہوگئی بالکل !"

"جی وہ لڑکی کی ماں، ایک مطالبہ اور کر رہی ہے ——— اور وُہ کچھ ناجائز بھی نہیں ہے!"

نواب صاحب مسکرائے، پھر کہنے لگے :

"آپ وہ مطالبہ بتائیے ——— جائز ہو یا ناجائز ——— ہم منظور کر لیں گے!"

استاد دعائیں دینے لگے :

"کیا کہنا ہے حضور کی دریا دلی اور سخاوت کا۔"

نواب صاحب نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا :

"جی ——— تو امراؤ کی ماں کا کیا مطالبہ ہے؟"

"سرکار، وہ کہتی ہیں کہ آپ کی طرف سے زیورات جواہر نگار، اور ملبوسات فاخرہ کے علاوہ دو لاکھ زرِ نقد بھی پیش ہونا چاہیئے!"

نواب صاحب نے ایک نہایت زور دار قہقہہ لگایا، اور فرمایا :

"تین لاکھ ——— آپ کو اندازہ نہیں ہے، امراؤ کو حاصل کرنے کے لیے میں سب کچھ قربان کر سکتا ہوں ——— حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی!"

استاد نے بڑے عارفانہ لہجے میں کہا :

"جی۔ بے شک، بے شک، ——— مگر ایسا نگ، جیسی امراؤ ہے، لکھنؤ کیا غیر ملکوں میں بھی نہیں مل سکتا!"

"خیر اس کی تعریف نہ کیجیے ——— آپ، بے شک اُس کے اُستاد ہیں، اور اس کی تعلیم و تربیت آپ ہی کے ہاتھوں ہُوئی ہے، لیکن مجھ سے زیادہ آپ نہیں جانتے اُسے!"

(۱۲)

استاد نیتھے خاں سیدھے نواب صمصام الدولہ کی محل نما حویلی میں پہنچے، اور ہاتھوں ہاتھ لیے گئے، ڈیوڑھی کے لوگ سمجھ گئے تھے، استاد کی حیثیت کیا ہے، اور اُن کا آنا جانا کس سلسلے میں ہو رہا ہے، چنانچہ انھیں فوراً نواب صاحب کی کوشک میں پہنچا دیا گیا وہ اس وقت اپنے ایک مصاحب خاص کے ساتھ بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ تین چار اور مصاحب بیٹھے دیکھ رہے تھے اور نواب صاحب کی چال چلنے میں رہنمائی کر رہے تھے ——!

استاد کو دیکھتے ہی نواب صاحب نے بساط الٹ دی:

"اچھا بھئی بس، اب ذرا ہم مصروف ہیں!"

یہ ارشاد سُنتے ہی سب مصاحب کبوتروں کی طرح اُڑ گئے۔

نواب صاحب نے کہا:

"آیئے استاد، —— فرمایئے کیسے قدم رنجہ فرمایا۔"

استاد نے سراپا ادب بن کر جواب دیا:

"سرکار، ایک بات عرض کرنی تھی!"

نواب صاحب نے بڑی سیر چشمی کے ساتھ فرمایا:

"ضرور، ضرور، ارشاد؟"

" استاد نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:

"ہاں ہاں، ــــــــــ میں نے تو ایک بات کہہ دی ہے!"

"بہت خوب سرکار! ــــــــــــــــ اچھا، اب غلام کو اجازت ہے؟"

"ہاں، اب آپ جا سکتے ہیں!"

جاتے وقت نواب صاحب نے، استاد کو پانچ ہزار عطا کیے، پانچ ہزار کل عطا کیے تھے، وہ تو دورہ میں کھا گئے!"

◎

اس عجیب و غریب فقرے پر استاد کو حیرت تو بہت ہوئی، مگر تائید کے سوا کیا کر سکتے تھے، کہنے لگے :

" بے شک، بے شک !"

نواب صاحب نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا :

" آپ امراؤ کی والدۂ محترمہ سے کہہ دیجیے، مَیں تین لاکھ پیش کروں گا، اور ادھار کا قائل نہیں ——"

" جی، ادھار ؟"

" جی ہاں، یعنی وعدے وعید کا قائل نہیں ———— کل جب آؤں گا، تو اپنے ساتھ تین لاکھ زرِ نقد، زیورات زرنگار بھی لیتا آؤں گا ——— ملبوساتِ فاخرہ، تقریب کے دن ——— یہ زیور اور زرِ نقد بہ مدِّ پیشگی دے دوں گا اس کے بعد، بس تاریخ کا تعین باقی رہ جائے گا ———— ویسے میرے نزدیک تو اس کی بھی ضرورت نہیں تھی، لیکن اس پیشے کی خواتین کا یہ دستور ہے کہ ایسے موقع پر اپنی برادری کو ضرور مدعو کرتی ہیں، اور نہایت شاندار طور پہ یہ رسم انجام دیتی ہیں۔ اسلیے مجبوراً تاریخ مقرر کرانا پڑے گی !"

" جی ہاں وہ ہوجائے گی !"

" لیکن وہ کوئی قریبی تاریخ ہونی چاہیئے۔"

" بس زیادہ سے زیادہ دس پندرہ روز کے اندر !"

" مجبوراً دس پندرہ روز سہی ———— ورنہ کوشش یہ کیجیے کہ ایک ہفتے میں ہوجائے !"

" بہت خوب سرکار !" ———— لیکن اس کا فیصلہ لڑکی کی ماں ہی کر سکتی ہے حالات کا اندازہ کر کے !"

"یہ لو، اب مَیں جھوٹ بھی بولنے لگا، ـــــــ ارے بھئی بہت ہیں، اور ایسے تاب دار ہیں کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی ظالموں پر!"

"اندازاً کتنے کے ہوں گے؟"

"میرا خیال ہے ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں ہوں گے!"

"یہ تو بہت ہوئے!"

"تو نوابوں سے تم توقع کیا رکھتی ہو، کیا سو پچاس کے زیورات چڑھائیں گے؟"

"میرا خیال تو ۲۵ ـــ ۳۰ ہزار تک تھا!"

"تمھارا خیال ـــــــ ہونھہ!"

"اب ہمیں کرنا کیا کیا ہے؟ ـــــــ کروگے تو تم ہی لیکن بتاؤ تو سہی!"

"ظاہر ہے مَیں مفت کا غلام مل گیا ہُوں، بے شک یہ کام دل و جان سے کروں گا!"

"لیکن کیا کیا کروگے؟"

"مکان کی بہترین قلعی ابھی چند دن پہلے ہو چکی ہے، لہٰذا اس کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں اور کیا؟"

"کھانا کھائیں گے نہیں!" ـــــــ

"نہ کھائیں، لیکن ہمیں تو پوچھنا چاہیئے۔ بلکہ تیار رکھنا چاہیئے، میرے خیال میں اگر ان سے یہ کہا جائے کہ امراؤ کے ساتھ الگ کمرے میں بیٹھ کر کھائیں، تو فوراً راضی ہو جائیں گے" ـــــــ

"وہ مارا ـــــــ بے شک دل و جان سے راضی ہو جائیں گے، اور قسم ہے جناب امیر کی، یہ تدبیر بھی خوب سوجھی تمھیں!"

"ہاں ـــــــ مَیں نے سوچا، ہم لوگوں کے سامنے جو دونوں کا تعارف ہوگا، اور رسمی باتیں ہوں گی، تو کوئی بھی کھُل کر باتیں نہیں کر سکے گا، کھانے کے

(۱۳)

استاد نتھے خاں نے سگن کو تین لاکھ اور زیورات جواہر نگار کی خوش خبری سُنا دی، اپنے روپے جو نواب صاحب نے عطا کیے تھے گول کر گئے۔ سگن تین لاکھ کا ذکر سُن کر بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی :

"بڑی بھاگوان لڑکی ہے ماشاء اللہ ــــــــ"

استاد نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا :

"ارے بھئی، مَیں نے رات زائچہ دیکھا تھا، تو معلوم ہُوا، روپیہ اس کے گھر کی لونڈی ہوگا، عیش کرے گی، خود خوش رہے گی، دوسروں کو جلاتے گی!"

بڑے جذبے اور جوش کے ساتھ، بے ساختگی کے عالم میں سگن کے منھ سے نکلا :

"انشاء اللہ، انشاء اللہ!"

استاد نے کہا :

"کل نواب صاحب اپنے ساتھ زیورات کا پٹارہ بھی لائیں گے ــــــــ مجھے دکھائے تھے!" ــــــــ

"دکھائے تھے ــــــــ؟"

"ہاں ــــــــ!"

"کیسے ہیں؟ سچ کہنا!"

"تو کیا درجن بھر لباس پہنے گی؟"

"بڑی ناسمجھ ہو، ——— ایک لباس تو وہ ہوگا، جس میں پہلے پہل نواب صاحب سے متعارف ہوگی، پھر ناچ کا لباس الگ، گانے کا جُدا! ——— یہ اسے ابھی سے جتادو کہ نواب صاحب آرہے ہیں، ذرا ہوش میں رہے، بے تکی نہ اڑانے لگے۔"

"اس کی ضرورت نہیں، گھبرا جائے گی، اتنے بڑے نواب کا نام سُن کر!"

"پھر ——— ؟"

"بس اتنا کہہ دوں گی، ایک صاحب آرہے ہیں، میرے ایک دوست کے بیٹے، تمھیں ان سے ملنا ہے!"

"اچھا یہی سہی!"

"بس تو اب سدھارو، اور سارے انتظامات مکمل کر لو، ——— ایک ہزار کافی ہوں گے!"

"ایک ہزار؟ ہاں ——— میرے خیال میں ڈیڑھ ہزار دے دو جو بچ رہا، واپس کر دوں گا!"

◎

کمرے میں کوئی اور ہوگا نہیں، دل کھول کر یہ نوجوان جوڑا باتیں کرسکے گا۔"

"بالکل ٹھیک، ——— بڑی دُور کی سوجھی ہے۔ لیکن بخدا اس تجویز کا جواب نہیں!"

"تو اب یہ طے کرو کہ کھانے میں کیا ہونا چاہیئے؟"

"دیکھو بھئی کھانا وہ کھاکر آئے گا، یہاں تو محض ٹونگ لے گا، اور امراؤ سے باتیں کرے گا۔ ——— رہی یہ بات کہ ہم اسے پہلے سے بتادیں کہ کھانا کھا کر نہ آئے، یہاں کھائے، اور امراؤ کے ساتھ کھائے یہ مناسب نہیں!"

"یہ تو میرے خیال میں بھی مناسب نہیں ——— پھر بھی وہ کھائیں یا نہ کھائیں، کھانا تو بہتر سے بہتر سامنے ہونا چاہیئے!"

"اچھا بھئی تم نہیں مانتیں، تو اس کا بندوبست بھی کروں گا، انگلیاں چاٹتا نہ رہ جائے جب کی بات!"

"مَیں یہی چاہتی ہُوں!"

"جو تم چاہتی ہو وہ ضرور ہوگا ——— تُونے جو چاہا کیا اے یار جو چاہے کرے!"

یہ کہہ کر استاد نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

سگن نے چڑتے ہوئے کہا :

"بس مجھے یہی باتیں نہیں اچھی لگتیں تمھاری!"

"یعنی ہنسنا ——— لو بھئی اب نہیں ہنستے۔ اور کوئی حکم؟"

"امراؤ کو لباس کیسا پہنانا چاہیئے کل؟"

"اجی اسے اس پر چھوڑو، وہ جو لباس بھی پہنتی ہے ایسا پھبتا ہے کہ بار بار ردِّ بلا کی دعا پڑھتا ہُوں، اور پھر ایک لباس تو ہوتا نہیں" ———

البتہ خود اس کے حقوق کا جہاں تک تعلق تھا۔ ان پر کسی طرح کی دست اندازی نہیں کی جاتی تھی، وہ گھر کی مالک ہوتی تھی، اس کے حکم کو رد کرنے میں شوہر کو بھی جرأت نہیں تھی شوہر کے اپنی طوائف سے لاکھ والہانہ اور مجنونانہ تعلقات ہوں، لیکن بیوی کے احترام، اور اعزاز و اکرام میں وہ زیادہ سے زیادہ سرگرمی دکھاتا تھا۔ ساری رات چاہے، طوائف کے ہاں راگ رنگ میں گزرے، لیکن وقتِ معیّنہ پر بیوی کے پاس آنا، بیٹھنا، اسکی باتیں سُننا اور ماننا اور کم از کم دوپہر کا کھانا اس کے ساتھ کھانا فرض تھا۔ اس فرض سے ذرا بھی تغافل ممکن نہیں تھا۔

نواب صمصام الدولہ کے اس ارادے کی خبر ان کی بیوی کو جو خود بھی نواب زادی تھیں اور ایک امیر کبیر کی دخترِ بلند اختر تھیں، پہنچ چکی تھی، لیکن انھوں نے نہ اس کا برا مانا، نہ اسے کوئی اہمیت دی، نہ اس کے بارے میں نواب صاحب سے کسی طرح کا سوال کرنا ضروری سمجھا۔

نواب صاحب پشتینی طور پر مقربانِ دربار میں شامل چلے آرہے تھے، اسی لیے بادشاہ سلامت کے حضور میں اگر روزانہ نہیں تو کم از کم ہفتے میں ایک بار ضرور تشریف لے جایا کرتے تھے، وہاں ان کی شایانِ شان پذیرائی ہوتی تھی، وزیروں اور شہزادوں کے بعد، جو کرسیاں تھیں ان میں تیسرا یا چوتھا نمبر انہی کی کرسی کا تھا، بادشاہ سلامت ان پر بہت مہربان تھے، اور انھیں ایک خاص خصوصیت یہ حاصل تھی کہ زمرۂ مصاحبین میں بھی شامل تھے اس لیے شاہ ذی جاہ کی خلوت کی مجلسوں میں بھی حاضر ہُوا کرتے تھے۔

ان خصوصیتوں نے نوابی کے علاوہ بھی نواب صاحب میں چار چاند لگا دیتے تھے، اور وہ بہت معزز نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

امراؤ کے جشنِ نغمہ و رقص میں نواب صاحب بھی تشریف لے گئے تھے، اور اسے دیکھتے ہی دل ہار بیٹھے تھے۔

(۱۴)

نواب صمصام الدولہ مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے واقعی شریف آدمی تھے —— بے حد متین، سنجیدہ، مہذب، خوش گفتار، نرم خُو، —— لیکن عیاشی وراثت میں ملی تھی۔ اس سے کیسے کنارہ کش ہو جاتے، اور پھر یہ بات بھی ہے کہ ہر شخص اپنی سوسائٹی اور معاشرے کے آداب و رسوم کا پابند ہوتا ہے۔ نواب صاحب کی سوسائٹی، اور معاشرے میں یہ چیز باعثِ فخر سمجھی جاتی تھی کہ ہر رئیس اور نواب کے کسی نہ کسی طوائف سے تعلقات ضرور ہوں اور وہ بھی اس طرح کہ قیامِ تعلقات کے بعد، وہ طوائف پھر کسی دُوسرے شخص سے نظر ملا کر بات بھی نہ کرے، اس سے نکاح تو نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن عملاً وہ منکوحہ سے زیادہ حقوق و مراعات کی حامل ہوتی تھی! نواب صمصام الدولہ کے پردادا، دادا، والد —— سب ہی اسی ڈگر پر چلتے آئے تھے —— پھر نواب صاحب کیوں نہ اسے اختیار کرتے؟

پھر ایک بات اور بھی تھی!

طوائفوں سے منکوحہ بیوی کے سے تعلقات اس درجہ داخل ہو گئے تھے، کہ بیوی تک اس کا بُرا نہیں مانتی تھی، جب اس طرح کی خبر سُنتی، تو اس کان سُنتی، اس کان اُڑا دیتی ——!

اس لیے کہ وہ جانتی تھی یہ چیز تو سوسائٹی اور معاشرے کے آداب و رسوم میں داخل ہے میرا شوہر اس سے کیوں کر مستثنیٰ رہ سکتا ہے؟

پھر —————— ؟

دفعتاً انھیں سگّن کی تقریر یاد آگئی، جس میں اس نے استاد ننھّے خاں کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا، اور راماؤ کو تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ان کے خدماتِ جلیلہ کو سراہا تھا۔

یہ سوچتے ہی انھوں نے اپنے ایک راز دار مصاحب حاتم مرزا کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ استاد ننھّے خاں کو یہاں پھانس کر لائے، وہ تو خود کسی کے انتظار میں تھے، دعوت پاتے ہی چل کھڑے ہوئے، اور سارے معاملات، سگّن سے رائے لیے بغیر طے کر کے چلے آئے، یہ اقدام انھوں نے پانچ ہزار کے لالچ میں نہیں کیا تھا، جو نواب صاحب نے پہلی ملاقات میں مرحمت فرمائے تھے بلکہ اس لیے کیا تھا کہ امراؤ کے لیے اس سے بہتر اور عمدہ کوئی اور ڈیوڑھی ہو ہی نہیں سکتی تھی ——— !

◎

ایسا حُسن ——— جسے واقعی پری مثال کہا جا سکتا تھا، ان کی نظر سے آج تک نہیں گزرا تھا۔

پھر جب انھیں اس کی نغمہ سرائی سے محظوظ ہونے کا موقع ملا، تو وہ اور زیادہ صدقِ دل سے اس پر عاشق ہو گئے، بھلا جو کبھی اتنا اچھا گا سکتی ہو، اسے تو دل سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنا چاہیئے۔

اور پھر جب نواب صاحب نے اس کا رقص دیکھا تو ہوش و حواس کھو بیٹھے، دربار میں اور دربار سے باہر انھیں نغمہ و رقص کی بہتیری محفلوں میں شرکت کا موقع ملا تھا، اور انفرادی طور پر بھی انھوں نے بہت سی رقاصاؤں اور گانے والیوں کا کمال اپنے ایوان میں یا کسی دوست کی حویلی میں دیکھا۔ مگر یہ بات جو انھیں امراؤ میں نظر آئی تھی، آج تک کہیں اور نہیں دکھائی دی تھی، انھیں فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی، انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لیا۔

"امراؤ میری ہے!"

اس فیصلے پر یہ قوت کام کر رہی تھی کہ ——— امراؤ کو حاصل کرنے کے لیے، وہ سب کچھ داؤں پر لگا دینے کو تیار ہیں، اس کے بعد بھلا ان کے مقابلے میں کون ٹھہر سکتا تھا؟

دو روز تک وہ سوچتے رہے کہ سلسلہ جنبانی کس طرح کی جائے؟

خود جانا نہیں چاہتے تھے، بغیر مراسم کے اسے بلانا بھی، خلافِ تہذیب تھا۔ اس لیے کہ وہ کسی معمولی خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی، ——— وہ سگّن کی بیٹی تھی، اور سگّن کا ایک زمانے میں طوطی بولتا تھا، اس سے پہلے اس کی ماں کا، اور اس سے پیشتر اس کی ماں کا، چوک کی رہنے والیوں میں جو چند خاندان بہت زیادہ توقیر کے حامل تھے، ان میں سگّن کا خاندان بھی تھا!

"بے شک غلام کا رزق اسی آستانے پر خدا نے لکھ دیا ہے، لیکن وہ چھِنتا ہے، تو چھِن جائے، بند ہوتا ہے تو بند ہو جائے، جھُوٹ نہیں بولوں گا، حضور کو امراؤ کے مقابلے میں چاند کہہ دُوں، یہ نہیں ہو سکتا، ——— ہاں، امراؤ کو حضور کے مقابلے میں چاند کہہ سکتا ہُوں!"

"(ہنس کر) اچھا بھئی دونوں سُورج سہی!"

"چلیے یہی سہی!"

"لیکن حاتم مرزا ایک بات تو بتاؤ۔"

"جی ارشاد سرکار!"

"ہم امراؤ سے باتیں کس طرح کریں گے؟ اس کے سامنے ہماری زبان کیُوں کر کھُلے گی؟ بارگاہِ حُسن میں جُنبشِ لب کا یارا کیسے حاصل ہوگا؟"

"حضور کی باتیں!"

"کیوں کیا غلط کہا ہم نے؟"

"غلام کی یہ ہمّت کہاں کہ حضور کی بات کو غلط کہہ سکے، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ دیکھ لیجیے گا، معاملہ برعکس ہوگا!"

"(حیرت سے) اس کا مطلب؟ کیا کہا حاتم مرزا تم نے؟"

"غلام نے یہ عرض کیا کہ حضور تو اپنی خوش بیانی کا سِکّہ جما دیں گے جانتے ہی۔ لیکن، وہ جو ہیں امراؤ بیگم وہ ضرور اپنے سامنے، حُسنِ مردانہ کے اس شاہکار کو دیکھ کر، گھبرا جائیں گی، تابِ تکلّم انھیں نہ ہوگی، نہ کہ حضور کو!"

"نہیں حاتم مرزا، تم نہیں جانتے۔ ہم نے اندازہ کر لیا، وہ بڑی چنچل ہے۔ اس کی آنکھوں سے طُوفانِ تکلّم اُبلتا ہے، اُس کی ادائیں بولتی ہیں، اس کے انداز و اطوار سے باتیں نکلتی ہیں!"

(۱۵)

وقتِ مقررہ پر نواب صاحب بن ٹھن کر تیار ہو گئے !

حاتم مرزا نے بلائیں لیتے ہوئے کہا :

" خدا حضور کو سلامت رکھے ، چلیے تشریف لے چلیے ! "

کچھ تامّل کے بعد انھوں نے فرمایا :

" بھئی ، اتنی جلدی کیا ہے ؟ ہمیں بعد مغرب جانا ہے ، ابھی تو سورج بھی غروب نہیں ہوا ! "

حاتم مرزا نے جواب دیا :

" حضور آج لطف آجائے گا ! "

" کس طرح کا لطف ؟ "

" ایک سورج غروب ہوگا ــــــــــ اور فوراً ہی دو سورج طلوع ہوں گے ! "

" دو سورج ؟ "

" جی سرکار اور کیا ؟ "

" (انجان بنتے ہوئے مسکرا کر) بھئی ہم تو سمجھے نہیں ؟ "

" اے حضور سیدھی سی تو بات ہے ، ایک حضور خود ، دوسری وہ ماہ پارا جس کا نام امراؤ ہے ! "

" نہیں بھئی ہمیں چاند کہہ لو ، سورج وہی ہے ! "

"بہت اچھا سرکار !"

"جلدی ——— وقت بہت کم رہ گیا ہے !"

"غلام کے خیال میں یہ شعر بہت مناسب رہے گا ۔

اس دستِ نگاریں کو ذرا مَیں نے چھُوا تھا
کس ناز سے کہنے لگے ، اُف ، چھوڑ ، گیا ہاتھ

——— !"

"شعر تو اچھا ہے" ———

"بہت اچھا ہے ۔"

"لیکن بالکل بے محل ہے ، وہ ہمارا مذاق اڑائے گی ، ہنس دے گی ۔ کوئی اور شعر جلدی سے !"

"بہت خوب سرکار !"

"بہت خوب سرکار ، کہہ کر تم نے جو وقت ضائع کیا ہے ، اتنی ہی دیر میں شعر سُنا سکتے تھے ——— دیکھ ظالم سورج ڈوب رہا ہے ، دیر ہو رہی ہے ، جلدی کر !"

"سرکار یہ شعر تو بالکل ٹھیک ہے ۔

راہ پر ان کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھُل کھیلیں گے دو چار ملاقاتوں میں

——— !"

"آج تمھیں ہو کیا گیا ہے حاتم مرزا ۔ تم اتنے بدذوق ہو کہ ایک شعر بھی کام کا یاد نہیں ؟"

"لیجیے ، ——— حضور ، یاد آگیا ۔ ——— اسے ضرور پسند فرمائیں گے آپ ۔

"حضور تو خواہ مخواہ مرعُوب ہوئے جارہے ہیں!"

"بھئی جھوٹ کیوں بولیں، مرعُوب تو ہیں!"

"لیکن وہاں جاتے ہی سماں بدلا ہُوا نظر آئے گا۔"

"یہ تمھارا حسنِ ظن ہے!"

"جو کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا ایک مشکل تو حل کر و حاتم مرزا۔"

"جی ارشاد سرکار!"

"ہماری کمزوری یہ ہے کہ شعر ہمیں یاد نہیں رہتے!"

"جی ———"

"اور ہم امراؤ کے سامنے شعر ضرور پڑھنا چاہتے ہیں، کوئی اچھا سا پھڑکتا ہُوا شعر سُناؤ، اسے اپنی ہتھیلی پر لکھ لیں گے، اور باتوں باتوں میں سُنا دیں گے، دیکھیں گے وہ کیا جواب دیتی ہے!"

"ایک شعر؟ ——— سرکار حکم ہو تو پُوری غزل ———"

"نہیں نہیں بس ایک شعر کافی ہے، لیکن جلد!"

"یہ شعر کیسا رہے گا سرکار!

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا!

——— !"

"لاحول ولا قوۃ، عجب بے وقوف آدمی ہو، دل کی ——— ویرانی تو ٹھیک، لیکن یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا، یعنی ہم ہمیشہ سے عشق بازی کرتے ہیں، اب تمھاری باری ہے ——— کوئی اور اچھا سا شعر سناؤ جلدی سے!"

نواب صمصام الدولہ ایک اعلیٰ درجے کی گاڑی پر، سگّن کے گھر پہنچے۔ یہاں استاد نبھّے خاں نے سارے انتظامات پہلے سے مکمل کر لیے تھے، اور نواب صاحب کے انتظار میں چشم براہ بیٹھے تھے۔ رہ رہ کر سورج پر غصّہ آرہا تھا کہ آج اسے کیا ہو گیا ہے کسی طرح ڈوبنے کا نام نہیں لیتا!

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور نواب صاحب تشریف لائے۔ نواب صاحب کے ساتھ حاتم مرزا بھی تھے۔ استاد نبھّے خاں نے بڑھ کر استقبال کیا اور اندر لے گئے۔ سگّن نے جھٹ پٹ بلائیں لیں، اور کہنے لگی:

"خوشا قسمت کہ آپ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رکھا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

شعر سُن کر نواب صاحب پھڑک گئے۔ جی چاہا، خود بھی اس کے جواب میں کوئی شعر سُنا دیں، لیکن سناتے کیسے؟ ایک ہی تو شعر تھا ان کی ہتھیلی پر، اور اسے انھوں نے امراؤ کے لیے محفوظ کر رکھا تھا۔

سگّن نے بڑے ادب کے ساتھ نواب صاحب کو صدر میں ایک اعلیٰ درجہ کے قالین پر بٹھایا، پیچھے گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔

نواب صاحب نے کہا:

بے مروّت ، نازک انگن آفریں صد آفریں
دل کا دل زخمی کیا ، پیکاں کا پیکاں لے چلا

——— ! "

" شعر اچھا ہے ، ہمیں پسند آیا ، لیکن اتنا بڑا شعر ہتھیلی پر بھلا لکھ کس طرح سکتے ہیں ؟ "

" سرکار یہ کون سا مشکل کام ہے ؛ غلام آخر کس مرض کی دوا ہے ، میں تو چاول پہ پُوری ایک کتاب لکھ دُوں ! "

" (ہاتھ بڑھا کر) اچھا لکھو ، لیکن اتنا باریک بھی نہ لکھنا کہ وہ محسوس کر لے ، کہ میں لکھ کر لایا ہُوں اور پڑھ رہا ہُوں ! "

" جی نہیں ، ایک ایک حرف گن لیجیے ——— یہ تو میرا فن ہے ! —— (شعر ہتھیلی پر لکھ کر) فرمایئے ! "

" (خوش ہو کر) ہاں ٹھیک ہے ، اب چلو وقت ہو گیا ! "

◎

"میری دعا ہے کہ یہ جوڑی سلامت رہے !"

حاتم مرزا نے کہا :

"آمین !"

سگن کہنے لگی :

"میری تمنّا ہے کہ تم دونوں میں محبت سے رہو ؟"

نواب صاحب نے ایک خاص ولولے کے ساتھ فرمایا :

"میں تو چاکری کروں گا، اس تعلّق پر مجھے فخر ہے !"

"ذرّہ نوازی ہے بیٹے !"

"اب یہ بھی طے کر لیجیے کہ ——————— کون سی تاریخ آپ مقرر کر رہی ہیں !"

محض نواب صمصام الدولہ کی آتشِ شوق بھڑکانے کے لیے ——————— سگن نے کہا :

"دو تین مہینے کے بعد ہی کوئی تاریخ مقرر ہو سکے گی ؟"

یہ ساری جمع جتیا نہ خانے میں رکھ کر استاد ننھّے خاں بھی واپس تشریف لا چکے تھے۔

سگن کے الفاظ کا اصل مطلب وُہ بھی سمجھ گئے ——————— چنانچہ انھوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی :

"جی ہاں، ——————— اس سے کم میں انتظامات کیسے مکمل ہو سکتے ہیں ؟"

نواب صاحب نے کہا :

"اتنا طویل انتظار میرے بس سے باہر ہے۔"

"ہمارے آنے کا مقصد استاد نتھّے خاں نے آپ پر واضح کر دیا ہوگا؟"

سگّن پیار بھری نظروں سے انھیں دیکھتی ہوئی بولی :

"ہاں بیٹے ——— ہمارے لیے تو یہ باعثِ فخر ہے کہ تم جیسے لوگوں سے ہماری لڑکی کا تعلق ہو!"

بڑے انکسار اور فروتنی کے ساتھ نواب صاحب نے کہا :

"مجھے تو اپنا خادم سمجھیئے!"

"خدمت گزار تو ہم ہیں بیٹے ——— تم تو آقا ہو!"

"یہ آپ کی بزرگانہ شفقت ہے ——— استاد نتھّے خاں سے جو کچھ طے ہُوا تھا، وہ مَیں اپنے ساتھ لایا ہوں ——— حاتم مرزا پیش کرو. امّاں جان کے سامنے!"

حاتم مرزا نے فوراً تین لاکھ اشرفیاں سامنے رکھ دیں، جنھیں سگّن نے سنبھالا، اور استاد کی طرف بڑھا دیا، انھوں نے لے لیا، وہ بظاہر تو ان سے شغل کر رہے تھے لیکن درحقیقت گن رہے تھے۔

پھر نواب صاحب نے کہا :

"حاتم مرزا، وہ زیورات زرنگار بھی اماں کو دکھاؤ!"

حاتم مرزا نے زیورات زرنگار کی پٹاری سگّن کے سامنے رکھ دی، انھوں نے کھولا تو دنگ رہ گئیں۔ واقعی نوابی زیور تھے، بھلا ہما شما کو ایسی چیزیں کہاں میسر، اور ان کی مالیّت کسی طرح بھی، ڈیڑھ لاکھ سے کم نہیں تھی۔

سگّن نے وہ زیورات بھی استاد کو دے دیئے۔ وہ اشرفیاں، اور زیورات لے کر، تہ خانے میں رکھنے چلے گئے۔

سگّن نے کہا :

کچھ تامّل کے بعد اس نے جواب دیا :

"اچھا یہی سہی ——— آج دسمبر کی پہلی ہے، ۱۶ ار رکھ لو !"

نواب صاحب نے اب تک امراؤ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ سخت مضطرب ہو رہے تھے۔ باربار پہلو بدلتے تھے ——— سگّن نے ان کی یہ کیفیت محسوس کرلی اور استاد سے کہا :

"اے استاد جاکر ذرا امراؤ کو تو بلالاؤ۔ وہ بھی نواب صاحب سے مل لے !"

استاد امراؤ کے کمرے کی طرف شاداں و فرحاں بڑھے، ———

سگن نے شفقت بھرے لہجے میں پوچھا :

"تو پھر تم کب چاہتے ہو بیٹے ؟"

نواب صاحب نے جواب دیا :

"میں تو چاہتا ہوں، کل ہی کی تاریخ مقرر کر دیجیے !"

سگن ہنسنے لگی :

"بیٹے کی باتیں، بھلا اتنی جلدی کیسے ممکن ہے ؟"

نواب صاحب نے سوال کیا :

"نہ ممکن ہونے کا کوئی سبب بھی تو ہوگا ؟"

استاد ننھے خاں کو اپنی مشیخت دکھانے کا یہ بہترین موقع ہاتھ آیا تھا، لہٰذا خاموش نہ رہ سکے۔

فرمانے لگے :

"بوڑھا آدمی ہوں، سارے انتظامات مجھی کو کرنے ہیں"

"کس قسم کے انتظامات ؟"

"ساری برادری کی دعوت کرنا ہوگی !"

"چلیے دعوت کے سارے اخراجات اور انتظامات میرے ذمّے رہے، ـــــ کہیے، اب کتنے دن کے بعد تاریخ مقرر ہو سکتی ہے ؟"

دعوت میں پندرہ بیس ہزار روپے تو ضرور خرچ ہو جاتے، یہ بوجھ بھی نواب صاحب نے اپنے ذمّے لے لیا۔ سگن اور استاد ننھے خاں، دونوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔

پہل کرتے ہوئے استاد نے کہا :

"پندرہ دن کے اندر کوئی تاریخ مقرر کر دی جائے، کیوں سگن ؟"

لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھی رہی، اس نے جواب دیا :

"کیا یہ فاصلہ آپ کے نزدیک بہت زیادہ ہے ؟"

"جی ہاں ہے تو !"

"لیکن اس کو گھٹانا یا کم کرنا میرے بس سے باہر ہے !"

حاتم مرزا نے جوشِ وفاداری میں کہا :

"آپ نہیں جانتیں، یہ نواب صمصام الدولہ ہیں۔"

وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی بولی :

"نواب صمصام الدولہ کو بھی معلوم ہوگا میں امراؤ ہوں !"

نواب صاحب اس جواب سے جھینپے تو بہت لیکن اپنی خفت مٹانے کے لیے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا، پھر حاتم مرزا سے کہا :

"بڑے حاضر جواب بنتے تھے، اب دو جواب !"

وہ کان پکڑ کر بولا :

"میں نے ہار مان لی، واقعی یہ بذلہ سنجی، اور حاضر جوابی ——— میں نے کہیں نہیں دیکھی !"

نواب صاحب نے امراؤ سے سوال کیا :

"آپ کے مشاغل کیا ہیں ؟ ——— آخر آپ گھر پر کیا کیا کرتی ہیں ؟"

وہ بولی :

"میں تو کچھ بھی نہیں کرتی۔ اماں جان مجھے کام کرنے ہی نہیں دیتیں، لہٰذا خوب جی بھر کے سوتی ہوں، یا چوسر کھیلا کرتی ہوں !"

"اچھا چوسر بھی آتی ہے آپ کو ؟"

"بہت اچھی !"

(۱۷)

امراؤ آئی!

وہ آئے بزم میں اتنا تو میر نے جانا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

نواب صاحب، اور حاتم مرزا، اسے دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔
سگّن نے امراؤ سے کہا:
"بیٹی سلام کرو نواب صاحب کو!"
امراؤ نے ایک ادا سے ہاتھ ماتھے تک لے جا کر، اور سر کو ذرا سا جھکا کر بڑے دل ربا طریقہ سے کہا:
"آداب، تسلیمات!"
نواب صاحب نے جواب دے کر کہا:
"تشریف رکھیئے، آپ تو اب تک کھڑی ہیں!"
اتنی دیر میں سگّن کمرے سے باہر جا چکی تھی، اور استاد بھی رخصت ہو چکے تھے، بس امراؤ تھی، یا نواب صاحب اور مرزا صاحب، نواب صاحب کے ارشاد پر وُہ مسند کے ایک گوشے پر بیٹھ گئی۔
نواب صاحب نے کہا:
"اتنی دور؟ ——— اور قریب آیئے!"

"کسی دن ہم آپ کی دعوت کریں گے، اپنے "گلشن بے خار" میں!"

"گلشن بے خار میں؟"

حاتم مرزا نے سمجھایا:

"جی ہاں، نواب صاحب کا بہت بڑا باغ ہے، سارے شہر میں اس کی ٹکر کا کوئی نہیں ——!"

"وہ تو خیر ہو گا —— لیکن کیا اس باغ میں صرف پھلوں ہی کے درخت ہیں، پھولوں کے پودے نہیں؟"

"بہت ——"

"اور گلاب؟"

"گلاب کی ہر قسم، —— کالا گلاب نایاب مانا جاتا ہے، لیکن وہ بھی ہے وہاں!"

"تو کیا اس میں کانٹے نہیں ہیں؟"

"جی کانٹے ——؟"

"ہاں —— ہیں یا نہیں؟"

"ہیں، کیوں نہ ہوتے؟"

"پھر یہ باغ "گلشن بے خار" کیسے ہُوا؟ —— مجھے جھوٹ سے نفرت ہے اب میں وہاں نہیں جاؤں گی!"

نواب صاحب نے بات بگڑتی دیکھی تو فرمایا:

"پھر دیکھا جائے گا!"

نواب صاحب دل ہی دل میں حاتم مرزا کو لاکھوں گالیاں دے رہے تھے کہ کمبخت نے "گلشن بے خار" کا نام لے کر خواہ مخواہ کی بحث کا موقع پیدا کر دیا اور اصل بات یعنی دعوت

"لیکن اکیلی آپ کس کے ساتھ کھیلتی ہوں گی؟"

"کئی سہیلیاں ہیں میری، یا خود آجاتی ہیں یا مَیں بُلا لیتی ہُوں!"

"شطرنج بھی آتی ہے آپ کو؟"

"جی ہاں ——— کچھ یُوں ہی سی!"

"(مسکراتے ہُوئے) تو پھر کسی دن ہمارا مقابلہ ہوگا، دیکھیں گے، کون جیتتا ہے؟"

"شطرنج مجھے آتی معمولی سی ہے، لیکن عجیب اتفاق ہے آج تک مجھ سے کوئی بھی جیت نہیں سکا!"

"آپ سے ہارنا باعث فخر سمجھتا ہوگا اپنے لیے!"

"یہ بھی ہو سکتا ہے ——— لیکن مَیں تو ہمیشہ عورتوں کے ساتھ کھیلتی ہُوں، ان میں سے کئی مجھ سے جلتی بھی ہیں!"

"(ان اداؤں پر لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے) جلتی بھی ہیں؟"

"جی ہاں بہت زیادہ!"

"لیکن کیوں؟"

"بس یہی بات کہ مَیں گانا کیوں جانتی ہُوں؟ ناچنا کیوں آتا ہے مجھے؟ ——— اور مَیں بدصورت کیوں نہیں ہُوں؟"

"(ہنس کر) بہت خوب، کیا معقول وجہ ہے جلنے کی، ——— لیکن اس قدر جلنے کے باوجُود ہار جاتی ہیں آپ سے؟"

"جی ہاں ——— اب تک تو ایسا ہی ہُوا ہے ——— عاقبت کی خبر خدا جانے!"

نواب صاحب پھر زور زور سے ہنسنے لگے، فرمایا:

(۱۸)

ذرا دیر کے بعد سگن پھر آگئی ، ساتھ ہی ساتھ استاد ننھّے خاں بھی ، اور ان دونوں کے پیچھے کئی خادماؤں کے سر پر سرپوش سے ڈھکے ہوئے فواکہات وغیرہ کے کئی خوان بھی —!"

سگن نے شکایت آمیز لہجہ میں امراؤ سے کہا :

" بیٹی مہمان کی کچھ خبر بھی لی ہوتی !"

بڑی سادگی کے ساتھ وہ بولی :

" میں خبر کسی کی بھی نہیں لیتی !"

نواب صاحب پر پھر ہنسی کا دورہ پڑا، انھوں نے تسلسل کے ساتھ کئی زوردار قہقہے لگائے ، پھر سگن سے مخاطب ہو کر کہا :

" صاحب ان کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کا کوئی جواب نہیں !"

سگن نے دل میں خوش ہوتے ہوئے اور ظاہر میں برا مانتے ہوئے کہا :

" بس یہی تو آتا ہے !"

نواب صاحب نے فرمایا :

" یہ تو نہ کہیے ، انہیں کیا نہیں آتا ، ان کی نغمہ سرائی کا جواب سارے شہر میں کوئی ہے ؟ ان کے رقص کی کوئی نقل بھی کر سکتا ہے "———

سگن نے مسکراتے ہوئے کہا :

" کسی کے منھ پر اس کی تعریف نہیں کی جاتی بیٹے !——— ویسے ہی یہ اپنے سوا

رہ گئی، انھوں نے سلسلۂ سخن کو پھر سے جوڑتے ہوئے، کہا :

"آپ وہاں دیکھیں گی ———"

"جب تک اس کا نام نہیں بدل جاتا، مَیں کچھ نہیں دیکھوں گی، لہٰذا اس ذکر کو فی الحال چھوڑ دیئے!"

زندگی میں پہلی مرتبہ نواب صاحب سے اس طبقے کی کسی عورت نے اس لب و لہجہ میں باتیں کی تھیں، لیکن اس کی یہ گستاخی انھیں بُری نہیں لگی، بلکہ یہ چیز انھیں اور زیادہ کشش انگیز نظر آئی۔ البتہ حاتم مرزا ضرور حیران تھا کہ عجب عورت ہے جو نواب صاحب پر اس طرح چھا گئی کہ وہ اپنی ہتھیلی پر لکھوایا ہُوا شعر بھی نہ پڑھ سکے۔ ——— حد ہوتی ہے مرعُوبیت کی!

جب نواب صاحب کی خاطر تواضع ہو چکی تو سگّن نے استاد سے کہا: "ذرا وہ زیورات کی پٹاری تو لانا۔" پھر امراؤ سے کہا :

"نواب صاحب نے تمھیں تین لاکھ کی اشرفیاں دی ہیں !"

"(حیرت سے) تین لاکھ کی ؟"

"ہاں بیٹی ، اور کیا !"

"لیکن میں ان اشرفیوں کا کیا کروں گی ؟"

"یہ کیوں ؟ ——— تمھارا مال ہے خرچ کرنا جس طرح جی چاہے !"

وہ بولی :

"نہ مجھے تین لاکھ کی اشرفیاں لینا ہیں، نہ خرچ کرنا ہیں۔ میں یہ جنجال کیوں پالنے لگی۔ مجھے تو آپ جو کچھ دے دیتی ہیں بہت ہے !"

سگّن نے مسکراتے ہوئے نواب صاحب کی طرف دیکھا اور کہا :

"سُن لیا صاحب زادی کیا فرما رہی ہیں ؟"

ان باتوں سے وہ بہت دل شکستہ سے ہو گئے تھے، سگّن کے اکسانے سے ان میں پھر ولولہ پیدا ہُوا کہنے لگے :

"لیکن یہ مال تو آپ کا ہو گیا، یہ تو آپ کو لینا ہی پڑے گا !"

وہ بے پروائی سے بولی :

کسی کو نہیں سمجھتی، اب اور زیادہ اِترا جائے گی !"

وہ تیوری چڑھا کر ماں سے مخاطب ہوئی :

" اماّں مجھے غلط نہ سمجھئے، مَیں کسی کے کہنے سے اپنے بارے میں رائے نہیں قائم کرتی مَیں نے خود اپنے کو پرکھا ہے، اور ایک رائے قائم کر لی ہے، اور اس سے مجھے کوئی نہیں ہٹا سکتا !"

سگّن نے بڑی بے بسی سے نواب صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :

" سُن لیا آپ نے ؟"

وہ بولے :

" ہ، ہاں سُن لیا، اور مجھے ان سے پُورا اتفاق ہے !"

" بیٹے تم بھی اسی کی سی کہنے لگے ——— ؟

" مَیں نے سچّی بات کی ہے۔ ضرور آدمی میں خود اعتمادی ہونی چاہیئے، ——— ورنہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کسی نے تعریف کر دی تو خوش ہو گیا۔ کسی نے بُرا کہہ دیا تو رو دیا !"

" اچھا بھئی تم دونوں جانو۔ ہم بوڑھے لوگ کیا جانیں ؟"

کیا سمجھتی ہو اپنے آپ کو ؟"

امراؤ بولی :

"آپ نے میری رائے پوچھی تھی، وہ میں نے بتادی، لیکن اگر آپ کا حکم ہے کہ اشرفیاں قبول کر لوں اور زیورات لے لوں، تو مجھے کوئی انکار نہیں ہے ۔"

سگّن نے اسی لب و لہجہ میں کہا :

"ہاں میرا حکم ہے !"

وہ بولی : "تو مجھے منظور ہے !"

نواب صاحب نے مناسب یہ سمجھا کہ اس وقت ٹل جائیں ۔ بہرحال چڑیا دام میں آ چکی ہے، جائے گی کہاں ؟ یہ وحشت جو ہے یہ بھی چند دن کی ہے، آخر خود بخود دُور ہو جائیگی۔ یہ سوچ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور بولے :

"اب اجازت دیجیے، اور اس جُمعہ کو ہمارے باغ میں تشریف لائیے ——— اور ماحضر تناول کیجیے !"

سگّن مطمئن ہو گئی کہ شکار ہاتھ سے نکلا نہیں، اس نے کہا :

"جیسا حکم ہو بیٹے !"

◎

"نہیں لیتی، زبردستی ہے کچھ کسی کی؟"
سگّن کا خون خشک ہوگیا، اور نواب صاحب بھی بہت بدمزہ ہوئے، حاتم مرزا کو تو غصّہ آرہا تھا، اس بدتمیزی اور گستاخی پر، لیکن مجبور تھے، کر کیا سکتے تھے، لیکن یہ بدمزگی استاد نتھّے خاں نے دُور کردی، وہ اپنے ساتھ ایک اور کھلونا ——— زیورات ——— لائے تھے۔ ان کا خیال تھا، اور سگّن کی بھی یہی رائے تھی کہ زیورات دیکھ کر امراؤ کی رال ٹپکنے لگے گی۔ چنانچہ سگّن نے استاد سے زیورات کی پٹاری لی اور سارے جواہر نگار زیورات نکال کر امراؤ کے سامنے رکھ دیئے، اور بولیں:

"کہو کیسے ہیں؟"

نواب صاحب سے ضبط نہ ہوسکا، کہہ اُٹھے:

"یہ بھی میری طرف سے آپ کی خدمت میں ایک حقیر تحفہ ہے!"

وہ بولی:

"جب مجھے اشرفیاں نہیں چاہئیں، جن سے میں اپنی مرضی اور پسند کا زیور بنواسکتی ہوں، تو یہ نہ جانے کس کس کا پہنا ہُوا، اور پُرانی قسم کا زیور لے کر کیا کروں گی؟ ——— سچ پُوچھیے تو مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں ہے!"
سگّن نے گھُور کر بیٹی کو دیکھا، اور تلخ لہجے میں کہا:

"امراؤ ———"

وہ بولی: "جی ———"

سگّن نے کہا:

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟ اتنا بڑا نواب تمھیں تین لاکھ کی اشرفیاں پیش کرتا ہے اور تم انکار کردیتی ہو انھیں لینے سے، بہترین قسم کے بالکل نئے زیورات جن کی مثال ملنا مشکل ہے، بطور تحفہ تمھیں دیتا ہے، وہ بھی تمھیں پسند نہیں ——— آخر تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟"

پری خانہ

لکھنؤ پر جانِ عالم واجد علی شاہ کا سکّہ چل رہا تھا !

جب یہ تخت نشین ہوئے تھے، تو امورِ سلطنت میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے، ہر روز شہر میں سواری نکلتی، اور، درد خواہوں کے معروضات سُنے جاتے۔ ان کی درخواستیں پڑھی جاتیں اور وہیں کے وہیں فیصلہ کر دیا جاتا۔ [۱]

بادشاہ سلامت کو، اپنے ملک کی فوجی طاقت مستحکم کرنے کا بھی بہت خیال تھا، چنانچہ انھوں نے فوجی سرگرمیوں کا آغاز بھی تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی کر دیا۔ [۲]

لیکن انگریزوں کو جو اب سارے ملک پر چھائے ہوئے تھے، اور جنگِ پلاسی میں شجاع الدّولہ کی شکست کے بعد سے اودھ پر حاکمانہ اقتدار حاصل کر چکے تھے، بادشاہ کی یہ دلچسپیاں پسند نہیں آئیں اور حکومتِ ہند یعنی وائسرائے کے ایما پر، ریذیڈنٹ نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ ان کے حال اور مستقبل کے لیے بہتر یہی ہے کہ ان سرگرمیوں سے باز آجائیں، اور عیش وعشرت کی شاہانہ زندگی بسر کریں۔ [۳]

واجد علی شاہ، اپنی کمزوری سے اور انگریزوں کی قوت و طاقت سے بہُت اچھی طرح واقف تھے۔ ایک مرتبہ تو ان کے جی میں یہ ولولہ اٹھا کہ جو ہو سو ہو، ان ہدایات،

---

[۱] : قیصر التواریخ

[۲] : تاریخِ اودھ

[۳] : اودھ پر انگریزوں کا تسلط

اوران مشوروں کو ماننے سے انکار کر دیں، اور کاروبارِ سلطنت، ریذیڈنٹ، اور وائسرائے کی مرضی اور مشورے سے بے پرواہ اور بے نیاز ہو کر چلائیں، لیکن خودغرض ندیموں، اور مصاحبوں نے اس کے خلاف مشورہ دیا، وزیر بھی انگریزوں سے ملا ہُوا تھا، اس نے بھی یہی کہا کہ انگریزوں سے ٹکر لینا موت کو دعوت دینا ہے اور خود واجد علی شاہ بھی واقف تھے کہ انگریزوں کی قوت و طاقت اس درجہ بڑھ چکی ہے اور ان کے وسائل اس قدر محدود ہو چکے ہیں کہ کسی طرح انگریزوں سے نہ ٹکر لے سکتے ہیں، نہ اُن کا مقابلہ کر سکتے ہیں!

چنانچہ کچھ روز تک وہ غمگین و حزیں محل سرا میں گوشہ نشیں رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ انگریزوں کی شہ پر، حریص اور طالع مصاحبوں نے انھیں عیش و عشرت کی راہ پر لا ڈالا۔ [1]

کاروبارِ سلطنت سے بے تعلق ہو کر، واجد علی شاہ نے جب عیش و عشرت کی زندگی اختیار کی تو اپنے آپ کو طوفانِ رنگ و بُو میں غرق کر دیا۔

غم کو فراموش کرنے کی اس کے سوا کوئی اور صورت ہی نہیں تھی۔

واجد علی شاہ بڑے کلّے کھلّے کے خوب صورت اور طرح دار آدمی تھے۔ ان کے اندر کچھ ایسی کشش تھی کہ جس پر بھی انھوں نے نگاہ ڈالی، وہ ان کا ہو گیا ——— اور ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔

دل بہلانے کے جو طریقے واجد علی شاہ نے اختیار کیے تھے ان میں بھی ان کی طبعِ جدّت پسند نے، بہت سی نئی نئی راہیں پیدا کر لی تھیں۔

قیصر باغ میں میلہ لگتا رہس کا سلسلہ جاری رہتا، منظوم اور منثور ڈراموں کی مشق ہوتی، اور اس طرح وہ خود بھی اپنے دل سے غم کا بوجھ ہٹانے کی کوشش کرتے، اور یہ

---

[1] : اودھ بہ عہد واجد علی شاہ۔

کوشش بھی کرتے کہ رعایا کا دل بھی بہلے۔

واجد علی شاہ غضب کے حُسن پرست بھی تھے۔

اس طرح کے واقعات انھوں نے اپنی خود نوشت میں خود بیان کیے ہیں جو اردو کے معلّی کا بہترین نمونہ ہے۔

اسی بڑھی ہوئی حُسن پرستی کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ انھوں نے "پری خانہ" قائم کیا تھا۔ اس میں شہر کی حسین و جمیل عورتوں کو، جو عام طور پر گھریلو زندگی کی عادی نہ ہوتیں، وہ منھ مانگے داموں پر ملازم رکھ لیتے۔

ان عورتوں میں بہت سی ایسی تھیں، جن سے وہ اپنے ڈراموں میں کام لیا کرتے تھے اور ان کی فنّی تعلیم و تربیّت پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ [1] باقی عورتیں وہ تھیں، جن سے انھوں نے متعہ تو کر لیا تھا، اور انھیں ہر طرح کا آرام اور سہولت بھی حاصل تھی، لیکن ان سے ربطِ قلبی نہ تھا۔

اور کچھ خوش نصیب عورتیں ایسی تھیں، جنھیں اچھی طرح پرکھ کر، اور دیکھ کر وہ ممتوعات میں شامل کر کے حقوقِ زوجیّت عطا کر دیتے، اور وہ بادشاہ بیگم کی حیثیت سے شان اور ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتیں۔

"پری خانے" کا ذکر خود واجد علی شاہ نے بھی اپنی خودنوشت میں تفصیل سے کیا ہے، بلکہ اس میں جو عورتیں داخل تھیں ان پر نام بنام تنقید بھی کی ہے اور تحسین بھی، اور ان کے عادات و اطوار کا تجزیہ بھی کیا۔ [2]

مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ:

" واجد علی شاہ حد درجہ مذہبی آدمی تھے۔ انھوں نے محل میں آنے والی دھوبنوں،

---

[1] : تاریخ اودھ۔

[2] : بنی مصنفہ واجد علی شاہ۔

عروج وارتقاء کی سبیلیں پیدا کی جاتی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ :

پری خانے میں جو عورتیں بھی داخل ہوتی تھیں، پہلے ان کا امتحان لیا جاتا تھا۔ پھر ان کو تعلیم دی جاتی تھی، بعد ازاں ان کی تربیت کا کورس مکمل ہوتا تھا — پھر وہ باقاعدہ پری خانے کی زینت بنتی تھیں، اور اپنے فن کے بل پر بہت جلد بامِ عروج و ترقی پر پہنچ جاتی تھیں۔

ایسی متعدد عورتوں کے حالات و کوائف اس عہد کی تاریخوں اور تذکروں میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔

پری خانے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہاں مردوں کا عمل دخل نہیں تھا، سوا ان لوگوں کے جو بادشاہ کے معتمد ہوں، اور اپنے فن میں طاق ہوں، ——— یہ وہاں صرف تعلیم دینے کے لیے جاتے تھے۔

◎

ستقنوں اور مہترانیوں تک سے متعہ کر لیا تھا۔ لیکن اس کا مقصد عیاشی نہیں تھا۔ نہ حرص و ہوس، نہ جنس اور تماشبینی، بلکہ یہ تھا کہ وہ کسی غیر محرم عورت کو اپنے سامنے نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ یہ عورتیں چونکہ اکثر و بیشتر ان کا کام کیا کرتی تھیں، اور ان کے حضور میں حاضر رہتی تھیں، لہٰذا انھیں ممتوعات میں شامل کر لیا تھا، ورنہ ان سے ازدواجی تعلقات قائم کرنا تو درکنار انھیں کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔" [1]

پری خانے پر واجد علی شاہ کا وقت زیادہ صرف ہوتا تھا۔

اس میں جو عورتیں داخل تھیں، فنِ نغمہ و رقص میں ان کا ماہر ہونا، یا اس فن سے انھیں شغف رکھنا ضروری تھا۔

چنانچہ شہر کی طوائفوں میں سے جو عورتیں ان کاموں سے دلچسپی رکھتی تھیں یا ان فنون سے تعلّق رکھتی تھیں، ـــــــــــ یا اس طرح کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں ـــــــــــ اور ساتھ ہی ساتھ صورت شکل کی بھی اچھی تھیں، انھیں وہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ دے کر پری خانے میں داخل کر لیتے تھے [2] ـــــــــــ اور ان کی تعلیم و تربیّت کی طرف خاص توجہ دیتے تھے۔ رقص و نغمہ کا فن سکھانے کا خاص بند و بست کیا گیا تھا، تاکہ جب جشنِ طرب میں انھیں شریک کیا جائے، یا ڈرامے میں حصّہ لینے کا حکم دیا جائے، ـــــــــــ تو وہ اپنے فرائض اچھی طرح سے انجام دے سکیں۔

پری خانہ کوئی عشرت کدہ نہیں تھا!

بلکہ درحقیقت وہ ایک ایسا مقام تھا، جہاں فنِ رقص و نغمہ، اور فنِ ڈرامہ کے

---

[1] : جانِ عالم واجد علی شاہ۔

[2] : تاریخ اودھ

سنوارنے کے لیے کیا سوچا ہے ؟"

امراؤ بول پڑی :

" اب اتنی نادان نہیں ہُوں، ——— تین لاکھ کی اشرفیوں اور اتنے ڈھیر سارے زیورات کا مطلب بھی نہ سمجھوں !"

استاد چیخے :

" پھر بھی، یہ حرکت ؟"

امراؤ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا :

" یہ اشرفیاں، اور زیورات واپس کر دیجیے !"

یہ سُن کر، سگّن کے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، اور استاد کا یہ عالم کہ دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں، بڑی مشکل سے استاد نے حواس مجتمع کیے، اور فرمایا :

" کمبخت، وہ تجھے چاہتا ہے، مال و دولت سے تیرا گھر پاٹ دے گا۔ جو مانگے گی پائے گی، پاندان کا خرچ، ایک نئی حویلی اور اس کا خرچ ——— بہت سے گاؤں گراؤں،"

" آپ لے لیجیے !"

" مَیں لے لُوں ؟"

" جی ہاں مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیئے !"

" ہائے میرے رب کیا زمانہ آگیا ہے ——— لڑکی ذات اور یہ آزادی، خدا کی قسم میری ہوتی تو گلا گھونٹ دیتا !"

" مَیں خود گھونٹ لوں گی !"

دفعتہً استاد کی آواز میں لرزش پیدا ہوئی ——— انھوں نے ہکلاتے ہُوئے دریافت کیا :

(۲)

نواب صاحب سگن کے ہاں سے رخصت ہو کر اپنے ایوان کی طرف تشریف لے گئے، ان کے جاتے ہی استاد نھتے خاں نے کہا :

"بھئی اس لڑکی نے تو لٹیا ڈبو دی ہے ——— کیوں ری کچھ تجھے خبر بھی ہے یہ کون ہیں ؟"

وہ بے پروائی کے ساتھ اپنے دوپٹے کا کونہ ہاتھ میں لے کر مروڑتی ہوئی بولی :

"نواب ہیں اور کون ہیں ؟"

"تجھے پتہ نہیں نوابوں سے کس طرح ملنا چاہیئے ؟"

"جب نوابوں کو پتہ نہیں کہ مجھ سے کس طرح ملنا چاہیئے تو میں یہ کیوں سوچوں ؟"

استاد سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

"بی سگن، اب بتاؤ، اس نے تو سارا کھیل بگاڑ دیا، غضب خدا کا نہ تین لاکھ کی اشرفیوں کی اسے پروا ہے، نہ زیورات جواہر نگار پر للچاتی ہے ——— آخر ہو کیا گیا سگن ؟"

سگن خود ہی حواس باختہ ہو رہی تھی۔ جس بیٹی کو اتنے لاڈ اور پیار سے پالا تھا۔ دفعتہً اس پر تشدد بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے استاد سے کہا :

"دراصل یہ جانتی نہیں، ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کیا ہے ؛ اور اس کی زندگی

ہمارا ویرانہ ایک مرتبہ پھر آباد ہو جائے، ہمارے اُجڑے ہوئے گلشن میں ایک دفعہ پھر بہار آ جائے، زندگی کے اتنے سال مایوسی کی تاریکیوں میں بھٹکتے ہوئے گزرے ہیں، چاہتی ہوں اُمید کا سورج چمکے، اور تاریکی کافور ہو جائے، ——————

استاد بول پڑے :

"یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں بھائی !"

وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی :

"ہاں یہ میری آرزو اور تمنا ہے، ——————

استاد پھر بول پڑے :

"اور میری ؛ میری نہیں ؟"

سگن نے سکون کے ساتھ کہا :

"ہم دونوں کی ! ——————

استاد نے بڑے فخر اور اطمینان کے ساتھ کہا :

"بے شک، بے شک !"

سگن نے رشتۂ سخن جوڑا، اور کہنے لگی :

"لیکن اگر امراؤ نہیں چاہتی، امراؤ کی مرضی نہیں ہے، تو استاد سُن لو، میں یہ اشرفیاں اور زیورات واپس کر دوں گی، اس پر ہرگز کسی طرح کی زیادتی نہیں کروں گی، نہ اس کی مرضی کے خلاف اسے مجبور کروں گی !"

یہ سُن کر استاد کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے،

"یہ بات ہے ——— ؟"

وہ نہایت اطمینان سے بولی :

"ہاں استاد !"

"کیا گھونٹ لے گی ؟"

"اپنا گلا" ــــــــــــــ

استاد کو چکّر سا آ گیا۔ انھیں اپنے دس ہزار کا غم بھی تھا، لیکن سب سے زیادہ غم سگّن کا تھا، انھوں نے سوچا تھا، یہ خاندان ایک مرتبہ پھر بھروماہ کی طرح چمکے گا، لیکن سوچا کیا تھا ہُوا کیا، کہنے لگے :

"سگّن مجھے سنبھالو، مَیں گِر رہا ہُوں، مَیں مر رہا ہُوں۔"

سگّن نے جو بالکل خاموش گویا مہر بہ لب بیٹھی ہوئی تھی، استاد کو سنبھالا، اور اپنے پاس فرش پر بٹھا لیا، استاد نے سوال کیا :

"اب کیا ہوگا سگّن ؟ ــــــــــــ کیا ہم لوگ خود کشی کر لیں ؟ بتاؤ تو سہی، نواب کو کیا جواب دے گی ؟"

اتنی دیر کے بعد سگّن نے بات چیت میں حصّہ لیا، کہنے لگی :

"بچّہ ہے، بھڑکتی ہے، ــــــــــــ تم نے بھی تو ایک دم ساری باتیں اُگل دیں اس کے سامنے ؟"

استاد نے اپنی گرتی ہوئی حالت پر قابُو پاتے ہُوئے کہا :

"یہ لو، خطاوار ہم ہی ہیں ؟"

سگّن نے استاد سے کہا :

"ایک بات سُن لو، کان کھول کر،

وہ بولے :

"ہاں سُن رہا ہُوں، خدا کے لیے جلد کہو !"

وہ کہنے لگی :

"بے شک مَیں چاہتی ہُوں کہ نواب صاحب کا، اور امراؤ کا تعلق قائم ہو جاتے،

"اہا ہاہا، اس پر نہیں آنچ آنے دوں گی، جیسے یہی تو ایک ماں ہیں ساری دُنیا میں!"

"یہی سہی، ——— اور کہہ لو جو جی چاہے!"

"تو صبر کر لُوں؟"

"ہاں اگر وہ نواب کو ناپسند کرتی ہے تو بات ختم!"

"پھر کیا ہوگا؟"

"اگر کبھی اس نے کسی کو پسند کر لیا تو اسے منظور کر لُوں گی!"

"تم تو بالکل نئی ریت ڈال رہی ہو، بھلا ہم لوگوں کے ہاں ہُوا ہے ایسا کبھی؟"

"نہیں، ——— لیکن میرے گھر میں تو یہی ہوگا!"

"مشکل تو یہ ہے کہ میں یہی باور نہیں کر سکتا کہ کہیں اور اس کی آنکھ لڑی ہے، آج تک گھر سے باہر تو اس نے قدم نکالا نہیں، نہ کوئی اور آدمی یہاں آیا؟"

"نہیں یہ کچھ نہیں، میرے خیال میں نواب کی کوئی بات اسے بُری لگی ہے، ہے ہمیشہ کی خود پسند بس رد کر دیا ہے چارے کو، دیکھیں اب کس کی قسمت جاگتی ہے؟"

"کسی اور ہی کی قسمت جاگے گی، نواب کو رد کر کے اس لڑکی نے تو اپنی قسمت پھوڑ لی!"

"کل تک انتظار کرو، دیکھیں زمرد اور نازو کیا بتاتی ہیں؟"

پھر اس نے امراؤ کو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا، اسے خوب سا پیار کیا، اور پیار بھرے لہجے میں پوچھا :

" بتا دے بیٹی تیری رضا کیا ہے؟ سچ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی! "

کچھ سوچتے ہوتے امراؤ نے کہا :

" آپ سے باتیں کرتے مجھے شرم آتی ہے، زمرد، یا نازو کو بلوا لیجئے، ان پر اپنا عندیہ ظاہر کر دوں گی، وہ آپ کو بتا دیں گی، پھر جیسا آپ کا جی چاہے؟ "

سگن نے ایک مرتبہ پھر اسے بھینچ کر پیار کیا اور کہا :

" ٹھیک ہے بیٹی، اب تو وقت نہیں رہا، صبح ان دونوں کو بلوا لوں گی۔ اب تو جاکر آرام کرلے! "

امراؤ کے جانے کے بعد سگن نے استاد سے کہا :

" خدا کا دیا اب بھی میرے پاس بہت کچھ ہے، ہاتھی لاکھ لٹے جب بھی سوا لاکھ ٹکے کا، مرتے مرتے اس کے لیے اتنا چھوڑ جاؤں گی کہ زندگی بھر پلاؤ قورمہ کھاتے گی، کسی کی محتاج اور دست نگر نہیں ہوگی،

استاد نے بیزاری کے ساتھ جواب دیا :

" ارے بھئی اس سے کون انکار کرتا ہے ——— اور خود میرے پاس جو کچھ ہے، اور آج تمھیں بتاتا ہوں کہ کم نہیں ہے، وہ بھی کس کا ہے؟ اس کی مالک بھی صرف امراؤ ہوگی لیکن میرا مطلب یہ تھا کہ خاندان تو تباہ و برباد ہوا! "

سگن نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا :

" مجھے خاندان کی تباہی منظور ہے، لیکن اپنی بچی کو تباہ نہیں کر سکتی، اس کے لیے میں سب کچھ تباہ کر دوں گی، لیکن اس پر آنچ نہیں آنے دوں گی! "

استاد نے جل کر گویا نقلاتے ہوئے کہا :

"حضور کی باتیں!"

"کیا غلط کہہ رہے تھے ہم؟"

"سرکار ذرا سوچیے تو، تین لاکھ کی اشرفیاں، کم سے کم ڈیڑھ لاکھ کے زرنگار جواہرات کیا ان چیزوں کو، ایک پیشہ ور عورت کی لڑکی، جسے بہر حال، آج یا کل پیشہ ور بننا ہے ٹھکرا سکتی ہے؟ یہ تو اتنی بڑی رقم ہے کہ عالی خاندانوں میں سے جس نواب زادی کو کہیے اغوا کر لاؤں!"

"بظاہر تمھاری بات درست معلوم ہوتی ہے، لیکن ——— امراؤ کا اندازِ بے رخی کلیجے میں برچھی کی طرح اترا جا رہا ہے!"

"یہ بھی ایک ادا تھی سرکار!"

"کیا کہا؟ ——— یہ بھی ایک ادا تھی؟"

"جی حضور ———"

"یعنی تمھارا مطلب ہے ———"

"جی میرا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کا انداز اختیار کر کے وہ آپ کی آتشِ شوق، اور آتشِ عشق کو اور زیادہ تیز کرنا چاہتی تھی، اور بلاشبہ وہ کامیاب ہوئی!"

"ہاں، کامیاب ہوئی، لیکن اس ادا کی کتنی بڑی قیمت وصول کر لی اس نے ———"

"جی ہاں اشرفیاں اور زیورات ———"

"بکومت ———"

"جی سرکار!"

"اشرفیوں اور زیورات کی اس کی ایک نگاہِ ناز کے بدلے میں کوئی قیمت نہیں ہے، میں ان چیزوں کی پروا نہیں کرتا!"

"پھر سرکار؟"

(۳)

ادھر تو یہ باتیں ہوئیں، اور استاد نتھے خاں میں ہو رہی تھیں، ادھر اپنے ایوان میں نواب صمصام الدولہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے، انھوں نے خاصہ نہیں نوش فرمایا، معمول کے مطابق شطرنج نہیں کھیلی، مصاحبوں کی مجلس میں بیٹھ کر بزم آرائی نہیں کی، خرابیٔ مزاج کا عذر کرکے سب کو رخصت کر دیا ———— اور سب کے جانے کے بعد حاتم مرزا سے پوچھا :

"حاتم مرزا اب کیا ہوگا ؟"

حاتم مرزا کا دل خود ڈوب رہا تھا، لیکن وہ نواب صاحب کا حوصلہ قائم رکھنا چاہتے تھے، کہنے لگے :

"ہوگا کیا حضور ؟"

"ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے امراؤ نے ہمیں رد کر دیا !"

"توبہ کیجیے، بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہیں !"

"کیا تم نے اس کی باتیں نہیں سنیں ———— ؟"

"سنی تھیں سرکار !"

"کتنی رکھائی اور بے رخی کا اظہار ہو رہا تھا، اس کی باتوں سے !"

حاتم مرزا کو زبردستی ہنسنا پڑا تاکہ ان کا اعتماد، نواب صاحب کی نظروں میں قائم رہے، خوب جی بھر کر مصنوعی ہنسی ہنس کر انھوں نے کہا :

عشق میں بڑی قوت ہوتی ہے، بس یہی ایک ایسی قوت ہے جس کا مقابلہ حُسن نہیں کر سکتا!"

"بے شک، بے شک!"

"ہمیں اسی قوت کا مظاہرہ کرنا ہے اور دیکھ لینا اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، تم نے وُہ شعر نہیں سُنا؟"

"کون سا شعر سرکار؟"

"بڑا مشہور، اور بہت عمدہ شعر ہے،

جذبۂ دل جو سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچّے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

امراؤ کچّے دھاگے میں بندھی ہوئی آئے گی ہمارے پاس!"

"یہ بات تو سرکار نے بالکل بجا ارشاد فرمائی! ——— پھر بھی غلام کی رائے ہے کہ دو تین دن رُک کر جائیے!"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"کم از کم اس کی ماں یہ سمجھے گی اس کی ہمیں پروا نہیں ہے، اور پھر وہ اپنا پُورا زور صرف کر دے گی ہماری تائید و حمایت میں!"

"(کچھ سوچ کر) اچھا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ کل نہ جائیں مگر پرسوں ضرور جائیں گے، خبردار ہمیں روکنے کی کوشش نہ کرنا! ——— ہاں خوب یاد آیا کل شاہ ذی جاہ کی عیادت کو بھی جانا ہے، وہ دردِ سر کی شکایت محسوس فرما رہے ہیں!"

" اس ادا سے اس نے میری جان پہ بنا دی، اگر تم نے اس وقت تسلی اور دل دہی کی باتیں نہ کی ہوتیں تو میں جان دے دیتا، زہر کھا کر خودکشی کر لیتا!"

" خدا کے لیے حضور ایسا نہ ارشاد فرمائیں!"

" حاتم مرزا تم نہیں جانتے ہم امراؤ کو کتنا زیادہ چاہتے ہیں!"

" لیکن سرکار ذرا صبر سے کام لیں!"

" یعنی ———"

" یعنی آپ خود بھی چند روز کے لیے اکڑ جائیں، اس طرف کا رخ بھی نہ کریں ——— دیکھ لیجیے گا، دو ہی ایک دن میں ماں بیٹی ناک رگڑتی سر کے بل حاضر ہوں گی!"

" ہم یہ بھی نہیں چاہتے!"

" کیوں سرکار؟"

" ہم سے یہ دل گداز منظر نہیں دیکھا جائے گا! ——— ہم خود وہاں سر کے بل جانے کو تیار ہیں، اور ضرور جائیں گے!"

" آپ تشریف لے جائیں گے؟"

" ہاں حاتم مرزا!"

" اس میں سبکی ہے سرکار کی، سرکار کی شان کے خلاف ہے!"

" حاتم مرزا تم بڑے بے وقوف ہو، بھلا حسن کی سرکار میں کس کی شان چلتی ہے؟ کون سبکی محسوس کر سکتا ہے؟ ہم کل ہی جائیں گے؟"

" کل ہی ———"

" ہاں، ——— اور ہر روز جاتے رہیں گے!"

" ہر روز جاتے رہیں گے؟"

" ہاں، ——— تاکہ اس کا پتھر سا دل اپنے طرز عمل سے موم کر دیں، تم نہیں جانتے،

نازو کہا :

" اچھا بھائی یہ ہنسی دل لگی کی باتیں پھر بھی ہو لیں گی، ذرا کچھ کام کی باتیں، ہو جائیں پہلے ———— ! "

زمرّد نے بھی تائید کی، کہنے لگی :

" بہت ضروری باتیں ہیں ذرا توجہ سے سنو ! "

امراؤ اب تک لیٹی ہوئی تھی، اب اٹھ کر بیٹھ گئی، کہنے لگی :

" ارشاد فرمائیے، بندی سُن رہی ہے گوشِ ہوش سے ! "

نازو نے کہا :

" نواب صمصام الدولہ جیسے عالی مرتبت اور خوب صورت و خوب سیرت شخص کو تم نے ناپسند کر دیا ؟ ———— حد ہے حماقت اور نادانی کی ! "

جواب دینے کے بجائے امراؤ نے زمرّد کی طرف دیکھا اور کہا :

" تمھیں بھی جو کچھ کہنا ہے، کہہ ڈالو، تاکہ جواب الگ الگ نہ دینا پڑے، ایک ہی دفعہ میں دے دُوں ! "

زمرّد بولی :

" جو کچھ نازو نے کہا ہے، ٹھیک کہا ہے، ———— اس کے سوا مجھے کچھ اور نہیں کہنا ہے ! "

امراؤ نے کہا :

" تو اب میرا جواب سُن لو ! "

زمرّد اور نازو نے بیک آواز کہا :

" وہی تو ہم سُننا چاہتے ہیں ! "

امراؤ نے کہا :

(۴)

سگّن نے زمرّد اور نازو کو بُلایا، اور رو رو کر امراؤ کی خود سری کی کہانی بیان کی، اور فرمایا :

"میری بچّیو، خدا کے لیے اس نادان کو راہِ راست پر لاؤ، نواب صمصام الدولہ جیسے آدمی کو ہاتھ سے نہیں جانا چاہیئے۔"

نازو نے ذمّہ اٹھایا :

"خالہ جان، آپ فکر نہ کیجیے، وہ ذرا ہٹیلی ہے، میں اسے چند باتوں میں راہِ راست پر لے آؤں گی!"

یہی وعدہ زمرّد نے بھی کیا، سگّن نے دونوں کی بلائیں لیں، دعائیں دیں اور کہا :

"تمھارے منھ میں گھی شکر، میری بچّیو، بس یہ کام کر دو!"

زمرّد، اور نازو سگّن سے رخصت ہو کر امراؤ کے کمرے میں گئیں، وہ اپنے کمرے میں مسہری پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، نازو نے جاتے ہی کتاب ایک طرف پھینکی، اور اس کے پاس بیٹھ گئی، زمرّد بھی اس کے پہلو سے پہلو ملا کر بیٹھ گئی، اور کہنے لگی :

"مہمانوں کا اس طرح استقبال کیا جاتا ہے؟"

امراؤ ہنس پڑی، کہنے لگی :

"اوہو، ——— آئیے مہمان صاحب، سر آنکھوں پر تشریف رکھیے!"

کام نہیں کرسکتی، اور اس "تعلق" والی بات سے زیادہ گھناؤنی بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا!"

دونوں حیرت سے امراؤ کو دیکھ رہی تھیں اور وہ کہہ رہی تھی:

"ایک بات ضرور ہے، مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنے سوا کسی کو بدل سکوں، نہ اپنی برادری کو اس راہ پر لاسکتی ہُوں، نہ دوسرے امیروں اور رئیسوں کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہوسکتی ہُوں کہ "تعلق" بازی کا سلسلہ ختم کردیں، تم نے سچ ہی کہا، یہ کام ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا، مَیں صرف اتنا کرسکتی ہُوں، وہ بھی اس لیے کہ معاشرے اور سوسائٹی میں ہماری کوئی جگہ نہیں ہے کہ ناچ گاکر، کچھ کما لیا کروں اور مجھے یقین ہے، اس طرح کافی کمالُوں گی ———— باقی رہا، "تعلق" سو یہ اَن ہونی بات ہے!"

بڑے رازدارانہ لہجے میں اپنائیت کے ساتھ نازو نے کہا:

"کمبخت وہ تجھ سے عشق کرتا ہے، دیکھ تو سہی کیا کیا دے گیا ہے، اور کیا کیا دینے کو تیار ہے!"

"جو کچھ دے گیا ہے، اور جو کچھ دینے کو تیار ہے، اس کی میری نظر میں کوئی وقعت نہیں، رہا عشق، تو سفید جھوٹ بولنے سے کیا حاصل؟"

"کیا وہ عشق نہیں کرتا تم سے؟"

"بالکل نہیں کرتا!"

"جھوٹی ہو، کرتا ہے!"

"تم جھوٹی ہو، بالکل نہیں کرتا!"

"اچھا اس کے عشق کا امتحان لے لو، کوئی بڑی سے بڑی چیز مانگو، اور دیکھو ہر قیمت پر پیش کرتا ہے یا نہیں!"

"دیکھو بھئی ایک بات اٹل ہے، وہ نواب صمصام الدولہ ہوں یا حضرت جان عالم واجد علی شاہ، یا کوئی عالی مرتبت اور والاحشمت بزرگ، جہاں تک "تعلق" قائم کرنے کا سوال ہے، کسی قیمت پر بھی میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں، یہ نہیں ہو سکتا، نہیں ہو سکتا، کسی طرح نہیں ہو سکتا!"

زمرد اور نازو نے حیرت بھری نظروں سے امراؤ کو دیکھا —— اور کہنے لگیں:

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

وہ بولی:

"کہہ نہیں رہی ہوں، اپنا فیصلہ سُنا رہی ہوں، مجھے مجبور کیا گیا تو زہر کھالوں گی، یا چھت سے نیچے چھلانگ لگادوں گی، لیکن "تعلق" والی بات نہیں ہو سکتی!"

زمرد نے کہا:

"لیکن، یہ تو ہمارا خاندانی پیشہ ہے، ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے، اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا!"

نازو بولی:

"ظاہر ہے ہم اپنا پیشہ ترک کر دیں تو کھائیں کیا؟"

وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی:

"بی نازو، تمھاری بات کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو زندگی بھر دال روٹی کھانے کو میرے پاس ہے۔ دوسرے یہ کہ آدمی جب کوئی اٹل فیصلہ کرتا ہے تو اس کی قیمت ادا کرنے کو بھی تیار رہتا ہے، یقین کرو، میں فاقے کر کے بھی گزارا کر سکتی ہوں —— ! رہا بی زمرد تمھاری بات کا جواب، تو میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ جس پیشے کا بڑی عظمت اور تقدس کے ساتھ تم نے نام لیا ہے، میں اس سے نفرت کرتی ہوں، میں کوئی گھناؤنا

"یہ کیوں ——؟"

"آخر 'تعلق' میں، اور شادی میں فرق کیا ہے؟ —— وہی حقوق و مراعات تمھیں حاصل ہوں گے، جو ایک بیوی کو حاصل ہوتے ہیں، بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ، پھر آزادی الگ، اگر دل نہ ملے، یا کوئی شکایت ہو تو الگ ہو جاؤ!"

"مجھے ایسی آزادی نہیں چاہیئے!"

"تو تم شادی کرو گی؟"

"ہاں ——"

"اور اگر وہ ہاتھ سے نکل گیا؟"

"کل کا نکلتا آج اور ابھی نکل جائے، پروا کس کو ہے؟"

"اچھا اب ہم تمھارا ایک امتحان لیتے ہیں!"

"ضرور، شوق سے!"

"اگر کوئی غریب، لیکن شریف آدمی تم سے شادی پر آمادہ ہو، تو کیا اپنی امارت اور شہرت کو لات مار کر —— اپنے فن اور کمال سے دست بردار ہو کر اس سے شادی کر لو گی؟ —— کیوں کہ کوئی شوہر یہ نہیں برداشت کر سکتا کہ اس کی بیوی ناچے گائے!"

میرا جواب ہاں میں ہے!"

"اری پگلی، تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

"ہُوا تمھیں ہے یا مجھے؟"

"ہمیں کیوں؟"

"استاد، اور اماں سمیت تم سب کی کوشش یہ ہے کہ میں حرام کاری

"امتحان لے سکتی ہوں، لیکن بڑی چیز مانگ کر نہیں!"

"یہی سہی، لو امتحان، بتاؤ کس طرح امتحان لینا چاہتی ہو؟"

"صرف ایک سوال کر کے!"

"کیا ہے وہ سوال؟"

"مجھے یہ تین لاکھ کی اشرفیاں نہیں چاہئیں واپس لے جائیے۔ مجھے ڈیڑھ لاکھ کا زیور نہیں چاہیئے، اسے بھی واپس کر لے، مجھے گاؤں گراؤں بھی نہیں چاہیئے۔ مجھے پاندان کا ہزاروں ماہوار کا خرچ بھی نہیں چاہیئے،"

"خدا کی بندی آخر تمہیں چاہیئے کیا؟"

"بس اتنا کہ مجھ سے شادی کر لے، اور شوہر کی حیثیت سے میرے نان نفقہ کا بوجھ برداشت کرے!"

نازو نے دانتوں تلے انگلی داب لی۔ اور کہا:

"ہائے اللہ شادی، ————"

زمرد نے سراپا حیرت و استعجاب بن کر کہا:

"غضب خدا کا شادی، ———— جو بات ہمارے خاندان میں کبھی نہیں ہوئی تم وہ چاہتی ہو؟"

سکون اور اطمینان کے ساتھ امراؤ نے جواب دیا:

"بھئی جو چاہو کہہ لو، اور جو چاہو سمجھو، پر نالہ وہیں گرے گا، اس کے سوا اس کے عشق کا میں کسی اور طرح امتحان نہیں لے سکتی!"

"اور اگر وہ تیار ہو جاتے!"

"تو میں بھی تیار ہوں!"

"یہ تو محض لفظی ہیر پھیر ہے!"

"تمھیں یہ باتیں کس نے سکھائیں؟ پہلے تو تم ایسی نہ تھیں؟"

"بتادوں؟"

"ہاں، ـــــــ تمھیں ہمارے سر کی قسم!"

"کچھ دن ہوئے، میں نے ایک کتاب پڑھی تھی، اس میں لکھا تھا، کہ جو عورتیں، حرام کے راستے پر چلتی ہیں، وہ جہنّم کا ایندھن بنتی ہیں، جو مرد، حرام کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ کندۂ جہنّم بنتے ہیں، پھر بڑی عبرت انگیز، اور سبق آموز مثالیں تھیں، جنھیں پڑھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، اس وقت میں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ راستہ نہیں اختیار کروں گی!"

"واہ بھئی واہ عجب تماشا ہے ـــــــ سگّن کی لڑکی اور مُلّانی!"

"کاش تم بھی یہی راستہ اختیار کرلو!"

"ناجائی اپنے میں یہ ہمّت نہیں!"

"تو میرے راستے کا پتّھر نہ بنو، مجھے میرے طریقے پر چلنے دو!"

"اچھا بھئی جو چاہو کرو ہمیں کیا، ـــــــ ہم تو پیامی بن کر آئے تھے، جاکر خالہ جان کو بتائے دیتے ہیں سب کچھ!"

"ہاں، ـــــــ میں نے خود اماں سے کہا تھا کہ آپ سے اس مسئلے پر گفتگو کرنا میں مناسب نہیں سمجھتی۔ زمرّد اور نازو کو بُلا لیجیے۔ انھیں اپنا عندیہ سمجھا دوں گی ـــــــ اب تم سے ایک درخواست ہے!"

"وہ بھی کہہ ڈالو لگے ہاتھوں ـــــــ ہاں کیا درخواست ہے؟"

"اب کبھی میرے پاس مجھے سمجھانے نہ آنا، اور اماں جی کو بے کم و کاست یہ ساری باتیں بتادینا!"

"ایسا ہی ہوگا، ! ـــــــ لیکن ویسے تو آنے کی

کی زندگی بسر کروں، حالانکہ تم سب اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو ———— کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے ؟"

" او ہو، بڑی آئیں اسلام کا نام لینے والی، ———— پھر تو تمھیں کسی مولوی کی بیٹی ہونا چاہیئے تھا!"

" طعن وتعریض سے کام نہیں چل سکتا، جو کچھ مجھے کہنا تھا، کہہ دیا مَیں نے، اس میں نہ اضافہ کر سکتی ہُوں نہ کمی!"

" واہ بھئی، عجیب بے دماغ سے پالا پڑا ہے، ———— آج تک تو ہماری برادری میں ———— کسی لڑکی کو یہ نئی بات سُوجھی نہیں تھی!"

" اب سہی!"

" لوگ کیا کہیں گے؟ ———— برادری والے کیا کہیں گے؟ یہ تو سوچ خالہ جان ———— سگن ———— کیا منھ دکھائیں گی، برادری والوں کو؟"

" یہ میں نہیں جانتی ———— مَیں اماں جان کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہوں، لیکن ان کی خاطر جہنّم کا ایندھن بننے پر تیار نہیں ہو سکتی ———— کسی طرح بھی نہیں!"

" (ایک آہِ سرد بھر کر) تو یہ خاندان گیا ہمیشہ کے لیے!"

" تم خاندان کو لیے پھرتی ہو؟ ———— حکومتیں ختم ہو جاتی ہیں ———— قومیں ختم ہو جاتی ہیں!"

" خدا کے لیے ایک بات تو بتا دو میری بہن!"

" ایک نہیں، دس ———— پوچھ کر تو دیکھو؟"

(۵)

استاد نیتھے خاں، اور سگّن ہمہ تن چشمِ انتظار بنے بیٹھے تھے کہ زمرّد اور نازو آئیں، اور ان سے اصل ماجرا معلوم ہو۔

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور یہ دونوں لڑکیاں آئیں، لیکن دونوں کے چہروں پر ناکامی کے اثرات نمایاں تھے، یہ کیفیت دیکھ کر استاد، اور سگّن دونوں کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے، پھر بھی یہ اشتیاق بہر حال کام کر رہا تھا، کہ آخر بات کیا ہوئی ؟"

دونوں لڑکیاں آئیں، اور خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

کچھ دیر تک خاموشی رہی!

حاضرین میں سے کسی کو حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کر سکے۔

آخر استاد نیتھے خاں کی ہمّت کام آئی، انھوں نے دونوں سے مخاطب ہو کر دریافت کیا :

"کیا کر آئیں ؟"

زمرّد تو اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی،

"وہ نہیں مانتی کسی طرح !"

یہ مبہم سا جواب سُن کر استاد کو غصّہ آگیا۔

"یہ کون سی نئی بات سنائی ہے تم نے ؟ اتنا تو ہم بھی جانتے تھے، ارے بھئی

اجازت ہے ؟"

"کیوں نہیں ، ـــــــ گوشت سے ناخن تو جُدا نہیں ہو سکتا ، ہمارے جو تعلقات ہیں ، وہ ہم کسی راستے بھی چلیں ختم نہیں ہو سکتے !"

"اچھا ، ـــــــــــــــ لیکن بڑا صدمہ ہو گا بے چاری سگن خالہ کو !"

"اسی لیے تو مَیں نے تمھارے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہے۔ میری ہمّت نہیں پڑی ان سے باتیں کرنے کی !"

ورنہ آج تک ہمارے ہاں کسی لڑکی کے دل میں شادی کا خیال پیدا ہوا تھا؟"

"البتہ وہ ایک بات کے لیے تیار ہے!"

"(انتہائی اشتیاق کے ساتھ) وہ کیا؟"

"جس معاشرے سے اس کا تعلق ہے، چونکہ اسے نہیں بدل سکتی، لہٰذا جب تک شادی نہ ہو جائے، اس حد تک ناچنے گانے پر تیار ہے کہ خرچ چلتا رہے لیکن شادی کے بعد اس کام کو بھی ترک کر دے گی!"

"(انتہائی برہمی کے عالم میں) نہایت احمق ہو تم بخدا!"

"کیوں استاد، کیا غلطی ہوئی بندی سے؟"

"غلطی یہ ہوئی کہ اس مہمل اور بے تکی بات کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی —— مگر ہاں بیٹی ایک بات تو بتاؤ!"

"جی استاد، ——"

"یہ بھی تو اس نے بتایا ہو گا کہ یہ بے تکا خیال کیسے آیا اس کے دل میں؟"

زمرّد نے کہا:

"بتا تو رہی تھی!"

استاد نے جھلا کر پوچھا:

"تو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیوں بیٹھی ہو؟ اصل بات کا ذکر ہی نہیں، ادھر ادھر کی انٹ شنٹ باتیں ہو رہی تھیں!"

زمرّد بھی جل گئی، استاد کے اس خواہ مخواہ کے غصے سے، —— اس نے نازو سے کہا:

"تم بتاؤ!"

نازو نے کہا:

یہ بتاؤ کہ اصل ماجرا کیا ہے؟ کیا کہتی ہے؟ کیا سبب بیان کرتی ہے؟"

اس مرتبہ نازو نے بات شروع کی :

"وہ تو عجیب بات کہتی ہے!"

استاد نے زور سے اپنے زانو پر ہاتھ مارا۔

"ہائے ——— وہی پہیلیاں، خدا کے لیے صاف صاف کہو۔"

نازو نے آخر ہمت کر کے کہا :

"وہ کہتی ہے، خواہ نواب صمصام الدولہ ہوں، یا جانِ عالم (واجد علی شاہ) کسی سے بھی کروڑوں روپے لے کر بھی میں "تعلق" نہیں قائم کر سکتی، ———

"تو کیا نکاح کرنا چاہتی ہے؟"

"ہاں، ——— خواہ وہ کوئی غریب آدمی کیوں نہ ہو!"

"یا اللہ یہ میں کیا سُن رہا ہُوں؟"

"وہی جو اس نے کہا۔"

"نکاح ———

"وہ کہتی ہے، حرام کاری کی زندگی بسر کر کے، چند روزہ زندگی عیش و عشرت میں کاٹ دوں، اور مرنے کے بعد کی نہ ختم ہونے والی زندگی جہنم میں بسر کر دوں، یہ نہیں ہو سکتا، یہ نہیں کر سکتی!"

استاد نتھے خاں نے سگّن کی طرف دیکھا اور فرمایا :

"سُن لیا، حضرت مولانا نے کیا فرمایا ہے؟ ——— لاؤ وہ اشرفیاں اور زیور واپس کر آؤں جا کر صمصام الدولہ کو، بازار سے ایک مصلّی اور تسبیح منگواؤ اور بھیج دو صاحبزادی کو ——— مَیں تو کہتا ہوں یہ کمبخت صمصام الدولہ کا بچّہ خود ہی منحوس ہے، خود بھی بغلیں جھانکتا رہ گیا، اور ہمیں بھی کہیں کا نہ رکھا،

تم اس کی شادی پر بھی تیار ہو ؟"

" ہاں بے شک !"

" کس کے ساتھ ؟"

" کسی بھی شریف آدمی کے ساتھ خواہ وہ کنگال کیوں نہ ہو !"

" شاباش، واقعی ماں بیٹی کا جواب نہیں ! ــــــــــ توجاؤں مبارکباد دے آؤں جاکر صاحبزادی کو ان کے اس جنتی فیصلے پر !"

سب سے پہلے میرا حق ہے، پھر آپ کی باری آئے گی !"

استاد ننھے خاں پر اس وقت تقریباً جنون کی کیفیت طاری تھا، انھوں نے سگن کو جواب نہیں دیا، حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

سگن نے نازو اور زمرد سے کہا :

" بیٹی، ذرا امراؤ کو بلا تو لاؤ میرے پاس !"

ذرا دیر میں امراؤ ماں کے سامنے کھڑی تھی !

استاد اسے خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے، بس چلتا تو گلا گھونٹ دیتے اس نالائق کا ابھی۔

سگن نے محبت اور شفقت کی نظر بیٹی پر ڈالی اور پیار بھرے لہجے میں کہا :

" آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ !"

وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی، سگن نے اس کے گال پر بوسہ دیا، آنکھیں چومیں، پیشانی پر پیار کیا، پھر کہا :

" بیٹی مجھے تیرا فیصلہ دل وجان سے منظور ہے !"

امراؤ ماں سے لپٹ گئی، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا :

" میری امّاں !"

"کسی کتاب کا ذکر کر رہی تھیں کہ اس میں اس طرح کی زندگی بسر کرنے کے خلاف اتنا عبرت انگیز بیان تھا، اور ایسی سبق آموز مثالیں تھیں کہ پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے ان کے، اور اسی وقت طے کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے، یہ زندگی ہرگز نہیں بسر کرنا ہے —— !"

استاد نے اسی جھلاہٹ کے عالم میں کہا :

"کہاں ہے وہ کتاب ؟ —— مجھے مل جائے تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں! اس لیے کہتا ہوں لڑکیوں کو پڑھنے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اس طرح کی لغویات پڑھ کر گمراہ ہوتی ہیں اور ہاتھ سے نکل جاتی ہیں —— لاحول ولا، !"

گگن ہنس پڑی، اور کہنے لگی :

"استاد تم تو اس وقت ہوا سے لڑ رہے ہو !"

وہ اسی جھلّاتے ہوئے لہجے میں بولے :

"یہ داستانِ درد سن کر رونے کے بجائے آپ میرا مذاق اڑا رہی ہیں ؟ —— چہ خوش —— !"

گگن نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا :

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں، کسی طرح کا جبر اور تشدّد اپنی بچّی پر نہیں کروں گی، وہ ناچ گانے کے فن سے بھی کچھ نہ کمائے۔ مجھے نہ ضرورت ہے، نہ پروا، اللہ کا دیا میرے پاس اتنا ہے کہ وہ آرام سے اپنی زندگی بسر کر لے گی !"

"یعنی تم اس کے ساتھ ہو ؟"

"میں تو اس کے ساتھ جہنّم میں جانے کو بھی تیار ہوں، اس نے تو جنّت کا راستہ اختیار کیا ہے، کیوں اس کا ساتھ نہ دوں گی !"

"واہ رے انقلابِ چرخِ گردوں، واقعی دنیا میں سب کچھ ممکن ہے —— کیا

جس وقت سگن کے ہاں یہ ہنگامہ ہو رہا تھا، ٹھیک اسی وقت نواب صمصام الدولہ جانِ عالم (واجد علی شاہ) کی مزاج پُرسی اور عیادت کے لیے ان کے حضور میں حاضر تھے۔

جانِ عالم سے نواب صمصام الدولہ نے کہا :

"غلام یہ خبر سُن کر وقفِ اضطراب ہے کہ جانِ عالم دردِ سر میں مبتلا ہیں ——————
اب کیسا مزاج ہے عالی جاہ کا ؟"

نواب صاحب کے ان الفاظ پر، جانِ عالم مسکرائے، پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر، اپنی مسہری پر پائنتیوں بٹھا لیا، یہ بہت بڑا اعزاز تھا، جس پر نواب صاحب کے فخر کا یہ عالم تھا کہ —— —— جان نذر دینی قبول گیا اضطراب میں !

جانِ عالم نے فرمایا :

"ہاں کل ہمیں دردِ سر کی کچھ شکایت تھی، لیکن حکیم شفاء الملک کی دوا تیر بہدف ثابت ہوئی فوراً افاقہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے درد تھا ہی نہیں !"

نواب صاحب نے شفاء الملک کی تعریف میں قصیدہ پڑھتے ہوئے کہا :

"انھیں تو سرکار کی طرف سے مسیح الملک کا خطاب ملنا چاہیئے !"

"(ہنس کر) بہت عمدہ تجویز ہے، یہ خطاب ان کے لیے ہو گیا !"

"بے شک وہ اسی کے سزاوار تھے !"

اتنے میں حکیم شفاء الملک صاحب بھی تشریف لے آئے، آتے ہی انھوں نے

پھر وہ ہچکیاں اور سسکیاں لے کر رونے لگی۔ بگّن نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

" اری پگلی روکیوں رہی ہے ؟ مجھے تو ناز ہے تیرے فیصلے پر، شاید تیرے اسں فیصلے کو مان لینے سے میرے گناہ بھی دُھل جائیں، مَیں تجھے دل سے مبارکباد دیتی ہُوں کہ تُو نے ایسا نیک فیصلہ کیا، اور اس پر اڑ گئی ورنہ یہ ساری زندگی گناہ ہی گناہ میں گزر جاتی، ——— اچھی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، جو خود بھی نیک راستہ اختیار کر کے اپنی عاقبت سنوار لیتی ہیں اور اپنی گنہگار، اور سرتاپا عصیاں شعار ماؤں کےلیے جنّت کا راستہ کھول دیتی ہیں ! "

زمرّد اور نازو، دم بخود بگّن کی یہ باتیں سُن رہی تھیں۔ دونوں میں سے کسی کو یہ توقع نہیں تھی کہ اس آسانی سے بگّن امراؤ کے فیصلے کو قبول کرے گی اور سب سے زیادہ دیدنی اور مضحکہ خیز حالت استاد نتھّے خاں کی تھی کہ ——— گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل ——— کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کریں ؟ کیا کہیں ؟

◎

نواب صمصام الدّولہ کا دل یہ باتیں سُن کر ڈوبنے لگا، جی چاہا اپنے معاشقے کا اظہار کر دیں، لیکن ہمّت نہ پڑی، اتنے میں جانِ عالم نے فرمایا :

"کیا تم اسے جانتے ہو صمصام الدّولہ ——— ؟"

وہ بولے :

"جی نہیں، غلام نے بھی ذکر تو اس کا سُنا ہے، لیکن دیکھا نہیں ہے ——— لوگ مبالغے کے عادی ہوتے ہیں - میرے خیال میں تو معمولی صوُرت شکل کی عورت ہے۔ رہا ناچ گانا تو وہ بھی تھوڑا بہت آتا ہوگا !"

"بہرحال ہمارے دل میں اشتیاق پیدا ہوگیا ہے اسے دیکھنے کا !"

"جی ———"

"اگر وہ ایسی ہی ہے، جیسا ہم نے سُنا ہے تو ہم اسے اپنے پری خانے کی زینت بنائیں گے، اور اس کا گراں قدر مشاہرہ مقرر کردیں گے، اور انعام و اکرام سے وقتاً فوقتاً نوازتے رہیں گے !"

یہ باتیں سُن نواب صمصام الدّولہ کی جان پر بنی جارہی تھی، جی چاہتا تھا یہیں، اور اسی وقت خود کشی کر لیں، لیکن آدابِ شاہی مانع تھا۔ نہ کچھ کر سکتے تھے، نہ کہہ سکتے تھے، اتنے میں جانِ عالم نے سوال کیا :

"تمھاری کیا رائے ہے ؟"

"غلام کیا رائے دے سکتا ہے ؟"

"یعنی ہمارے اس فیصلے کے بارے میں کیا رائے ہے ؟"

"شاہانہ فیصلوں پر کس کی مجال ہے کہ اعتراض کر سکے !"

"تو اب ضرورت اس کی ہے کہ امراؤ کو قیصر باغ ——— شاہی محل ——— میں بُلوایا جائے، ہم بذاتِ خود اُس کے حسُن و جمال کا مشاہدہ

نبض دیکھی، اور فرمایا :

"اب خدا کے فضل سے سرکار بالکل تندرست ہیں!"

جانِ عالم نے کہا :

"وہ تو آپ کی پہلی ہی خوراک سے ہم اپنے آپ کو بالکل تندرست محسوس کرنے لگے ابھی صمصام الدولہ سے یہی باتیں ہو رہی تھیں ——— انھوں نے ایک تجویز پیش کی ہے اور اس جانب نے اسے منظور بھی کر لیا ہے!

بڑے اشتیاق کے ساتھ شفار الملک صاحب نے پوچھا :

"کون سی تجویز عالی جاہ ———؟"

جانِ عالم نے فرمایا :

"ان کی ——— صمصام الدولہ ——— رائے یہ ہے کہ تمھیں مسیح الملک کا خطاب دیا جائے۔ ہم نے یہ تجویز منظور کر لی، آج سے تم مسیح الملک ہو!"

مسیح الملک سروقد کھڑے ہو کر آداب بجا لائے، پھر ایک خلعت دربارِ شاہی کی طرف سے مرحمت ہوا، اور دو ہزار نقد دیئے گئے۔

مسیح الملک جب اس مالِ غنیمت سے لدے پھندے واپس چلے گئے تو جانِ عالم نے رازدارانہ لہجے میں نواب صمصام الدولہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا :

"گزشتہ چند روز سے امراؤ کا ذکر بار بار ہمارے گوش گزار کیا جا رہا ہے!"

نواب صمصام الدولہ کا دل دھڑکنے لگا کہ خدا خیر کرے ——— اتنے میں جانِ عالم نے فرمایا :

"اس کے حُسن و جمال کی تعریف بھی بہت زیادہ سُننے میں آئی ہے، اور اس کی نغمہ سرائی کو تو لوگ سحر سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے رقص کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہمارے سارے مُلک میں اس کا ثانی نہیں،

"بس تو اب یہ تمھارا کام ہے کہ اسے لے کر ٹھیک وقت پر حاضرِ دربار ہو جاؤ!"

"غلام اس کی پوری کوشش کرے گا۔"

پھر تھوڑی دیر تک جانِ عالم نے کچھ اور باتیں کیں نواب صاحب سے ۔ ——— اس کے بعد رخصت کر دیا۔

جانِ عالم کو واقعی نہیں معلوم تھا کہ صمصام الدّولہ امراؤ پر ہزار جان سے عاشق ہیں اور اسے اپنانے پر تُلے ہوئے ہیں، ورنہ وہ نہ اسے بُلاتے، نہ پری خانے میں داخل کرنے کا ارادہ ظاہر کرتے۔ لیکن نواب صاحب کے ایک رقیبِ دیرینہ نواب میرن صاحب اس فکر میں رہتے تھے کہ جانِ عالم کو، صمصام الدّولہ سے بدظن کر دیں۔ اس کی ترکیب انھوں نے یہ سوچی کہ امراؤ کا ذکر زیادہ سے زیادہ مداحانہ الفاظ میں جانِ عالم کے سامنے کر دیں کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ صمصام الدّولہ امراؤ پر عاشق ہیں!

◎

کریں، اور رقص و موسیقی کے فن سے بخوبی واقف ہیں [۱] اس لیے ہمیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ واقعی ناچنا گانا جانتی ہے یا نہیں ؟"

"جی بے شک !"

"ہماری نظر میں اس کام کے لیے سب سے زیادہ اہل اور موزوں شخص تم ہو !"

"(انتہائی بےبسی کے ساتھ) غلام ؟"

"ہاں تم ! ———— کیا تم نہیں جانتے، ہم تمھاری کتنی قدر کرتے ہیں، اور ہمارے دل میں تمھاری کتنی جگہ ہے !

"بے شک غلام کو اس پر ہمیشہ فخر رہے گا !"

"یہی وجہ ہے کہ امورِ مہمّہ ، ہمیشہ ہماری طرف سے تمھی کو سپرد کیے جاتے ہیں !"

"(انتہائی بدحواسی کے عالم میں) غلام کو اس پر بھی فخر ہے !"

"ہماری رائے ہے کہ تم امراؤ کے ہاں جاؤ ———— کل ہم نے ایک جشن کا انتظام اپنی صحت یابی کی خوشی میں کیا ہے، اس میں کئی طائفے بلائے گئے ہیں، اس موقع پر امراؤ کو بھی یہاں ہونا چاہیئے !"

"(تقریباً روتے ہوئے) غلام اسے جاکر شاہی پیام دے اور اپنے ساتھ جاکر لائے ؟"

"ہاں صمصام الدّولہ، اور کیا مطلب ہوسکتا ہے ہماری ان باتوں کا ؟"

"(کلیجے پر پتھر کی سل رکھ کر) غلام حکم کی تعمیل کرے گا !"

"۸ بجے رات کو جشنِ طرب شروع ہوگا، اور ہمارا خیال ہے صبح تک جاری رہے گا ———— یہ بہترین موقع ہے امراؤ کے امتحان کا !"

"بے شک عالی جاہ !"

---

[۱] : واجد علی شاہ، فنونِ لطیفہ میں سے رقص اور موسیقی کے نہ صرف قدر شناس تھے، بلکہ فنّی طور پر بھی ان فنون میں استادانہ مہارت رکھتے تھے۔

"کیوں استاد، کیا ایسی لڑکی، جیسی ہماری امراؤ ہے کہ اتنی بڑی دولت پر لات مار دی، کہیں ملے گی ؟"

وہ قصیدہ پڑھتے ہوئے بولے :

"اجی نہ ایسی لڑکی ملے گی، نہ ایسی ماں، جو اتنے تباہ کن فیصلے کو ہنسی خوشی مان لے !"

وہ بولی :

"استاد تباہ کن نہ کہیے، یہ معمولی سی دولت ٹھکرا کر ہم نے بہت بڑی، کہیں زیادہ قیمتی اور کبھی نہ ختم ہونے والی سوغات حاصل کر لی ہے !"

وہ متحیّر ہو کر سگن کو دیکھنے لگے پھر پوچھا :

"سوغات ؟"

سگن نے کہا :

"جنّت سے بڑی سوغات کیا ہو سکتی ہے ؟ ——— ایمان سے کہنا استاد !"

وہ اپنی برہمی کو چھپاتے ہوئے ——— اس لیے کہ سگن سے تعلقات بہرحال رکھنے تھے، بولے :

"ہاں بے شک ——— واقعی اس سے بڑی سوغات کیا ہو سکتی ہے ؟"

سگن کہنے لگی :

"سچ پوچھو تو خود میرے دل میں ایک عرصے سے اس وضاحت کے ساتھ تو نہیں، مگر یہ خیال آ رہا تھا، میں سوچا کرتی تھی، ہم نے دولت بہت زیادہ کمائی، لیکن کھویا بھی بہت زیادہ۔ اور اب کہ امراؤ کے جشن نے دولت آفرینی کے وسائل و ذرائع بہت زیادہ پیدا کر دیئے تھے، رہ رہ کر میرے دل میں خیال آتا تھا، ——— کس راستے پر میں اپنی لڑکی

(۸)

امراؤ کے فیصلے کو قبول کر کے، استاد نتھّے خاں کے لیے، سگّن نے ایک بڑا دشوار مسئلہ پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اب بات ایسی منزل تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ عافیت اسی میں نظر آئی کہ ہتھیار ڈال دیں۔

تھوڑی دیر کے بعد، زمرّد اور ناز و واپس چلی گئیں۔ امراؤ اب تک ماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، سگّن نے استاد سے کہا:

"بس تو اب تم پہلے کام یہ کرو کہ اشرفیاں اور زیورات نواب صاحب کو شکریے کے ساتھ واپس کر آؤ!"

استاد نے آمادگی اور مستعدی کے ساتھ کہا:

"ہاں کر آؤں گا!"

"لیکن کب ——؟"

"تم بھی عجیب باتیں کرتی ہو، یہ کوئی وقت ہے، نوابوں اور امیروں کے ہاں جانے کا۔ اب یہ کام کل ہی ہوگا!"

سگّن نے زیادہ اعتراض نہیں کیا، کہنے لگی:

"اچھا کل سہی!"

پھر ان سے اپنے، اور بیٹی کے کارنامے پر داد حاصل کرنا چاہی —— چنانچہ پوچھا:

اس پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا :

"کیا بات ہے ری ؟"

وہ گھبراتے ہوئے لہجے میں بولی :

"نباب صاحب ــــــــــ

استاد چونکے :

"نباب صاحب کون بزرگ ہیں، ــــــــــ اری حرامزادی، یہ تیرے باپ کا نام ہے یا شوہر کا؟ اور کیا ہوا انھیں ؟"

وہ اپنے حواس پر قابو پاتی ہوئی کہنے لگی :

"وہی نباب صاحب، جن کے ساتھ ہماری بٹیا، ــــــــــ

اس سے زیادہ استاد نہ سُن سکے، مضطربانہ حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے :

"تو نواب صاحب کیوں نہیں کہتی ــــــــــ کیا وہ آئے ہیں ؟"

اصغری نے جواب دیا :

"ہاں وہی آئے ہیں !"

سگّن اور استاد استقبال کی تیاریاں کرنے لگے، امراؤ اپنے کمرے میں چلی گئی !

کو لیے جارہی ہُوں ؟ ــــــــــــ یہ راستہ کس طرف جاتا ہے؟ نیکی کی طرف، یا بدی کی طرف ؟"

"ہاں ضرور یہ خلش پیدا ہوتی ہوگی ضمیر میں !"

"میں سوچا کرتی تھی کہ میں نے جیسی تیسی زندگی گزار لی، لیکن امراؤ کو اس ڈھرّے پر کیوں لیے جارہی ہُوں ؟"

"بھئی خدا جب کسی کی عاقبت سنوارنا چاہتا ہے تو اس کے دل میں اس طرح کے خیالات پیدا کر دیتا ہے، ــــــــــــ مجھی کو دیکھ لو، ابھی ذرا دیر پہلے میں کتنا مخالف تھا،

لیکن اب استاد ؟"

"اب اپنے دل کو ٹٹولتا ہوں تو محسوس کرتا ہُوں کہ واقعی ہم گر رہے ہیں، گر رہے تھے خدا کا شکر ہے اس سے بچ گئے !"

"استاد اب ایک کام کرنا ہے تمھیں اپنی لڑکی کے لیے !"

"کون سا کام ؟ ــــــــ ضرور کروں گا !"

"اس کے لیے کوئی شریف بر تلاش کرو، مجھے دولت کی ہوس نہیں، بھلے سے غریب ہو !"

"اچھا بھائی یہ کام بھی کر لوں گا۔ اب تک تو یہ ہوتا آیا ہے کہ تم نے جس رستے چلایا ہے اس پر چلتا رہا ہُوں، اب کہ گور کنارے بیٹھا ہوں، اپنی یہ روش کیسے بدل دُوں !"

"خدا نہ کرے استاد، ابھی تم بہُت جیو گے !"

"مولا کی مرضی ہے جب تک چاہے رکھے، جب چاہے اٹھالے !"

"یہ تو سب کے ساتھ ہونا ہے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اصغری گھبرائی ہوئی آئی، اس کا سانس پھُول رہا تھا۔ سگّن نے

انھوں نے مسکراتے ہوئے بڑے قاتل انداز میں فرمایا :

" ارے بھئی کیا تھا وہ شعر ؟ ——— اے لوخوب یاد آیا :

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

بات کا رُخ بدلنے کے لیے سگّن نے کہا :

" استاد یہ شاعری تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے ۔ خیر سے نواب صاحب نے قدم رنجہ فرمایا ہے کچھ ان کی خاطر مدارات تو کر و ! "

وہ کھڑے ہو گئے : " ہاں ہاں ، بے شک ! "

لیکن نواب صاحب نے انھیں روکا ، اور فرمایا :

" نہیں ان رسمیات کی ضرورت نہیں ، میں اس وقت کچھ کھاؤں پیوں گا نہیں ، ایک بہت ضروری مسئلے پر بات کرنی ہے ، ——— لیکن دیوار ہم گوش دارد ۔ دروازے بند کر دیجیے : تاکہ ہماری باتوں کی بھنک کسی کے کانوں میں نہ پڑ سکے ! "

سگّن نے استاد کی طرف دیکھا ، اور کہا :

" استاد سُن رہے ہو ؟ "

وہ بولے : " ہاں کیوں نہیں ! "

یہ کہہ کر اٹھے اور دروازے اندر سے بند کر دیئے !

(۹)

نواب صمصام الدولہ تشریف لائے!
لیکن عجیب حالت تھی، چہرے کا رنگ اڑا ہوا، آنکھیں سُرخ، لبوں پر تھرتھراہٹ، ایسا معلوم ہوتا تھا، کسی بہت بڑی مصیبت سے دوچار ہیں۔
سگن اور استاد ننھے خاں، دونوں ان کی یہ کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے۔
سوچنے لگے آخر ماجرا کیا ہے؛ نواب صاحب کی یہ کیفیت کیوں ہے؛ یہ بات تو اُن کے وہم و گمان سے ماورا تھی کہ امراؤ کی نارضامندی کی اطلاع نواب صاحب کو ہو چکی ہے یہ خبر تو ابھی گھر کی گھر ہی میں تھی، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔
سگن نے پیشوائی کرتے ہوئے اور اپنے اوپر اہتزاز و مسرت کی مصنوعی کیفیت طاری کرتے ہوئے کہا:
"زہے قسمت کہ آپ نے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔"
نواب صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، استاد ننھے خاں کو اپنی قوتِ نطق و کلام کے اظہار کا موقع ملا، کہنے لگے:
"ارے بھئی زہے قسمت کیا چیز ہوتی ہے، وہ شعر پڑھو، وہی جو اس دن پڑھا تھا، اور بالکل حسبِ حال تھا!"
اس بے تکی بات پر سگن انھیں روک تو نہ سکی۔ البتہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی:

"پھر اس کے بارے میں، یعنی اس کے حُسن، رقص، اور نغمے کے بارے میں ساری تفصیلات ان تک کیسے پہنچیں؟ ——— یہ بہت اہم سوال ہے!"

استاد نتھے خاں بول پڑے:

"ہاں یاد آیا، ایک بات ہو سکتی ہے!"

نواب صاحب نے زبان سے تو کچھ نہیں پُوچھا، سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگے!

استاد نے فرمایا:

"حضور کو یاد ہو گا، اس جشن میں، جو یہاں ہُوا تھا، نواب میرن صاحب بھی تشریف لائے تھے!"

نواب صاحب نے جواب دیا:

"ہاں یاد ہے، ——— ہم سے کچھ ہی فاصلے پر بیٹھے تھے! مگر ان کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"سُنیئے تو سرکار، ——— ابھی حال کی بات ہے، کہ انھوں نے غلام کو یاد فرمایا، ———"

"انھوں نے آپ کو بلایا؟"

"جی ہاں، ——— غلام گیا، ———"

"کیا کہا انھوں نے؟"

"انھوں نے ارشاد فرمایا، ——— استاد یہ بتاؤ، امراؤ کے بارے میں ہماری دال بھی گل سکتی ہے یا نہیں؟ جو مانگو گے پاؤ گے!" ——— حضور ہم لوگ لاکھ غریب، اور پست سہی، لیکن اپنی ایک آن رکھتے ہیں، جانتے ہیں، وضع داری

(۱۰)

سگّن اور استاد نتھّے خاں دونوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ آخر وُہ کون سی راز کی بات ہے جو اتنے اہتمام کے ساتھ نواب صاحب سنانا چاہتے ہیں، لیکن پُوچھنے کا یارا کسی میں نہیں تھا۔

استاد دروازہ بند کر کے آ ئے، اور سگّن کے قریب، لیکن نواب صاحب سے دور، نہایت ادب کے ساتھ بیٹھ گئے، اور انتظار کرنے لگے کہ پردۂ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے، یعنی نواب صاحب کیا ارشاد فرماتے ہیں!

نواب صاحب نے اپنے حلقوم اور گلو پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہُوئے کہا:

"پہلے میرے ایک سوال کا جواب دیجیے؟"

سگّن، اور استاد نتھّے خاں نے بیک آواز کہا:

"فرمایئے، آپ کے ہر سوال کا نہایت کافی اور شافی جواب دیا جائے گا!"

نواب صاحب نے پوچھا:

"کیا امراؤ کے بارے میں حضرت جانِ عالم کو بھی کوئی اطلاع ملی ہے؟"

سگّن نے قطعیت کے ساتھ کہا:

"اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نہ وہ کبھی قیصر باغ گئی، نہ میں گئی، نہ اُستاد کا جانا ہُوا، نہ حضرت جانِ عالم نے کبھی ہمارے غربت کدے میں قدم رنجہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی!"

(۱۱)

استاد کے رونے پر کسی کو ترس نہیں آیا، سگن نے خشونت بھرے لہجے میں کہا :

"آپ نے بہت برا کیا، ——— کم از کم مجھ سے تو کہنا چاہیئے تھا!"

نواب صاحب کے جلال کا عالم ہی دوسرا تھا، فرمایا :

" آپ نے غداری کی میرے ساتھ، کیا میں نے آپ کے جیب اور دامن سونے سے نہیں بھر دیئے تھے، ———"

اس انکشاف پر سگن چونکی، اور استاد کا رنگ سفید پڑ گیا!

نواب صاحب نے فرمایا :

" آپ نے اگر میرن صاحب کی یہ بات مجھے بتا دی ہوتی تو میں تدارک کر لیتا، اب تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا، جس طرح آپ نے مجھ سے دس ہزار روپے لیے ہیں، ضرور میرن صاحب سے بھی کوئی بڑی رقم ہتھیائی ہوگی؟"

سگن نے دس ہزار کا نام سنا تو اس پر بجلی گر پڑی، کہنے لگی :

" اس بوڑھے نے آپ سے دس ہزار روپے ہتھیائے ہیں؟"

نواب صاحب نے استاد سے کہا :

" بتاؤ، میں غلط کہہ رہا ہوں ———؟"

استاد نواب صاحب کے قدموں پر گر پڑے!

" بے شک حضور نے غلام کو دس ہزار روپے دیئے تھے، لیکن جناب امیرؑ کی قسم

کیا چیز ہوتی ہے، ـــــــــــــ

"اصل بات کہیئے!"

"میں نے ان سے کہہ دیا: سرکار یہ اب تیر نکل چکا ہے، یہ نہیں ہو سکتا!"

کہنے لگے: "کس نے چلایا ہے وہ تیر؟"

میں نے کہا: "حضور نواب صمصام الدولہ بہادر نے!"

یہ نام سُن کر وہ چونک پڑے انھیں یقین ہو گیا، واقعی دال نہیں گل سکتی، چُپ ہو گئے، کہنے لگے:

"اچھا اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرنا ـــــــــ صمصام الدولہ کل کا لونڈا ہے وہ میرے مقابلے میں کیا آئے گا سمجھ لُوں گا اس سے!"

مَیں نے عرض کیا: "سرکار اگر بُرا نہ مانیں تو غلام عرض کرے، شرفاء کا یہ دستور ہے کہ ایک دوسرے کی طوائف کو عزّت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور کسی قیمت پر اس سے تعلقات اور رسم و راہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے،

یہ سُن کر کہنے لگے:

"شرفاء کا دستُور کیا ہے، یہ تُم مجھے بتاؤ گے۔ اچھا اب تم جا سکتے ہو۔ ہماری بات چیت ختم، اگر کسی سے تم نے اس کا ذکر کیا تو اس شہر میں نہیں رہ سکو گے (روتے ہُوئے) حضور لکھنؤ غلام سے نہیں چھُوٹ سکتا، اس لیے پی گیا یہ بات!"

استاد دل میں بہت خوش ہوئے کہ جو بات امراؤ چاہتی تھی، وہ خود بخود پوری ہو گئی۔ لیکن حیرت بھرے لہجے میں پوچھا :

"یہ کیا سرکار؟ ——— یہ کیوں؟"

سگن کی بھی تقریباً وہی کیفیت تھی، جو استاد کی تھی، اس نے بھی ظاہری اضطراب کے ساتھ پوچھا :

"بیٹے کیوں؟"

نواب صاحب نے جواب دیا : "میرن نے امراؤ کا ذکر حضرت جان عالم سے کچھ اس طرح کیا ہے کہ وہ اس کے حد درجہ مشتاق ہو گئے ہیں، وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں، اس سے ملنا چاہتے ہیں، اس کا گانا سننا چاہتے ہیں، اس کا رقص دیکھنا چاہتے ہیں ——— اور یہ سب تو ظاہری باتیں ہیں، امر واقعہ یہ ہے، انھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے اپنے پری خانے میں داخل کریں!"

سگن چونک پڑی : "پری خانے میں ——؟"

نواب صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا :

"ہاں، ———"

استاد کے دل کی کلی کھل گئی، دل ہی دل میں کہنے لگے، دیکھوں یہ ولی زادی جانِ عالم کو کس طرح رد کرتی ہے، مگر نواب صاحب سے کہا :

"یہ تو بڑا غضب ہوا، ——— سرکار کہہ کیوں نہ دیا کہ آپ۔"

نواب صاحب بولے : "نہیں استاد میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا، اگر امراؤ سے میں نے تعلق قائم کر لیا ہوتا تو حضرت جانِ عالم ادھر کا رُخ بھی نہ کرتے، لیکن میرن ایک گھاگھ ہے وہ جانتا تھا کہ ابھی بات طے ہو رہی ہے۔ اس نے حضرت جانِ عالم سے جا اڑائی، اُن سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا، اور اگر بولوں بھی تو اس کا پول کھل جائے گا!"

کھا کر کہتا ہُوں کہ نواب میرن صاحب سے مَیں نے ایک پائی بھی نہیں لی!"

نواب صاحب نے بے پروائی کے ساتھ کہا:

"خدا بہتر جانتا ہے!"

سگّن نے استاد سے کہا:

"نگوڑے، دس ہزار روپے کی رقم بے ڈکار لیے ہضم کر گیا؟"

استاد نے روتے ہوئے کہا:

"اب تو مَیں مجرم ہُوں، چور ہُوں، لیکن چلو، رادھے لال سنار سے پوچھ لو، پورے دس ہزار کا زیور مَیں نے امراؤ کے لیے بنوایا ہے یا نہیں؟ آخر وہ میری بھی تو بیٹی ہے، وہ اُس گھر سے جاتی، اور مَیں کچھ نہ دیتا؟"

ان الفاظ میں صداقت تھی، اور اس صداقت سے سگّن اور نواب صاحب دونوں متاثر ہوئے، سگّن نے کہا:

"اس کا تو مجھے یقین ہے امراؤ کو تم بیٹی کی طرح چاہتے ہو، اور یقیناً رادھے لال سے اس کے لیے زیور بھی بنوایا ہوگا، لیکن عقل کے پیچھے ڈنڈا لیے کیوں پھرتے ہو؟ مجھے دُنیا جہان کے قصّے سنایا کرتے ہو، یہ بات بھی اگر بتا دیتے تو کیا نقصان ہو جاتا؟"

استاد نے اعترافِ خطا کرنے میں غلطی نہیں کی، ——————

"بے شک غلطی ہو گئی!"

نواب صاحب نے فرمایا:

"لیکن کچھ خبر ہے، آپ کی اس غلطی کی کتنی بڑی قیمت مجھے ادا کرنی پڑ رہی ہے؟"

سگّن نے پوچھا: "اے خیر تو ہے، قیمت کیسی میرے چاند؟"

نواب صاحب نے بڑی بے کلی، انتہائی اضطراب اور حد درجہ قلق بھرے لہجے میں کہا:

"اب امراؤ میری نہیں ہو سکتی، ——————

قیصر باغ کے ایوانِ شہی میں حضرت جانِ عالم واجد علی شاہ رونق افروز ہیں، اگرچہ امورِ مملکت سے اب عملاً وہ بے تعلق ہو چکے تھے، وزیرِ اعظم علی نقی خاں تھے، اور سارا کام انھی کے ساتھ، اور انگریزوں کے ہاتھ میں ریذیڈنٹ کے توسط سے علی نقی خاں کی اپیل تھی، لیکن امورِ مملکت سے اس بے تعلقی کے باوجود، رعایا، کیا ہندو، کیا مسلمان، ان پر جان چھڑکتے تھے۔ چنانچہ جانِ عالم صرف اپنے ملک کے بادشاہ ہی نہیں تھے، اقلیمِ دل کے تاجدار بھی تھے،

جانِ عالم کے سامنے ایک طرف مؤدب لیکن خستہ اور مضمحل نواب صمصام الدولہ بیٹھے تھے، دوسری طرف سگن، اس کے پہلو میں امراؤ، اور اس سے ذرا ہٹ کر لیکن قریب ہی استاد ننھے خاں،

اس وقت، ـــــــــ جو لوگ جانِ عالم کے سامنے بیٹھے تھے، سب اپنی اپنی سوچ رہے تھے!

نواب صمصام الدولہ کے ذہن و دماغ میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ کاش، جانِ عالم کو امراؤ کی صورت، یا کوئی بات ناپسند آجائے اور وہ اسے واپس کردیں، دل ہی دل میں نہ جانے کتنی منتیں مان ڈالی تھیں انھوں نے!

سگن یہ سوچ رہی تھی کہ امراؤ لاکھ الہڑ، نادان، اور ضدی سہی، لیکن جانِ عالم نے اگر پسند فرما لیا، تو انکار نہ کر سکے گی، پھر وارے نیارے ہیں، دُنیا کی کون سی نعمت

بڑی حسرت کے ساتھ پُوچھا :

" پھر اب ؟ "

" اب کیا ؟ ——— امراؤ کو حضرت جانِ عالم کے حضورؐ میں پیش ہونا پڑے گا ! "

" (بے پروائی کے ساتھ) خیر جب بلاوا آئے گا، دیکھا جائے گا ! "

" مَیں کس لیے آیا ہُوں ؟ بلاوا ہی لے کر تو آیا ہُوں ! "

" تم ——— ؟ ——— تم بلاوا لے کر آئے ہو ؟ "

" ہاں قسمت کی ستم ظریفی یہ بھی ہے ——— زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا ——— جانِ عالم نے یہ خدمت مجھے سپرد فرمائی ہے، کل یہیں اسی وقت آؤں گا اور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا، آپ کو، اور استاد کو بھی ساتھ چلنا ہوگا ! "

جانِ عالم کا اشارہ پاتے ہی امراؤ نے اپنے کمالِ رقص و نغمہ کا ایسا مظاہرہ کیا کہ جانِ عالم دل تھام کر رہ گئے۔ ان کے ذہن کے بعید ترین گوشے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہ شعلۂ جوالہ جو حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی، فنی طور پر بھی اس درجہ کامل ہے۔

گانا سُن کر، اور ناچ دیکھ کر جانِ عالم نے صمصام الدولہ سے کہا:

"کیا رائے ہے تمھاری؟"

وہ سٹ پٹا گئے:

"جانِ عالم کے سامنے غلام کیا رائے دے سکتا ہے؟"

"تم خود بھی فنِ موسیقی میں درک رکھتے ہو، بتاؤ امراؤ کا گانا کیسا ہے، تم نے زندگی میں نہ جانے کتنی رقاصاؤں کا ناچ دیکھا ہوگا، بتاؤ یہ کیسا ناچتی ہے؟ (مسکراتے ہوئے) تم خود بھی ہماری طرح حُسن پرست ہو، ——— بتاؤ اس لڑکی کا سا حُسن و جمال کہیں دیکھا ہے؟"

جانِ عالم کا ایک ایک لفظ صمصام الدولہ کے دل پر، تیر و نشتر کا اثر کر رہا تھا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا اس گوہرِ نایاب کو، ملک کے سب سے بڑے جوھری نے پسند کر لیا ہے، اب یہ ہاتھ سے نکل گیا، اور اس احساس کے ساتھ ہی ان کا دل ڈوبنے لگا، اختلاج کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، نواب میرن بھی شریکِ مجلس تھے، وار کرنے کا اس سے بہتر موقع انھیں نہیں مل سکتا تھا، انھوں نے کہا:

"نواب صاحب جواب دیجئے، جانِ عالم کیا پوچھ رہے ہیں؟"

صمصام الدولہ کو یقین ہوگیا، یہ سب کچھ میرن ہی کا کیا ہُوا ہے، لیکن یہاں لڑنے جھگڑنے کا موقع تو نہیں تھا، صبر سے کام لیا، کہنے لگے:

"جانِ عالم نے یقیناً اس لڑکی کو پسند فرمالیا ہے، اور میں ایک بندۂ ناچیز کی حیثیت سے صرف اس حُسنِ انتخاب کی داد دے سکتا ہُوں۔ جی چاہتا ہے ایک شعر عرض کروں،

ہے، جو بیک اشارۂ چشم حاصل نہیں ہو جایا کرے گی، کتنا اچھا ہُوا کہ اس لڑکی نے نواب صمصام الدولہ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے انکار کر دیا، اگر کہیں بات پکّی ہو جاتی، وہ راضی ہو جاتی اور تعلق قائم ہو جاتا، تو پھر اس قصرِ شاہی کا دروازہ کس طرح اس کے لیے کھل سکتا ـــــــ مولا تیرے کھیل نیارے ہیں!

استاد نتھّے خاں کو یقین تھا کہ جانِ عالم ضرور امراؤ کو پسند کر لیں گے، وہ بھی دل میں خوش تھے کہ صمصام الدولہ کا، کانٹا راستے سے ہٹا، !

اور امراؤ !

امراؤ کیا سوچ رہی تھی ؟

بے شک اسے قدرت نے ایسا موقع عطا کر دیا تھا، جس کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتی تھی، لیکن اس موقع سے وہ بھکارن کی طرح فائدہ اٹھانے پر تیار نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ شرائط تھے، اور انہی شرائط پر، معاملہ ہو سکتا تھا۔

دفعتہً جانِ عالم نے سگّن سے ارشاد فرمایا :

"تمھاری لڑکی ہمیں پسند آئی !"

وہ اٹھی، اور آداب بجالائی، اس نے کہا :

لونڈی کے لیے اس سے بڑھ کر باعثِ فخر کیا بات ہو سکتی ہے ؟"

جانِ عالم نے کہا :

"تمھیں ہم ان تکلفات سے مستثنیٰ کرتے ہیں، بیٹھی رہو، اور بیٹھے بیٹھے ہماری باتوں کا جواب دو۔ لیکن قبل اس کے کہ دوسری باتیں ہوں، ہم چاہتے ہیں کہ امراؤ کا گانا بھی سُن لیں اور ناچ بھی دیکھ لیں۔

سگّن نے بڑے فخر اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا :

"جیسی جانِ عالم کی مرضی !"

"حضور، غلام کے نزدیک تو دو ہزار کافی ہوں گے!"

"احمق، ——— تم بتاؤ صمصام الدولہ!"

"غلام کے خیال میں پانچ ہزار ماہوار تو ہونے ہی چاہئیں!"

"تم نے ایک نواب کی سی بات کہی، ورنہ میرن نے تو اس بنیوں اور بقالوں کا نام روشن کیا تھا!"

میرن صاحب کی اس توہین پر نواب صاحب دل میں بہت خوش ہوئے، جو غبار تھا، اس کا بڑا حصہ دھل گیا، اتنے میں جان عالم نے فرمایا:

"لیکن صمصام الدولہ، پانچ ہزار بھی کم ہیں، اس کے حسن اور فن کو دیکھتے ہوئے ——— !"

"بجا ارشاد ہوا جان عالم!"

"ہم شروع میں اسے دس ہزار دیں گے، جاگیر الگ، بعد میں اضافہ ہو سکتا ——— ہے!"

"حاتم داروں کی دریا دلی سے غلام کو یہی توقع تھی، ——— بالکل مناسب فیصلہ فرمایا!"

جان عالم نے ایک مرتبہ پھر سگن کو مخاطب کیا اور پوچھا:

"مطمئن ہو تم؟"

وہ سراپا عجز و ناز بن کر بولی:

"جان عالم کی بندہ پروری، اور ذرہ نوازی کا شکریہ دل سے ادا کرتی ہوں!"

دفعتہً نواب صاحب کی نگاہ استاد نتھے خاں پر گئی، انھوں نے سگن سے پوچھا:

"یہ کون شخص ہے؟"

استاد نے سگن کے جواب سے پہلے کھڑے ہو کر سات فرشی سلام کیے، پھر اپنی جگہ بیٹھ

وہی میرا جواب ہوگا،

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی، نگہ انتخاب کی!

——— !"

جانِ عالم مسکرائے اور فرمایا :

" تمھارے جواب سے ہم خوش ہوئے!"

صمصام الدولہ سروقد کھڑے ہوکر آداب وتسلیمات بجالائے، اور بڑی حسرت کے ساتھ کہا :

" بندہ نوازی ہے سرکار کی!"

اب جانِ عالم نے سگن کی طرف دیکھا اور کہا :

" یہ لڑکی تو بڑے کام کی نکلی۔ ہم اسے اپنے محل میں رکھیں گے، اپنے پری خانے کی رونق بنائیں گے، رہس اور ناٹک میں اس کی نغمہ سرائی اور رقصِ لاجواب کو پیش کیا کریں گے، ——— کیا تمھیں منظور ہے؟"

" بڑے فخر کے ساتھ جانِ عالم!"

" لیکن مشاہرہ کیا چاہتی ہو تم؟"

" غلام اپنے آقا سے کوئی مطالبہ نہیں کیا کرتے!"

" ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس لڑکی کو، زیادہ سے زیادہ مشاہرہ دیں گے، جاگیر بھی عطا کریں گے، توشہ خانۂ شاہی سے جتنے زیورات بھی، خواہ وہ کسی قیمت کے ہوں، یہ پسند کرے گی، ہماری طرف سے عطا کردیئے جائیں گے!"

" مالک اپنے غلاموں کو اسی طرح سربلند کرتے رہتے ہیں!"

" کیوں میرن، کیا مشاہرہ ہونا چاہیئے اس لڑکی کا؟"

کامل تھا کہ امراؤ، جانِ عالم پر، اپنے حُسن اور فن کی بدولت چھا جائے گی، یہ لوگ یہی سوچ رہے تھے کہ جانِ عالم نے ارشاد فرمایا :

" اب تم لوگ جا سکتے ہو، سب ضروری باتیں طے پا گئیں، کل ہم سواری بھیج دیں گے، تم امراؤ کو بھیج دینا ، ! "

سگّن نے نشاط و مسرّت کے نشے سے مست ہو کر کہا :

" سرکار ایسا ہی ہوگا ———— لونڈی زادی کل حاضر ہو جائے گی ! "

مجلس برخاست ہونے ہی والی تھی کہ یکایک امراؤ کی شیریں، لیکن عزم سے بھری ہوئی، آواز گونجی، اس نے جانِ عالم سے عرض کیا :

" یہ خادمہ بھی کچھ عرض کرنا چاہتی ہے، اگر اجازت ہو ! "

جانِ عالم، جو اب مجلس برخاست کر کے اُٹھنے ہی والے تھے، یہ سُن کر چونک سے پڑے، پھر سے مسندِ شاہی پر رونق افروز ہوئے، اور ایسی نظروں سے، جن میں محبّت اور الفت جھلک رہی تھی اسے دیکھ کر کہا :

" ہاں ہاں ، ———— کہو، ہم شوق سے، اور توجہ سے سُن رہے ہیں ، ! "

امراؤ نے اسی انداز میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

" مَیں ایک بات قطعی طور پر عرض کر دینا چاہتی ہوں ! "

یہ بات سُن کر ، نواب میرن صاحب بھی چونک پڑے ، اور نواب صمصام الدولہ بھی اور خود جانِ عالم بھی ،

آج تک جانِ عالم کے فیصلے کے بعد، کسی نے اس طرح " قطعی " طور پر کچھ عرض کرنے کی کسی وزیر نے بھی جسارت نہیں کی تھی . نہ کہ ایک طوائف زادی، اور اس " قطعی " کا مطلب سرکشی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا . ؟ اس کا مطلب یہی تو تھا کہ اگر اس کی بات

گئے، سگّن نے تعارف کراتے ہوئے کہا :

"سرکار ان کا نام استاد چھکے خاں ہے!"

"استاد؟ ——— کیا انھیں بھی کچھ شُد بُد ہے فن میں؟"

"سرکار، یہ ہمارے خاندانی استاد ہیں۔ لونڈی کو جو کچھ آتا ہے وہ استاد کی جوتیوں کا طفیل ہے اور امراؤ کا جو کمال دیکھا وہ بھی استاد ہی کی محنت کا ثمرہ ہے ———"

"معلوم ہوتا ہے بہت اچھے گلوکار اور موسیقار ہیں!"

"بے شک سرکار، ——— اور ناچ بھی انھی نے سکھایا ہے میری بچی کو!"

"(تعجب سے) واقعی؟"

"سرکار!"

"اچھا تو ہم انھیں بھی خانہ زادوں کی فہرست میں لکھے لیتے ہیں، پانچ سو ماہوار انھیں بھی ملا کرے گا!"

استاد نے کھڑے ہو کر پھر سات فرشی سلام کیے اور بیٹھ گئے، جان عالم نے مُسکرا کر سگّن کی طرف دیکھا اور فرمایا :

"لیکن تم تو رہ گئیں؟"

"لونڈی نے سب کچھ پا لیا سرکار!"

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا، ——— دو ہزار ماہوار آج کی تاریخ سے تمھیں بھی ملا کریں گے!"

اس کرم فرمائی کا سگّن نے دل سے شکریہ ادا کیا۔

اس وقت سگّن اور استاد کا عالم یہ تھا کہ ——— تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر! جو کچھ ملا تھا، اور جتنا کچھ عطا ہوا تھا وہ نہ صرف امید اور آرزُو سے کہیں زیادہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے مزید کی توقع بھی تھی۔ سگّن، اور استاد، دونوں کو یقین

کام کروں!"

"کیوں؟"

"غیر مردوں سے برائے نام قرب بھی مجھے پسند نہیں!"

"لیکن ہم نے تو زیادہ تر تمھیں اسی لیے رکھا ہے کہ تم سے ناٹک اور رہس میں کام لیں!"

"جانِ عالم خادمہ معافی چاہتی ہے، کسی قیمت پر بھی وہ ایسا نہیں کر سکتی!"

سارے حاضرین دہل اٹھے کہ یہ گستاخ لڑکی اپنے ساتھ دوسروں کا بھی نہ جانے کیا حشر کرائے گی۔ خود جانِ عالم کو بھی یہ باتیں ناپسند ہوئیں۔ ان کے چہرے سے برہمی صاف نظر آرہی تھی، لیکن انھوں نے تحمّل سے کام لیا اور پوچھا:

"آخر کیوں؟"

وہ بولی:

"اس لیے کہ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے!"

غضب خدا کا، اٹل فیصلہ اور جانِ عالم کے سامنے!

سب ہی حیرت زدہ اور مہر بہ لب تھے!

البتہ صمصام الدولہ کی دل ہی دل میں باچھیں کھلی جارہی تھیں!

جانِ عالم کچھ دیر سر جھکائے بیٹھے رہے، پھر فرمایا:

"اچھا ہم تمھاری یہ بات مان لیتے ہیں، ـــــــــ تم پری خانے سے تعلق رکھو گی، جہاں صرف عورتیں ہی عورتیں ہیں! اور وہیں ہمارے سامنے مظاہرۂ فن کیا کرو گی!"

"یہ منظور ہے مجھے!"

"(مسکرا کر) کچھ اور!"

نہ مانی گئی تو وہ کام کرنے سے اور قصر میں آنے سے انکار کر دے گی؟"

سب سے زیادہ ابتر اور نازک حالت استاد ننھے خاں کی تھی۔ وہ بار بار آزمودہ دعائیں پڑھ پڑھ کر، اپنے اُوپر، سگن کے اُوپر، اور امراؤ کے اُوپر، اشاروں اشاروں میں پھونک رہے تھے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ یہ لڑکی ضرور کوئی گُل کھلائے گی جس سے مال تو مال، جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، ——— ہو سکتا ہے یہاں سے، ہم لوگ واپس نہ جائیں، ہماری کٹی ہوئی گردنیں جائیں؟ بہت مائل بہ رزم ہوئے تو جیل تو لازمی ہے ہم سب کے لیے، آج زندگی میں پہلی مرتبہ انھوں نے امراؤ کو بددعا دی تھی:

"یا اللہ یہ گونگی ہو جائے، ایک بول بھی اس کے مُنھ سے نہ نکل سکے!"

اور کچھ ایسی ہی کیفیت سگن کی بھی تھی، اسے بھی، اُمیدوں اور تمنّاؤں کا ——— قصرِ فلک بوس زمین پر گرتا نظر آ رہا تھا، وہ بھی سوچ رہی تھی، اس دیوانی لڑکی کے منھ سے نہ جانے کیا نکلے، اور حضرت جان عالم برہمی کے عالم میں کیا فیصلہ صادر فرما دیں۔

بہرحال، ——— سب ہی تن کر اور سہمے ہوئے، بیٹھے تھے کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے، یہ کیا کہتی ہے؟

جان عالم نے امراؤ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا:

"کہو، ہم منتظر ہیں تمھاری بات کے سُننے کے!"

امراؤ نے کہا:

"رہس اور ناٹک میں اگر مجھے کام کرنا ہُوا، تو مردوں کے ساتھ بھی کرنا ہوگا؟"

"ہاں ضرور، پھر؟"

"مَیں مردوں کے سامنے، شوق اور رضا سے نہیں، اپنے حالات سے مجبور ہو کر ناچ بھی سکتی ہوں، اور گا بھی سکتی ہوں، لیکن یہ نہیں ہو سکتا، کہ ان کے ساتھ

جلتے محسوس ہو رہے تھے ، !
جرم امراؤ سے خطا ہُوا تھا ، خیر کسی کو بھی اپنی نظر نہیں آر ہی تھی، ——
یہ بیباکی —— یہ صاف گوئی —— یہ آزادی ——
بھلا کس کی مجال تھی کہ قصرِ شاہی میں اس کا مظاہرہ کر سکتا ؟ ——
لیکن ایک نو عمر لڑکی ، یہ کارنامہ انجام دے رہی تھی ، !

جانِ عالم نے فرمایا :

" تم نے کافی گستاخانہ باتیں کی ہیں ، لیکن اب تک ہم معاف کرتے آئے ہیں ، شاید یہ سلسلہ مزید نہیں جاری رہ سکے گا ، صاف الفاظ میں بتاؤ تمھارا مقصد کیا ہے ؟"

بغیر کسی جھجک اور خوف کے امراؤ نے جواب دیا :

" جانِ عالم کے محل میں خادمہ کے رہنے کی ، پہلی اور آخری ، اور اٹل شرط یہ ہے کہ جانِ عالم شادی کر لیں !"

" (بے انتہا حیران ہوکر) ہم شادی کر لیں ؟ "

" اگر باندی کو شب و روز محل میں رکھنا ، اور قرب کا شرف بخشنا ہے ، تو جانِ عالم کو یہ کرنا ہی پڑے گا !"

جانِ عالم نے یہ الفاظ دوہرائے اور فرمایا :

" جانِ عالم کو یہ کرنا ہی پڑے گا —— کیوں ؟

" جی ——
" اور اگر ہم انکار کر دیں ، !"
" تو مجھے اپنے گھر کی دال روٹی بہت ہے !"
" اور اگر ہم جبر سے کام لیں ! "

"جی ایک بات اور عرض کرنے کی اجازت چاہتی ہوں !"

جانِ عالم نے، کچھ عجیب سی نظروں سے امراؤ کو دیکھا اور فرمایا :

"جو کچھ تمھارے دل میں آئے کہہ ڈالو !"

امراؤ نے، تبسّم کی بجلیاں گراتے ہوئے، جنھوں نے جانِ عالم کی برہمی کافور کر دی، کہا :

"یہ باندی، صبح کو حاضر ہو جایا کرے گی، اور شام کو اپنے گھر واپس چلی جایا کرے گی !"

یہ سُن کر، جانِ عالم سمیت سب پر بجلی گر پڑی، انھوں نے اپنی برہمی کو لاکھ لاکھ روکا، مگر اس مرتبہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ کہنے لگے :

"ہم نے تمھیں اپنے لیے رکھا ہے، دن کو پری خانے میں رہو گی، اور رات — ہمارے شبستانِ عیش میں بسر کرو گی !"

بڑی سادگی کے ساتھ امراؤ نے کہا :

"سرکار یہ نہیں ہو سکتا !"

جانِ عالم نے زندگی میں پہلی مرتبہ یہ الفاظ سُنے تھے، وُہ چونک پڑے، انھوں نے کہا :

"کیا نہیں ہو سکتا !"

"مَیں گناہ کی زندگی نہیں بسر کر سکتی ———— اور جانِ عالم پر ———— جب کہ خدا اتنا مہربان ہے کہ انھیں بادشاہ ذی جاہ —— بنا دیا ہے، تو ان کے شایانِ شان بھی یہ بات نہیں ہے !"

یہ دربار خاص ہی نہیں، خاص الخاص تھا، ———— یعنی اس میں صرف چند ہی مخصوص لوگ حاضر ہوا کرتے تھے، لیکن ہر شخص کو در و دیوار

جان عالم کے اس فیصلے سے سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا، ورنہ سب ہی پر نزع کا عالم طاری تھا۔

جان عالم نے ہنستے ہوئے نواب میرن سے کہا :

" ہمارے اس فیصلے پر تمھیں حیرت ہوئی ہوگی ——— کیوں ؟"

وہ سر جھکا کر گویا ہوئے :

" حیرت تو ہوئی غلام کو !"

جان عالم نے مسکراتے ہوئے فرمایا :

" امراؤ کی باتوں نے ہماری زندگی کا رُخ بدل دیا !"

" سرکار کی زندگی کا رُخ بدل دیا !"

" ہاں ——— کل سے ہمارے محل میں جو عورتیں ہوں گی ——— یا ممتوعات، یا منکوحہ ! ——— ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کسی غیر محرم عورت کو، قصر میں داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی !"

" سوا بھنگنوں اور بہشتنوں اور نائنوں وغیرہ کے !"

" نہیں میرن ——— بے شک ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہوگا، لیکن ہمارے قصر میں صرف ممتوعات کی حیثیت سے داخل ہو سکیں گی !"

" بڑا اہم فیصلہ ہے سرکار کا !"

"تو آپ صرف میری جان لے سکتے ہیں!"

کچھ دیر تک جان عالم سوچتے رہے ——— پھر زور سے قہقہہ مار کر ہنسے!

اور فرمایا:

"ہم سے آج تک کسی نے اس طرح اپنی بات نہیں منوائی تھی، لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ ان باتوں سے ہم متاثر ہوئے ——— سگن، ——— کل ہماری شادی ہوگی، تمھاری لڑکی سے!"

جان عالم نے صمصام الدولہ کو حکم دیا :

" جاؤ ان لوگوں کو ان کے یاں پہنچا آؤ جاکر ! "

چنانچہ شاہی گاڑی میں بٹھا کر نواب صمصام الدولہ ـــــــــ امراؤ، سگن ، اور استاد نتھے خاں کو لے کر چلے ، اور بالا خانے تک پہنچا آئے ۔

ان کا ارادہ اُوپر جانے کا نہ تھا ، چنانچہ دروازے ہی سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا ، ـــــــــ

لیکن سگن نے روکا !

" بیٹے ، ـــــــــ تھوڑی دیر بیٹھ کر جاؤ ، مجھے کچھ باتیں کرنا ہیں تم سے ! "

بادل نخواستہ ، نواب صاحب اُوپر آئے !

سگن نے کہا :

" میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہوں ! "

" جی ارشاد ، ـــــــــ فرمایئے ! "

" امراؤ ، ـــــــــ تمھارے ساتھ " تعلق " قائم کرنے پر تیار نہیں تھی ۔ بڑے معرکے ہوئے گھر میں ۔ یہ بات اُس کے دل میں بیٹھ گئی ہے کہ ناجائز طور پر

"جب ہم، جائز طور پر ایک کام کر سکتے ہیں، تو اسے ناجائز بنا کر کیوں انجام دیں؟ امراؤ نے یہی بات ہمارے دل و دماغ میں راسخ کر دی ہے!"

"بجا ارشاد ہُوا!"

پھر جانِ عالم نے امراؤ سے تخاطب کرتے ہُوئے فرمایا:

"ہم نے تمھیں "مہک پری"[1] کا خطاب دیا، کل جب تم ہمارے قصر میں آؤ گی، تو مہک پری بن کر آؤ گی!"

امراؤ آداب بجا لائی!

جانِ عالم نے صمصام الدولہ سے پوچھا: "یہ خطاب کیسا ہے؟"

"خطابوں کا بادشاہ سرکار!"

"ٹھیک کہتے ہو، ——ہم نے یہی سوچ کر یہ خطاب عطا کیا ہے! ——کیوں میرن کیا تمھیں مہک پری کا جذبۂ نیک و صالح پسند نہیں آیا؟"

"سرکار، اگر غلام یہ عرض کرے کہ خود اس کی بھی ان باتوں سے کایا پلٹ گئی، تو ذرا مبالغہ نہ ہوگا!"

"اور صمصام الدولہ تم کیا کہتے ہو؟"

"غلام کم سے کم جو عرض کر سکتا ہے، وہ صرف نواب میرن صاحب کے الفاظ دوہرا کر اپنا مدعائے قلب ظاہر کر سکتا ہے!"

◎

---

[1] تاریخ اودھ

روک سکتا ہے ، جب کہ وہ بے غرض ہے !"

سگن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ، یہ مگرمچھ کے آنسو نہیں تھے ، سچے آنسُو تھے اس نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا :

" اس دنیا میں ایسے لوگ ہوتے ہیں !"

نواب صاحب نے اُٹھتے ہوئے کہا :

" ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں !"

◎

زندگی نہیں بسر کرنی چاہیئے !"

" لیکن آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں ؟"

" بتاتی کس وقت ؟"

" کیوں ؟"

" جس روز بتانے والی تھی ، ـــــــــــ اس روز تم حضرت جانِ عالم کا بلاوا لے کر آ گئے !"

" کیا واقعی ؟"

" تمھارے سر کی قسم !"

" بہرحال ان کے اس کردار کی میرے دل میں عزت ہے !"

سگّن نے استاد نیھتے خاں سے کہا :

" بیٹے منھ کیا دیکھ رہے ہو ، جاؤ اشرفیاں اور زیورات لا کر ہمارے نواب صاحب کو واپس کر دو !"

استاد نیھتے خاں اُٹھے ، اور تہ خانے کی طرف روانہ ہوئے ، لیکن نواب صمصام الدولہ نے کہا :

" وہ اشرفیاں اور زیورات تو اب میں نہیں لے سکتا !"

سگّن نے غرقِ حیرت ہو کر پُوچھا :

" اے واہ بیٹے یہ کیوں ؟"

نواب صاحب نے کچھ سوچتے ہُوئے جواب دیا :

" وہ چیزیں میں نے محبّت سے دی تھیں ، ـــــــــــ اور محبّت سے دی ہُوئی چیز واپس نہیں لی جا سکتی ، بے شک اب میرے ، اور آپ کی صاحبزادی کے درمیان ناقابلِ شکست دیوار حائل ہو گئی ہے ، لیکن مجھے محبت سے کون

لے جائے گا ؟"

" کوئی نہیں ؟"

"اماں سچ کہنا ۔ ——— کیا واقعی ؟" ———

سگّن نے کہا :

" ہاں بھئی ، جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے مجھے !"

" لیکن کیوں ؟ ——— ہاں مَیں سمجھ گیا !"

" کیا سمجھے ؟"

" امراؤ ، ——— اب مہک پری بن کر حضرت جانِ عالم کے محل میں جارہی ہے !"

" تو ——— ؟"

" وہ اب شاہ بیگم کہلائے گی !"

" ہاں پھر ——— ؟"

" اسے دی ہوئی چیز کون واپس لے سکتا ہے ؟ ——— کس کے مُنھ میں اتنے دانت ہیں ؟"

" بڑے نیچ ہو اُستاد !"

" کیا کہا نیچ ؟ ——— یہ کیوں ؟"

سگّن نے کہا :

" ایک شخص " تعلق " قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے ، اور اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے لیے مطلوبہ اشرفیاں اور زیورات " تعلق " سے پہلے وہ دیتا ہے مگر کسی وجہ سے وہ تعلق قائم نہیں ہوسکتا ، تو اب دنیا کا کون سا قانون یا ، اخلاق اسے یہ چیزیں واپس لینے سے روک سکتا ہے ؟"

(۱۵)

نواب صمصام الدولہ کے تشریف لے جانے کے بعد استاد نتھے خاں ، اشرفیوں کے توڑے ، اور زیورات کا پٹارہ لے کر تشریف لائے ۔ یہ آئی ہوئی دولت واپس کرتے انھیں بہت کھل رہی تھی !

اور ، ایک ہلکا سا اندیشہ یہ بھی تھا ، کہ شاید وہ دس ہزار روپے بھی واپس کرنے پڑیں گے ۔

لیکن ، ———— یہاں آکر دیکھتے کیا ہیں کہ نواب صمصام الدولہ صاحب ندارد !

حیرت کے ساتھ سگن سے پوچھا :

" ارے بھئی نواب صاحب کہاں گئے ؟ "

وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی :

" گئے ، چلے گئے ، ———— "

" کہاں ، ارے بھئی کہاں ؟ "

وہ بولیں :

" اپنی حویلی میں اور کہاں ؟ "

" اور یہ اشرفیوں کے توڑے ، یہ زیورات کا پٹارہ ، کون سر پر لاد کر

اس نوک جھونک کے بعد، استاد نے سگن سے کہا :

"بھائی عجیب لڑکی پیدا کی ہے تم نے ؟"

وہ مسکراتی ہوئی بولی :

"میری بچّی ہے، ——— کیا سمجھتے ہو تم اُسے ؟"

"میں تو ایک بات جانتا ہُوں !"

"وہ کیا ؟" ———

"اگر یہی لیل و نہار رہے، اس کی بیباکی اور گستاخی کی یہی کیفیت رہی، تو کسی دن ہم لوگ کولھو میں پلوا دیئے جائیں گے !"

سگن ہنسنے لگی !

"ہاں بعض وقت خیال تو مجھے بھی ایسا آتا ہے، لیکن استاد اس بات کی داد نہ دو گے کہ پہلی ہی ملاقات میں جانِ عالم پر وہ اس درجہ حاوی ہو گئی کہ شادی کا وعدہ لے کر واپس آئی -

"ہاں بھئی کمال کر دیا ! ——— اب تو وُہ شاہ بیگم ہے !"

"اللہ رکھے بے شک ——— اس کا ستارہ بڑا زور دار ہے . وہ کسی نواب کے لیے نہیں بادشاہ کے لیے پیدا ہوئی تھی !"

"بے شک، ———

"مجھے سب سے زیادہ جو چیز اس کی پسند ہے وہ یہ کہ اپنی آن پر قائم رہی !"

" اگر یہ بات ہے تو کیوں بھاگ گیا ؟ " کیوں نہیں لے گیا ؟ "

" استاد اس طرح کی باتیں کر کے ، ———— میری نظر میں زیادہ ذلیل نہ بنو ! "

" اچھا وجہ تو بتا دو ؟ "

" وہ امراؤ سے سچّی محبت کرتا ہے ، ———— اور کہہ گیا ہے ، محبت میں دی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتا ۔ اب وہ شاید زندگی بھر امراؤ کی صورت بھی نہ دیکھ سکے ، لیکن بے لوث اور سچّی محبت زندگی بھر کرتا رہے گا ، ———— شرم کرو ، "

آناً فاناً یہ خبر ساری برادری میں مشتہر ہوگئی۔ مبارک باد دینے والیوں کا تانتا لگ گیا۔ حد یہ ہے کہ مشتری اور نیلم بھی پیش پیش تھیں مبارکباد دینے میں، مشتری کو یقین تھا کہ نیلم اگر شاہ بیگم نہیں بنی تو نواب صمصام الدولہ کہاں گئے ہیں۔

ان مبارکباد دینے والیوں کے ساتھ ان کی لڑکیاں تھیں، چنانچہ زمرّد، اور نازو اور پکھراج اور نیلم، سب ہی آموجود ہوئی تھیں۔

امراؤ اپنے کمرے میں آرام سے مسہری پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ زمرّد نے دروازہ پر کھڑے کھڑے پوچھا:

"سرکار لونڈی آجائے؟"

امراؤ اٹھ کر بیٹھ گئی، اور مسکراتی ہوئی بولی:

"اجازت نہیں ہے!"

زمرّد کے کندھے کے پیچھے سے نازو نے اپنا چہرہ ابھارا، اور بولی:

"یہ باندی؟ —— اس کے لیے کیا حکم ہوتا ہے؟"

امراؤ نے شاہانہ لیکن مصنوعی وقار کے ساتھ جواب دیا:

"تمھیں اجازت ہے، —— صرف تم آسکتی ہو؟"

یہ سُن کر زمرّد، اور نازو دونوں دوڑی دوڑی آئیں، اور امراؤ کے لپٹ گئیں۔ کہنے لگیں: "شاہ بیگم صاحبہ، سُنا ہے جانِ عالم سے خُوب جھوڑ ہوئی آپ کی؟"

" آن کیسی جاتی ؟ "

" یہی کہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ناجائز زندگی نہیں بسر کرے گی، چنانچہ بادشاہ وقت کو اس نے ٹھکرا دیا، ـــــــ کوئی اور کر سکتا تھا ؟ "

" اجی توبہ کرو، اور تو اور تُم بھی نہیں کر سکتی تھیں ! "

" تم نے غلط نہیں کہا، ـــــــ اس کے سینے میں شیر کا دل ہے ! "

" قسم ہے جناب امیٹر کی، میرا دل تو اس زور سے دھڑک رہا تھا اس فتنی کی باتیں سُن کر کہ معلوم ہوتا تھا اب قلب کی حرکت بند ہُوئی ! "

" بالکل یہی کیفیت میری تھی ! "

" اور سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک طوائف زادی اپنی ضد اور ہٹ کے باعث شاہ بیگم بن گئی ! "

" ہاں بھئی خُوب فخر کر لو ! "

" صرف میں ہی ؟ "

" ہم کہاں گئے ہیں ؟ ـــــــ ہمیں بھی فخر ہے ! "

" وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گئی۔ "

" بات کرنا بھی نہیں آتی، یُوں کہو امر ہو گئی ! "

پکھراج نے شوخ نظروں سے نازو کی طرف دیکھا، اور پوچھا :

"کیا باتیں ہو رہی ہیں، اکیلے اکیلے؟ ——— اب ہم ایسے غیر ہو گئے کہ شریک مجلس کرنا بھی چھوڑ دیا؟"

نازو بولی :

"ادب سے بات کرو، تم نہیں جانتیں، کس کے حضور میں حاضر ہو؟ ——— حضور مہک پری ——— یعنی شاہ بیگم ——— یہاں رونق افروز ہیں ——— شہزادیوں اور بادشاہ بیگموں کے سامنے کس طرح بات کی جاتی ہے، یہ فن سیکھ لو، پھر حاضری کی جرأت کیا کرو!"

نیلم نے پوچھا :

"لیکن یہ فن سکھائے گا کون؟"

"کسی سے بھی سیکھ لو۔"

پکھراج کہنے لگی :

"لیکن یہ دم بھر میں کیا ماجرا ہو گیا؟ ——— میری تو عقل حیران ہے!"

"خدا کی دین ہے، ——— اب تمھارے یا نیلم کے لیے

وہ سنجیدگی سے بولی :

"جھوڑ کیسی ؟ ــــــ مَیں نے اسی دن جب نواب صمصام الدولہ کے سلسلے میں تم دونوں بات کرنے آئی تھیں بتا دیا تھا کہ مَیں کیا چاہتی ہُوں ــــــ یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ نواب صمصام الدولہ کے لیے میرا اصُول قائم رہتا ، اور جانِ عالم کے لیے بدل دیتی !"

نازو نے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا :

"لیکن بڑا جگرا ہے اس لڑکی کا ! ــــــ ہم سے تو بات بھی نہ ہوتی !"

زمرّد بولی :

"ہماری تو گھگھی بندھ جاتی !"

امراؤ نے کہا :

"اس لیے کہ تمھارا کوئی اصُول نہیں ہے جو تم میں حوصلہ اور ولولہ پیدا کرتا ، تم میں ہمّت اور جرأت پیدا کرتا !"

نازو نے منھ بنا کر کہا :

"بھئی ہم تو بزدل ہیں !"

اتنے میں پکھراج اور نیلم بھی آ گئیں !

◎

"میری بہن زندگی خود ایک فریب ہے، ——— اور فریب میں بھی اگر خلوص ہو تو بُری چیز نہیں!"

"فریب میں خلوص؟"

"ہاں اور کیا؟" ———

"لیکن کس طرح؟"

"بھئی نواب صمصام الدولہ کو دُوں گی فریب ——— یعنی، روپے کے لیے اس سے محبت جتاؤں گی، لیکن ہو سکتا ہے بعد میں، یہ تصنع حقیقت کی صورت اختیار کرلے۔"

"یعنی سچی محبت کرنے لگو؟"

"کبھی ایسا ہُوا ہے ہماری برادری میں!"

"ہُوا تو نہیں ہے، لیکن ہو تو سکتا ہے، ممکن ہے، یہ خدا کی عاجز بندی کر کے دکھا دے،!"

"بہت مائل ہوئی ہو صمصام الدولہ پر!"

"مائل تو اسی دن سے تھی جب پہلے پہل اسے دیکھا تھا!"

"واقعی؟ ——— سچ؟ تجھے خدا کی قسم!"

"ہاں بھئی بالکل سچ، تمھارے سر کی قسم!"

"لیکن، اگر صمصام الدولہ نے دھتکار دیا، ——— یعنی تمھاری محبت کو قبول نہ کیا؟"

"تو کیا ہو جائے گا؟ ——— کچھ بدصُورت تو ہُوں نہیں، ایسے ایسے بیسیوں نواب مل جائیں گے! دنیا میں نواب منّن خاں، اور نواب چھّن خاں سب ہی طرح کے لوگ موجود ہیں!"

میدان صاف ہے!"

"کیا مطلب ؟ ——— کیا کہنا چاہتی ہو تم ؟"

"نواب صمصادم الدولہ بڑے اچھے آدمی ہیں!"

"ہوں گے پھر ہمیں کیا ؟"

"تو کیا انھیں بچ جانے دوگی اپنے تیرِ نظر سے ؟"

"اوہ یہ مطلب ہے تمھارا ، ——— خبردار ، جو آئندہ ایسی بات کی ہوگی !"

"نہیں کروں گی !"

"تمھیں جرأت کیسے ہوئی اس کی ؟"

"حماقت کہہ لو ، ——— مَیں نے اپنی دانست میں خیرخواہی کی تھی ——— !"

"شکریہ اس خیرخواہی کا ، ——— تم خود اپنا تیرِ نظر کیوں نہیں استعمال کرتیں !؟"

"تو کیا چھوڑ دوں گی ؟"

"یعنی ، ———"

"یعنی ، یہ کہ نواب صمصام الدولہ پر ڈورے ڈالوں گی ——— اتنی بڑی تو اسامی ہے وہ !"

"عشق لڑاؤگی اس سے ؟"

"تو کیا ہوا ؟ ——— ہمارا خاندانی پیشہ یہی ہے - اسی پر روٹی چلتی ہے ، یہ نہ کریں تو کھائیں کیا ؟"

"فریب کا نام عشق رکھ چھوڑا ہے تم نے !"

(۱۹)

مہک پری بن کر امراؤ ، ــــــــــــ حضرت جانِ عالم کے محل میں پہنچ چکی تھی ، !

اور مہک پری کو پاکر، وہ سب کچھ بھول چکے تھے !

تم جسے یاد کرو ، پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا ، نہ خدا یاد رہے

مہک پری کو انھوں نے اپنے پری خانے کا انچارج بنادیا تھا ، یہاں جتنی عورتیں تھیں ، ان کی دیکھ بھال ، نگہداشت ، اور ضروریات کی فراہمی اسی کے ذمے تھے۔ حضرت جان عالم اسے دل سے چاہتے تھے ، اور اس پر پُورا پُورا اعتماد کرتے تھے۔

مہک پری کی جان عالم سے شادی ہوچکی تھی ، اسے ایک الگ ڈیوڑھی رہنے کے لیے ملی تھی ، گراں قدر مشاہرے کے علاوہ بہت بڑی جاگیر بھی ملی تھی ، وقار ، اور تمکنت کی اس میں پہلے بھی کمی نہ تھی ، اب ان چیزوں میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا ، اس کے وقار میں واقعی شاہی دبدبہ تھا۔ اسکی تمکنت میں سچ مچ ، ادائے شہریاری جھلکتی تھی۔

وہ ایک طوائف زادی تھی ، لیکن اپنے محل میں اس طرح رہ رہی تھی ، جیسے

" اچھا بھئی، معاف کرو، تم نے تو سر کھا لیا، ——— جو جی چاہے کرو ہمیں کیا؟"

" ظاہر ہے۔ اس طرح کے معاملات اکیلے ہی طے کیے جاتے ہیں، نہ ہمیں تم سے مطلب، نہ تمھیں ہم سے!"

زمرّد نے نازو کے ایک زور کی چٹکی لی، اور کہا:

" بہُت زبان چلنے لگی ہے ——— بس اب چُپ ہو جاؤ!"

" ہائے اللہ" ——— کہہ کر نازو نے مُسکراتے ہوئے خاموشی اختیار کر لی۔!

محل میں، پری خانے میں، اور دوسرے سرکاری محلات میں بھی اس کے حُسن اخلاق اور شرافت اور عالی ظرفی نے سب کا دل موہ لیا تھا، نخوت، تکبر، رعونت، غرور کا اس میں شائبہ بھی نہیں تھا۔ اخلاق، وضع داری، اور تواضع اس کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی بڑے ہوں یا چھوٹے، امیر ہوں یا غریب، سرکاری عہدے دار ہوں، یا معمولی ملازم سب کے ساتھ اس کا سلوک یکساں تھا۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتی تھی، سب کی مانگ پُوری کرتی تھی، سب کا دل رکھتی تھی، بہت مختصر سی مدت میں اس نے وہ مقام حاصل کرلیا ــــ جو خاندانی شہزادیوں کو بھی نہیں حاصل تھا۔ جان عالم، مہک پری کی یہ کیفیت دیکھ دیکھ کر دل میں بہت خوش ہُوا کرتے تھے!

وہ خاندانی شہزادی ہے، اور ہمیشہ سے شاہانہ زندگی بسر کرتی آئی ہے — وہی کر و فر، وہی دبدبہ، وہی شان، وہی آن، جو ایک والا دودمان شہزادی میں ہونی چاہیے پُوری دل ربائی و رعنائی مہک پری میں موجُود تھی،

ماں ـــــــــ گتّن ـــــــــ کے ہاں اُس نے جانا بالکل ترک کر دیا تھا، بلکہ انھیں کافی بحث و گفتگو کے بعد اس پر آمادہ کر لیا تھا، کہ اب بالاخانے کی زندگی کو خیر باد کہیں، اور یہیں اُٹھ آئیں، اور باقی زندگی یادِ خُدا میں صرف کردیں، ـــــــــ آبائی گھر چھوڑتے ہوئے انھیں دُکھ تو ہُوا، لیکن بیٹی کی کشش اس پر غالب آ گئی، اچھے داموں پر اسے فروخت کیا، اور بیٹی کے پاس آ کر رہنے لگیں۔

استاد نیتّھے خاں کو اگرچہ سرکار سے باقاعدہ مشاہرہ ملتا تھا، اور وہ سرکاری ناٹکوں میں کام بھی کرتے تھے، لیکن رہتے وہ بھی مہک پری کے ساتھ تھے، اور بہت خوش تھے، انھیں ساری عمر کے ریاض، اور زندگی بھر کی گمنامی کا بڑا اچھا اور معقول معاوضہ مل گیا تھا، اور شہرت بھی پاؤں چومنے لگی تھی۔

مہک پری، اگرچہ اب بادشاہ بیگم تھی، لیکن اس کے تعلقات، اپنی سہیلیوں، اور اپنی برادری کی عورتوں سے ایسے ہی تھے، جو مدد کے قابل تھیں اپنی جیب سے ان کی مدد کرتی تھی، زمرّد، اور نازو سے اس کے تعلقات میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو گیا تھا۔

اس کے طرزِ عمل نے زمرّد اور نازو کو خاص طور پر، اور برادری کی تمام بوڑھی اور افکارِ رفتہ عورتوں پر بڑا گہرا اثر کیا تھا، سب کے منہ سے اس کے لیے کلمۂ خیر ہی نہیں نکلتا تھا، سب اسے دل سے دعائیں دیتی تھیں، جب کبھی اس کا ذکر چھڑ جاتا، گھنٹوں اور پہروں اسی کا ذکر ہوتا رہتا۔

اس نے جواب دیا :

"جی ہاں، اس مرتبہ میرِ قافلہ سیّد مرتضیٰ حسین صاحب ہیں، انھیں یہ رقم پہنچا دی گئی ہے!"

"بہت اچھا کیا!"

"اس طرح سرکار جو ثواب لوٹتے ہیں، اس مرتبہ مَیں نے بھی اس میں شرکت کا فیصلہ کر لیا ہے!"

"یعنی ——— ؟"

"مَیں نے اپنی طرف سے بھی سیّد صاحب کو ۵ ہزار روپیہ اس مد میں بھیجا ہے!"

"ہم شقہ لکھے دیتے ہیں یہ رقم تمھیں خزانۂ شاہی سے مل جائے گی!"

"نہیں جانِ عالم، ویسے تو جو کچھ باندی کے پاس ہے، سب آپ ہی کا دیا ہُوا ہے، لیکن اس نیک کام میں اپنا ذاتی روپیہ ہی خرچ کرنے کا میں نے فیصلہ کیا ہے!"

جانِ عالم خوش ہو گئے، فرمایا :

"بڑا اچھا اور نیک جذبہ ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ، اگرچہ ہماری زندگی کے شب و روز، عیش و عشرت اور راگ رنگ میں بسر ہوتے ہیں، لیکن مذہبی جذبہ ہمارے ضمیر میں رچا ہوا ہے، اور جس کسی میں ہمیں یہ جذبہ نظر آتا ہے، اس کی قدر اور محبت ہمارے دل میں اور بڑھ جاتی ہے، تم سے ہمارا دل جو اتنا مانوس ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔"

"بندہ نوازی ہے جانِ عالم کی، ——— اب تو خیر وقت نہیں رہا، لیکن اگلے سال جب قافلہ روانہ ہوگا تو میرا خیال ہے کہ امّاں (سگّن) اور استاد (نھتّے خاں) کو بھی روانہ کر دوں کچھ وہ بھی اس سعادت سے بہرہ ور ہو لیں!"

"بہت اچھا خیال ہے (مسکرا کر) لیکن غالباً ان دونوں کو بھی تم اپنے ذاتی خرچ

(۲۰)

لکھنؤ سے ہر سال ایک قافلہ، حرمین شریفین اور عتبات عالیات کی زیارت کو روانہ ہوا کرتا تھا، پہلے یہ قافلہ مشہدِ مقدس جاتا، وہاں سے عراق اکربلائے معلٰی، نجف اشرف، اور کاظمین وغیرہ کی زیارت سے مشرف ہوکر مکۂ مکرمہ جاتا، وہاں فریضۂ حج ادا کرتا۔ اس سے فراغت کرکے مدینۂ منورہ پہنچتا، اور وہاں ڈیرے ڈال دیتا اور کئی مہینے مقیم رہتا، کوئی سال سوا سال کے بعد یہ واپس آیا کرتا تھا۔

اس قافلے میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے تھے جن کے جملہ مصارف حضرت جانِ عالم اپنی جیبِ خاص سے ادا کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت محل ان کے حضور میں حاضر تھی، وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے، اور محظوظ ہو رہی تھی کہ یکایک جانِ عالم نے فرمایا :

" ایک ہفتے کے بعد، عتبات عالیات اور حرمین شریفین کی زیارت کے لیے لکھنؤ کا قافلہ روانہ ہو جائے گا !"

وہ بولی :

" مجھے معلوم ہے جانِ عالم !"

جانِ عالم نے پوچھا :

" خزانۂ شاہی سے وہاں کے مستحقین میں تقسیم کرنے کے لیے ایک لاکھ روپیہ میرِ قافلہ کو دیا جاتا ہے، کیا اس کا بندوبست بھی کر دیا تم نے ؟"

(۲۱)

دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے !

۳ سال کی مدت گزر گئی !

جانِ عالم اور مہک پری کی محبت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

مہک پری بھی جانِ عالم کی محبت کی دل سے قدر کرتی تھی، اس لیے کہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جانِ عالم واقعی اسے چاہتے ہیں، اس کے حسن سے صرف وقتی فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔

اس ۳ سال کی مدت میں ہر سال قافلے، کربلا اور مکے مدینے کی طرف روانہ ہوتے، لیکن سگن اپنا ارادہ پورا نہ کر سکی، وہ بیمار پڑی اور ایسی بیمار پڑی کہ جان کے لالے لگ گئے، بڑے بڑے حکیموں کا علاج ہُوا، کبھی افاقہ ہو جاتا، کبھی پھر حالت بگڑ جاتی — !

اس مدت میں، مہک پری نے ایک سعادت مند اور محبت کرنے والی لڑکی، کی حیثیت سے جس مستعدی کے ساتھ ماں کی خدمت کی ہے، وہ اپنی مثال نہیں رکھتی، زمرّد اور ناز و جی اس عرصے میں یہیں رہیں اور مہک پری کا بوجھ بٹاتی رہیں۔

آخر اللہ اللہ کر کے سگن کی طبیعت تین سال کے بعد درست ہُوئی اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اس سال ضرور زیارت کو جائیں گی !

لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ ان کا ارادہ پورا ہو۔

مہک پری پیٹ سے تھی، اور چند ماہ کے بعد ایک، بچّہ کی ماں بننے والی تھی۔ اس حالت میں، سگن بھلا کیوں کر اتنا دُور دراز کا سفر، بیٹی کو تنہا چھوڑ کر اختیار کر سکتی تھی،

ہی سے بھیجو گی !"

"(زیر لب تبسم کے ساتھ) جی بے شک !"

"یہ کیا غضب ہے کہ ایسے مواقع پر تم ہمیں ثواب میں حصہ لینے سے محروم رکھتی ہو؟"

"جانِ عالم، لونڈی کے پاس جو کچھ مال متاع ہے، وہ آپ کے سوا ہے کس کا؟ میں اپنے گھر سے تو نہیں لائی تھی ———— کاش وہ دن بھی آتا کہ جانِ عالم، اور یہ باندی بھی اس فرض سے سبک دوش ہو جاتے ؟"

"انشاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا اور ضرور آئے گا۔ خود ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔ ممکن ہے بہت جلد، یہ آرزو عملی جامہ پہن لے !"

"آمین یارب العالمین !"

◎

"آؤ زمرّد سٹّہ کھیلیں!"

وہ مسکراتی ہوئی بولی :

"واہ ری پگلی ، یہ سٹّہ کھیلنے کا شوق کب سے چرایا ہے ، ——— چل ہٹ میں نہیں کھیلتی!"

نازو نے بڑے اصرار سے کہا :

"اچھا آؤ شرط بدیں لڑکا ہوگا ، یا لڑکی ، ——— میں کہتی ہوں لڑکا ہوگا!"

زمرّد نے جواب دیا :

"میں خود کہتی ہوں لڑکا ہوگا ، ——— لو ہار گئیں تم شرط ، نکالو ، سو روپے فوراً ، !"

مہک پری ہنسنے لگی ، اس نے کہا :

"واہ بھئی ، خوب ہرایا ، اور ہار کی رقم کا فیصلہ بھی کر لیا ، ——— بے ایمان کہیں کی!

مہک پری اگرچہ ماں کو اکساتی رہی۔

"اماں تم جاؤ زیارت کو، میں خدا کے فضل سے بالکل اچھی ہوں، اور جب تم آؤ گی تو مجھے بالکل توانا اور تندرست پاؤ گی۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری وجہ سے یہ مبارک سفر ملتوی کرو۔ ———— میں ڈرتی ہوں کہیں خدانخواستہ اللہ میاں خفا نہ ہو جائیں ——!"

زمرد بول پڑی،

"بڑی اللہ والی ———— کیوں خفا ہو جائیں گے اللہ میاں؟"

مہک پری نے جواب میں کہا:

"انسانی رشتہ کتنا ہی مضبوط ہو، لیکن اسے بندے اور خدا کے رشتے سے زیادہ مضبوط نہیں ہونا چاہیئے!"

نازو نے بھی گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا:

"یہ تو ٹھیک ہے کہ بندے اور خدا کا رشتہ سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیئے۔ لیکن دل میں محبت بھی اللہ نے ڈالی ہے، اس سال نہ گئیں، انشاء اللہ اگلے سال چلی جائیں گی!"

سگن نے بھی ہاں میں ہاں ملائی، اور کہا:

"بیٹی نازو ٹھیک تو کہتی ہے، میرا ارادہ اٹل ہے، اس سال نہ سہی، اگلے سال سہی، لیکن انشاء اللہ جاؤں گی ضرور، لیکن تمھارا جاپا دیکھ لوں، خیر سے بچّہ پیدا ہو لے تب جاؤں گی!"

مہک پری کچھ شرما سی گئی، کہنے لگی:

"اماں کو تو ہر وقت یہی فکر لگی رہتی ہے، بس!"

نازو نے زمرد سے کہا:

زمرد چہکتی ہوئی بولی :

" خالہ جان، اس کے بعد بھی تو بہت سے فرائض ہوں گے، آپ انھیں ادا کر لیجیے گا، ہم ذرا مداخلت نہیں کریں گے ——— کیوں نازو ؟"

نازو نے بھی تائید کی، اور کہنے لگی :

" ہاں خالہ ——— یہ کام تو ہم ہی لوگ کریں گے ۔"

سگن نے دوپٹے کا پلّو اٹھاکر، ان دونوں کو دعائیں دیں :

" اللہ تم دونوں کو سلامت رکھے، ——— (مہک پری سے مخاطب ہوکر) بیٹی اس خلوص اور محبّت کو زندگی بھر یاد رکھنا !"

مہک پری نے، بظاہر سنجیدگی سے، ویسے از راہ مذاق کہا :

" امّاں جان بڑی حرفوں بنی ہوئی ہیں یہ دونوں، آپ بھی ان کے چکر میں آگئیں ——— جن کی زبان چلتی ہے، وہ کرتے کچھ نہیں !"

نازو نے منھ بناکر کہا :

" ہاں بھئی، تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ (زمرد سے مخاطب ہوکر) اس موقع پر کوئی حسبِ حال شعر ضرور میری طرف سے پڑھ دو، ——— تاکہ یہ شاہ بیگم منھ دیکھتی رہ جائیں !"

زمرد نے بڑی آمادگی اور مستعدی کے ساتھ کہا :

" ابھی لو، حسبِ حال شعروں کا تو خزانہ ہے میرے پاس ! سُنو :

وُہ دعا کرتے ہیں وفا اصغر
دونوں کام اپنا اپنا کرتے ہیں

ایمان سے کہنا کیسا ہے ؟"

نازو تو اس شعر کو لے اڑی، جواب دیا :

(۲۲)

لیکن اس وقت زمرّد بہت مُوڈ میں تھی ، اس نے کہا :

" خیر یہ مذاق تھا ، شرط یہ بدتے ہیں کہ اگر لڑکا ہوا ، تو مَیں دس ہزار روپے خیرات کروں گی ، اور لڑکے کے لیے ، بڑا قیمتی جوڑا بنواؤں گی ، اس کا عقیقہ اپنے پاس سے کروں گی چاہے لاکھ روپے خرچ ہوجائیں ! "

نازو نے تان پرتان لگائی ، بھلا پیچھے کب رہنے والی تھی ، کہنے لگی :

" اگر لڑکی ہُوئی ، تو مَیں پندرہ ہزار روپے خیرات کروں گی ، لڑکی کا ایک نہایت زرکار جوڑا تیار کراؤں گی ، اور اس کے لیے بڑے قیمتی ننّھے ننّھے زیور بھی ، اور اس کا عقیقہ اس دھوم سے کروں گی کہ سارے شہر والے یاد کریں گے ، کوئی پروا نہیں دو لاکھ خرچ ہوجائیں ——— اپنی جان کی قسم مذاق نہیں کرتی ، سچّے دل سے کہہ رہی ہُوں ! "

مہک پری ، ان دونوں کی یہ محبّت بھری باتیں ، جن میں خلُوص ہی خلُوص تھا ، بڑی دلچسپی سے سُنتی رہی ، ——— سگّن کبھی محبت بھری نظر سے زمرّد کو دیکھتی تھیں ، کبھی نازو کو ، پھر کہنے لگیں :

" واقعی تم لوگوں کو میری بچّی سے جو محبّت ہے ، خود غرضی کی اس دنیا میں وُہ پوجنے کے لائق ہے ، لیکن میری بچّیو ، تم نے کہا اور گویا سب کچھ کر دیا ، ویسے تمھیں بھلا یہ تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے ، میں کس مرض کی دوا ہوں ، یہ فرض تو میرا ہے ! "

عہدِ بہار

"بہت اچھا، بالکل حسبِ حال، لطف آگیا خدا کی قسم!"

مہک پری اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا تم لوگ مشاعرہ کرتی رہو اطمینان سے، مَیں تو چلی، جان عالم کے حلے (کھانے) کا وقت آگیا ہے، اور جب تک مَیں پاس نہ بیٹھوں وہ لقمہ نہیں توڑتے!"

نازو نے کہا:

"کتنی بے غیرت ہو اللہ، ——— کس ڈھٹائی سے یہ باتیں خالہ جان کے سامنے کر رہی ہو، واقعی آنکھوں کا پانی مرگیا ہے۔"

مہک پری کچھ جھینپ سی گئی، بی سگّن مسکرانے لگیں!

(۱)

جانِ عالم کے محل میں آکر، اور ان کی رفیقۂ حیات بن کر، مہک پری نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا، جس کی کوئی بڑی سے بڑی خاندانی عورت آرزو کر سکتی ہے۔ مال، دولت، شہرت، عزت، کیا کچھ نہیں تھا اس کے پاس، ——— اور سب سے بڑھ کر حُسن پرست شوہر کی سچّی اور لازوال محبت، !

زمرّد، نواب منّن خاں کے ہاں دادِ عیش دے رہی تھی، اور نازو نے نہایت آسانی کے ساتھ، مہک پری کی شہ پاکر نواب صمصام الدولہ کو شیشے میں اتار لیا تھا، اور ان کی نکیل ہاتھ میں لیے، ——— امارت سے کھیل رہی، اور عشرت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔

ہُوا یُوں کہ زمرّد کے ہاں ایک تقریب میں مہک پری بھی آئی، اور بالکل اتفاق کی بات کہ نواب صمصام الدولہ بھی تشریف لائے، دل گرفتگی اور افسردگی اب تک ان پر حاوی تھی، وُہ مہک پری کو بھُول نہیں سکے تھے، اور اپنے دل میں اب بھی اس کی محبت پاتے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ دونوں کو کبھی ایک دوسرے سے بات کرنے کا موقع بھی نہ ملتا ہو۔

نواب صاحب کچھ ہٹ کر ذرا الگ سے بیٹھے ہُوئے تھے۔ ٹہلتے ٹہلتے کسی کام سے نازو بھی ادھر آنکلی اور ان کے پاس بیٹھ گئی،

" کہئیے نواب صاحب مزاج کیسا ہے ؟ "

"آپ کی سلامتی میری سلامتی ہے، آپ کی بربادی میری بربادی، بھلا میں ایسا کس طرح چاہ سکتی ہوں؟"

"شکریہ اس نوازش کا، لیکن میں سمجھا نہیں کہ میری سلامتی سے آپ کی سلامتی کا، اور میری بربادی سے آپ کی بربادی کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟"

"سمجھنا چاہتے ہیں؟"

"ضرور ——— سمجھا دیجیے!"

"تو جناب سن لیجیے، خوب غور سے، میں آپ کو چاہتی ہوں!"

یہ سن کر نواب صاحب اچھل پڑے، لیکن یارائے تکلّم نہ تھا۔ نازو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"اور یہ بھی گوش گزار کر لیجیے کہ چونکہ محبّت کرتی ہوں، اس لیے تعلق وعلق کی قائل نہیں میں تو شادی کروں گی آپ سے!"

نواب صاحب کا ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ نازو نے کہا:

میری محبت کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امراؤ سے آپ کی شادی نہ ہو سکی، قدرت تو اپنا کام کر رہی تھی، اسے تو میرے لیے آپ کو محفوظ رکھنا تھا!"

انتہائی عاجزی، بےبسی، اور اضطراب کے ساتھ نواب صاحب نے کہا:

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

وہ بولی: "نواب صاحب میں جھک مارتی رہی ہوں، کچھ نہیں سُنا آپ نے؟"

"سنا تو لیکن، ———"

"لیکن آپ مجھے جھوٹا خیال کرتے ہیں شاید؟"

"جی نہیں تو، ———"

"دیکھیے ایک بات غور سے سُنیے، سب مانتے ہیں کہ میری صورت امراؤ سے ملتی ہوئی ہے۔"——

"اچھا ہُوں!"

"آپ کو نہیں آپ کے مزاج کو پُوچھا تھا مَیں نے!"

"(مُسکرا کر) وہ بھی ٹھیک ہے!"

"(مہک پری کی طرف اشارہ کر کے) اسے پہچانتے ہیں آپ؟"

"ہاں بُہت اچھی طرح، ——— نواب مہک پری ہیں!"

"کیا آپ اب بھی اس سے محبت کرتے ہیں؟"

اس بے ساختہ سوال نے نواب صاحب کو بد حواس کر دیا، صرف پہلو بدل کر رہ گئے اس کا جواب کئی منٹ تک نہیں دے سکے، پھر کچھ دیر بعد فرمایا:

"اس طرح کی باتیں نہ کیجیے!"

"کیوں کیا ہے ———؟"

"اگر کسی نے سُن لیں تو غضب ہو جائے گا!"

"کیا غضب ہو جائے گا؟"

"حضرت جانِ عالم بڑے باغیرت ہیں، وہ یا تو مجھے مار ڈالیں گے، یا بہت رعایت کی تو جلاوطن کر دیں گے!"

"بڑے بزدل ہیں آپ!"

"میں بُزدل ہُوں؟"

"اور کیا، ——— بھلا کوئی محبت سے بھی انکار کرتا ہے؟"

"بہرحال مَیں اس موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا!"

"آپ کے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے، مَیں تو چاہتی ہُوں!"

"مَیں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ میری تباہی، اور بربادی کے درپے ہو گئی ہیں آپ؟"

(۲)

نواب صاحب کی یہ ہمت نہ پڑی کہ نازو کے ساتھ امراؤ، یعنی مہک پری کے حضور میں حاضر ہوتے، اور اس کی باتوں کی تصدیق کرنے کی کوشش کرتے، لیکن، اتنی دیر تک کی باتوں میں، وہ نازو سے، اس کی باتوں سے، اس کی شوخی اور حاضر جوابی سے، اس کی بذلہ سنجی اور ظرافت سے، اس کی ادا اور ناز و غمزہ و عشوہ سے بہت زیادہ متاثر ہو چکے تھے اور دل کے اندر سے ایک صدا سی اٹھنے لگی۔

"امراؤ تو اب کبھی نہیں مل سکتی، نہ نگاہیں پڑ سکتی ہیں اس پر، نہ اس سے باتیں کی جا سکتی ہیں، نہ اسے اپنایا جا سکتا ہے، اور یہ پہاڑ سی زندگی تنہا کاٹے کٹ بھی نہیں سکتی، اور اس میں کوئی شبہ نہیں، اگر امراؤ کا نعم البدل اس دنیا میں کوئی ہو سکتا ہے، تو وُہ نازو ہی ہو سکتی ہے، صورت میں اس سے بہت زیادہ مشابہہ، اور دوسرے صفات میں اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر، ——— وُہ باوقار، یہ زندہ دلی کی لوٹ، وُہ سنجیدہ، یہ شوخی، اور شرارت کا مجسمہ، ——— پھر؟ کیا یہ میرے زخم دل کا مرہم بن سکے گی؟"

نواب صاحب یہی سوچ رہے تھے کہ نازو نے بڑی سادگی سے کہا:

"میرے سرتاج جواب دو، ———"

"سرتاج" کا لفظ سُن کر نواب صمصام الدولہ اُچک پڑے، ——— لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ ———

نواب صاحب غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے

"صورت کے علاوہ جتنی چیزیں ہیں مجھ میں اس سے زیادہ ہیں!"

اب نواب صاحب بھی ان باتوں سے دلچسپی لینے لگے تھے، پوچھا :

"مثلاً، ————"

اس نے بتایا : "مثلاً میں اس سے زیادہ زندہ دل ہوں، وہ تو بات کرنا بھی نہیں جانتی ہیں، مجھ میں بذلہ سنجی بھی اس سے زیادہ ہے، وہ تو بڑی سنجیدہ تھی، میں آپ سے محبت کرتی ہوں، اس نے ایک لمحے کے لیے بھی آپ سے کبھی محبت نہیں کی، ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کی شرافت اور عالی ظرفی کی وہ قائل ہے ——— اور خود مہک پری بھی آپ کی اس دل گرفتگی اور افسردگی کو پسند نہیں کرتی کی خواہش ہے کہ آپ شادی کر لیں، اور آپ کی رفیقۂ حیات کی حیثیت سے اس نے مجھ ہی کو پسند کیا ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی آرزو بھی ہے!"

انتہائی متعجب ہو کر نواب صاحب نے سوال کیا :

"آرزو بھی ہے؟"

نہایت اطمینان سے نازو نے جواب دیا :

"ہاں، ——— چلیے ابھی پوچھے لیتے ہیں اس سے؟"

◎

شرارت بھری نظروں سے نازو کو دیکھا، اور کہا :

"یہاں کیا ہو رہا ہے بھئی ؟"

اس نے بے پروائی سے کہا :

"نامہ و پیام !"

زمرد بھی حیران رہ گئی !

"نامہ و پیام کیسا ؟"

نازو نے اسی انداز میں جواب دیا :

"از راہ کرم نواب صاحب مجھے وہ مقام دینے پر تیار ہو گئے ہیں جو حضرت جان عالم نے امراؤ (مہک پری) کو دیا ہے۔"

زمرد خوش ہو گئی، اس نے سراپا نشاط بن کر دونوں سے پوچھا :

"سچ ——— ؟"

وہ بولی :

"میری جوتی کو کیا پڑی ہے جھوٹ بولنے کی ؟"

زمرد نے کہا :

"لیکن ہمارے کانوں میں تو بھنک بھی نہیں پڑی۔ اس خوش خبری کی ——— یہ چوری چھپے . . . ."

وہ قطع کلام کرتی ہوئی بولی :

"کوئی جائز کام چوری چھپے نہیں کیا جاتا، رہا تمھارے کانوں میں بھنک نہ پڑنا، تو معلوم ہونا چاہیئے، یہ بات ابھی طے پائی ہے !"

زمرد نے اور زیادہ حیرت زدہ ہو کر پوچھا :

"ابھی طے پائی ہے ؟ ——— یعنی تم دونوں نے خود ہی سب کچھ طے کر لیا ؟"

نازو کہہ رہی تھی :

"میری راتیں کب تک ویران ، اور میرے دن کب تک سنسان ، اور میرا خواب شیریں کب تک بے تعبیر رہے گا ——"؟

الفاظ میں گو شوخی تھی ، شرارت تھی ، لیکن سادگی بھی تھی ، اپنائیت بھی تھی ، سچائی بھی تھی !

نواب صاحب کو زندگی میں کبھی ایسی ذہنی کش مکش سے سابقہ نہیں پڑا تھا ، —— نہ خاموش رہ سکتے تھے ، نہ جواب دے سکتے تھے ، —— شاید بلا ارادہ ان کے منھ سے نکلا :

"آپ جو کہیں اس کی تعمیل میری زندگی کی سب سے بڑی مسرت ہے !"

نازو خوش ہو گئی !

"تو آپ تیار ہیں ؟"

نواب صاحب کے منھ میں جیسے کسی نے الفاظ ڈال دیئے ، ——

"ہاں ، ——"

نازو نے ایک قیامت خیز ادا سے ان کی طرف دیکھا اور کہا :

"آپ شادی کریں گے مجھ سے ؟"

بے ساختہ ان کے منھ سے نکلا :

"ہاں ، —— بڑی خوشی سے !"

نازو خوش ہو گئی ، کہنے لگی :

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے ، —— مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی !

جواب میں شاید نواب صاحب کچھ کہتے کہ گھومتی گھامتی زمرد ادھر آ گئی ، اُس نے

زمرّد نے جاکر، نازو کی خالہ سے سارا واقعہ بیان کر دیا، وہ بہت خوش ہوئیں یہ بات سُن کر، اور واقعی چند روز میں، نازو اور نواب صمصام الدولہ کی شادی بڑی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے ہو گئی، شادی میں نہ صرف جان عالم نے ازراہ نوازش شاہانہ شرکت فرمائی بلکہ مہک پری نے بھی حکیموں کی مخالفت کے باوجود نہ صرف شرکت کی، بلکہ شادی کا سارا خرچ برداشت کیا، اور جب وہ رخصت ہو کر جانے لگی، تو تین لاکھ کی اشرفیاں اور زیوراتِ زرنگار کا پٹارا مرحمت فرمایا، نازو نے اور نواب صاحب نے بہت انکار کیا، لیکن مہک پری نے یہ کہہ کر دونوں کو خاموش کر دیا :

"حق بہ حقدار رسید، ——— آخر یہ سب کچھ تھا کس کا ؟ جس کا تھا اسے مل گیا !"

نازو نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا اور خاموش ہو گئی، یہی کیفیت نواب صاحب کی بھی تھی، اب تک وہ امراؤ (مہک پری) سے محبت کرتے آئے تھے، اب ان کے دل میں اس کی عظمت بھی پیدا ہو گئی !

" ہاں پگلی ہاں ، ــــــــــــ

" اس کا مطلب یہ ہُوا کہ تمھارے گھر والوں کو بھی خبر نہیں ہے ؟ "

" بالکل نہیں ہے ، ــــــــــ اماں مر چکیں ، خالہ زندہ ہیں انھیں تم بتا دو جا کر ، بلکہ نواب صاحب کی طرف سے پیام دے دو جا کر ! "

" لیکن تعلق کے شرائط ؟ "

" آہا ، بڑی آئیں تعلق کے شرائط پُوچھنے والی ، ــــــــــ ارے بھئی مَیں تو شادی کر رہی ہُوں ! "

زمرّد اچھل پڑی :

" شادی ــــــ ؟ "

" ہاں ــــــــ کوئی گناہ تو نہیں کر رہی ! "

" خالہ جان راضی ہو جائیں گی ؟ "

" (نہایت اطمینان سے) اوّل تو راضی ہو جائیں گی ، دوسرے نہیں ہُوئیں ، تو نہ ہوں ، ــــــــــ

" یعنی پھر بھی ، ــــــ

" ہاں اور کیا ؟ ــــــــ میاں بیوی راضی تو کیا کرے قاضی ! "

نواب صاحب ہنس پڑے ، زمرّد نے اُن سے پُوچھا :

" کیا یہ سچ کہہ رہی ہے ؟ "

وہ بولے : " میرے دل میں ان کی اسی چیز کی تو قدر ہے ، اتنا بے دھڑک سچ بولنے والا آج تک مَیں نے کوئی نہیں دیکھا ! "

" تو جا کر خالہ جان کو پیام دے دُوں آپ کی طرف سے ؟ "

" جس قدر جلد ہو سکے ، ــــــــــ مَیں بہت ممنون ہوں گا ! "

مہک پری نے حیرت سے انھیں دیکھا اور کہا :

" ہائے غضب ، آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہو سکا ؟ "

نازو نے کہا :

" چھوڑو بھی کیا قصّہ لے بیٹھیں ۔ اصل میں تم نے جو میری تعریف کی ، پہلے وہ ان پر صادق آتی ہے ! "

" یعنی ــــــــ ؟ "

" جس سے ایک مرتبہ محبت یا دوستی کا رشتہ قائم کر لیں پھر وہ جان کا بار بن جاتا ہے ، دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں توڑ سکتی ! "

یہ بات اس نے کچھ ایسے بھولے پن سے کہی کہ کوئی اعتراض نہ کر سکا ، لیکن اس میں اس درجہ معنویّت تھی ، اور گہرا طنز تھا ، کہ نواب صاحب ، اور مہک پری دونوں جھینپ گئے ۔

نازو نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

" اب رہا احترامِ آدمیّت کا معاملہ ، تو یہ واقعہ ہے کہ اپنے ہم جنسوں یعنی انسانوں کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے ! "

" اچھا ، ــــــــ "

" ہاں سچ ! "

" کیسے جانا تم نے ؟ "

" یہ لو ، میں ہی نہ جانوں گی ! ــــــــ اور جناب ثبوت بھی پیش کر سکتی ہوں ! "

" ضرور پیش کرو ! "

" وہ میں خود ہوں ! "

(۳)

نواب صمصام الدولہ، جان عالم کے مصاحبوں میں تھے ہی، اب نازو کے شوہر ہونے کی وجہ سے، مہک پری کے ہاں بھی ان کا آنا جانا ہوگیا، نازو جب وہاں جاتی اور اکثر جاتی تو اپنے ساتھ انھیں لے جایا کرتی، مہک پری کو ان پہ ترس آتا، وہ ان کے ساتھ حُسنِ اخلاق کا برتاؤ کرتی۔

ایک مرتبہ کہنے لگی:

"کیوں نواب صاحب یہ نازو آپ کو پریشان تو نہیں کرتی؟"

وہ بولے:

"نہیں، ان کو توقع سے زیادہ اچھا پایا میں نے!"

مہک پری نے کہا:

"آپ نازو سے کبھی مایوس نہیں ہوں گے، حُسن و جمال، شوخی و شرارت، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کے علاوہ اس کی سب سے زیادہ جو چیز مجھے پسند ہے، وہ ایک تو وفاداری ہے اور دوسری احترامِ آدمیت ہے، جس سے محبت یا دوستی کا ایک مرتبہ یہ رشتہ قائم کرلے، پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے توڑ نہیں سکتی، دل میں اپنے ہم جنسوں یعنی انسانوں کا درد رکھتی ہے، کسی کو تکلیف نہیں دے سکتی!"

نواب صاحب نے فرمایا:

"آپ کہہ رہی ہیں تو ٹھیک ہوگا؟"

مہک پری نے حیرت بھری نظروں سے نواب صاحب کو دیکھا، اور پوچھا :

" مسئلہ کیسا ؟ ———— کیوں ری نازو اب تُو نے مسئلے بھی کھڑے کرنے شروع کر دیتے ہیں، یہ جرأت ؟ "

لیکن نازو کا جواب سننے سے پہلے اس نے نواب صاحب سے پوچھا :

" ہاں کیا مسئلہ ہے وہ ؟ "

نواب صاحب کہنے لگے :

" میں اب تک نہیں سمجھ پایا کہ یہ نازو اپنے مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے ہیں کیا ؟ "

" کیوں ؟ ———— یہ کون سا مسئلہ ہے ؟ "

" کبھی اس درجہ خدمت پر مائل ہوں گی کہ جوتے پہنانے میں بھی تامّل نہیں کریں گی، اور کبھی اس درجہ برہم نظر آئیں گی کہ میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ اس وقت میرا دم بھی کسی وجہ سے نکل جائے، تو دو قطرے پانی بھی حلق میں ٹپکانے پر آمادہ اور تیار نہیں ہونگی۔ ————

مہک پری نے خشم آلود نظروں سے نازو کی طرف دیکھا اور پوچھا :

" کیوں نازو ———— ؟ "

وہ بولی :

" پھر میں بھی کہہ دوں گی سچ سچ !

مہک پری کچھ گھبرا گئی تھی، اور نواب صاحب کا تو چہرہ اُتر گیا، لیکن مہک پری نے پُوچھا :

" تم سے جھُوٹ کہنے کو، کون کہہ رہا ہے، کہو سچ سچ ! "

وہ بولی : " ذرا ان نواب صاحب بہادر سے پُوچھیے کہ ان کا یہ عالم کیوں ہوتا

"یہ کیا بات ہوئی ؟"

"بھائی ہم دونوں میں کیا تعلق تھا، نہ دوستی، نہ صاحب سلامت، نہ رسم وراہ، لیکن، ایک روز بندی اظہارِ محبت کر بیٹھی، محض اخلاقاً، یا از راہ ہمدردی شادی تک کرلی بے چارے نے!"

نواب صاحب ہنسنے لگے، فرمایا :

"نواب مہک پری، سچ تو یہ ہے کہ نازو سے مَیں نے شادی اس لیے کی ہے کہ یہ آپ کی دوست ہیں، ——————"

وہ بول پڑی :

"ہم صورت بھی، اصل بات کیوں نہیں کہتے ؟"

ایک مرتبہ پھر نواب صاحب اور مہک پری دونوں کی لویں سُرخ ہوگئیں، لیکن نازو نے یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہنے دی. کہنے لگی :

"ہاں شادی اس لیے کی کہ مَیں نواب مہک پری کی دوست ہُوں. —————— اور آگے ؟"

نواب صاحب نے فرمایا :

"دوسرے یہ کہ کوئی شبہ نہیں آپ نے ان کے بارے میں بالکل صحیح کہا، واقعی بڑی وفا سرشت اور ہمدرد ہیں، میرا اتنا خیال رکھتی ہیں اور مجھے اتنا آرام پہنچاتی ہیں، کہ شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے، ——————"

نواب مہک پری نے کہا :

"مَیں نہ کہتی تھی واقعی یہ ایسی ہی ہے!"

نواب صاحب نے فرمایا :

"لیکن ایک مسئلہ مَیں اب تک حل نہیں کرسکا!"

(۴)

آخر وہ مبارک دن بھی آگیا، جب مہک پری ایک بچّے کی ماں بن گئی !

جانِ عالم کو مہک پری سے بہت زیادہ محبت تھی، بچّے کے پیدا ہونے سے یہ تقسیم نہیں ہُوئی، بلکہ کچھ اور بڑھ گئی۔ بچّہ تو ان کے قلب و جگر کی قوت تھا ہی لیکن بچّے کی ماں، ان کی نظر میں زیادہ تکریم، زیادہ تعظیم کی مستحق قرار پائی۔

بچّے کے تولد ہوتے ہی جانِ عالم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نواب مہک پری کو، نواب حضرت محل کا خطاب عطا فرمایا !

صرف اسی خطاب[1] پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جاگیر میں بھی اضافہ کر دیا، اور جو مشاہرہ مقرر تھا، اسے بھی دوگنا کر دیا، اس کے علاوہ بہت سے نئے اور گراں بہا زیورات اور ملبوسات عطا فرمائے،

بچّے کا نام انھوں نے برجیس[2] قدر رکھا !

برجیس قدر کے لیے الگ جاگیر، اور درماہہ مقرر کر دیا۔

ویسے بھی قصرِ شاہی میں مہک پری کا دبدبہ اور وقار کچھ کم نہ تھا، لیکن، اب برجیس قدر کی ماں بننے کے بعد، تو اس کی شان اور اعزاز کی بات ہی اور تھی۔

یُوں تو برجیس قدر کی ولادت کی خوشی جانِ عالم کو بھی تھی، آخر کو وہ باپ تھے۔

---

[1] : تاریخ اودھ

[2] : قیصر التواریخ

ہے کہ کبھی میرے ایک اشارۂ چشم پر جان قربان کرنے کو تیار، اور کبھی اتنے انجان، جیسے مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ مَیں تو ہمیشہ سے "جیسے کو تیسا" کے اصول پر عامل ہیں۔ یہ ٹھیک تو مَیں پروانہ اور یہ شمع، اور اگر یہ "ناٹھیک" تو یہ تیل مَیں آگ!"

مہک پری ہنسنے لگی، اس نے نواب صاحب سے کہا:

"یہ میری بچپن کی سہیلی ہے، اس کی ایک ایک ادا میری نظر میں ہے، اس کا واقعی ہمیشہ سے یہ دستور ہے کہ اگر کسی کو کچھ اکھڑا ہوا سا دیکھتی ہے تو گن گن کے بدلے لیتی ہے، میرے ساتھ بھی بارہا یہی کر چکی ہے، لہٰذا ایمان کی بات یہ ہے کہ خطا آپ کی ہے، ——"

"میری خطا ہے نواب مہک پری؟"

"جی ہاں نواب صاحب، —— اسے کبھی یہ احساس نہ پیدا ہونے دیجیے، کہ شب و روز کے کسی لمحے میں بھی آپ اس سے غافل یا بے پروا ہیں، یہ کر لیں گے تو یقین کیجیے میری نازو، ہر روز آپ کو نئی زندگی اپنی محبت اور خدمت سے بخشتی رہے گی!"

نازو نے نواب صاحب سے کہا:

"سُن لیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"ہاں بھئی سُن لیا، واقعی نواب مہک پری نے بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے تمھارے مزاج اور طبیعت کا، اور مَیں نے ان کی بات گرہ میں باندھ لی ہے!"

◎

ہوئے کہا :

" بھئی تم تو لڑکی کا عقیقہ اپنے پاس سے کرنے والی تھیں، جب لڑکی ہو تو اپنے دل کی آرزو پوری کر لینا !"

سگّن نے بھی سمجھایا :

" اے بیٹی تم، اور میری بچّی کوئی الگ الگ تو نہیں ہو ——— جو تُم سو وُہ، ——— جو وُہ، سو تُم۔ اس نے خرچ کیا، گویا تم نے خرچ کیا۔ تم نے خرچ کیا، گویا اس نے خرچ کیا۔"

استاد نیتھے خاں کے لیے اس موقع پر خاموش رہنا بالکل ناممکن تھا :

کہنے لگے :

" بیٹی مان جا، ضد نہ کر !"

نازو نے جانِ عالم کی نہیں مانی، تو استاد کی کیا مان لیتی ؟

کہنے لگی :

" کچھ ہو، ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، اگر میں زندہ ہُوں، تو اپنے بھانجے کا عقیقہ میں ہی کروں گی !"

" یہ ضد، فرمانِ شاہی کے مقابلے میں، ذرا ہوش کی باتیں کرو !"

" (برہم ہوکر) ہوش کی باتیں تو میں کر رہی ہُوں، تم استاد ذرا سوچو، کیا کہہ رہے ہو ؟ ——— کیا میرا کوئی حق نہیں ہے ؟"

" ضرور ہے، کیسے نہیں ہے ؟"

" کیا خالائیں اپنے بھانجوں کے لیے کچھ نہیں کرتیں ؟"

" بہت کچھ کرتی ہیں، ——— خدا غریقِ رحمت کرے ہماری خالہ اماں کو، ———

" اس وقت کوئی بے تکی بات نہیں سنوں گی، خدا نے تمھاری خالہ اماں کو غریقِ رحمت

اور حضرت محل کو بھی تھی ، بہر حال وہ ماں تھی ، ـــــــــ لیکن سگّن اور استاد ننھّے خاں کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی ۔

بس نہیں چلتا تھا کہ یہ دونوں جان قربان کر دیتے اس ساعتِ سعید پر ، اور خوشی کے موقع پر !

برجیس قدر تھا بھی بڑا خوب صورت ، ـــــــــ آخر کس ماں کا ، اور کس باپ کا بیٹا تھا !

دونوں خوب صورت تھے ، اور خوب صورتی میں لاثانی تھے ، ان کے بچّے کو بھی ، حسن کے اعتبار سے فرد ہونا چاہیئے تھا ، اور وہ تھا بھی ،

شہزادے کی ولادت کے سلسلے میں کئی روز تک دھوم دھام کے ساتھ مختلف تقریبات کا سلسلہ جاری رہا ، جانِ عالم ، اور حضرت محل کی طرف سے جو ہزاروں روپے تصدق کیے گئے ، اور غریبوں میں تقسیم کر دیئے گئے ۔ ان کے علاوہ : پکھراج اور نیلم نے بھی ، اپنی طرف سے بہت کچھ صدقہ کیا ، اور شاہ ، و شاہ بیگم کی خوشنودی حاصل کی ، زمرّد نے کئی ہزار روپے کا نہایت زرکار اور زرنگار جوڑا پیش کیا ، اور کئی زیورات بھی !

لیکن نازو اڑ گئی کہ شہزادے کا عقیقہ مَیں کروں گی !

جانِ عالم نے سمجھایا :

" نازو ، اس ضد سے کیا فائدہ ، تمھارے اور حضرت محل کے جو تعلقات ہیں ، ان پر ہمیں بعض دفعہ رشک آتا ہے ، لیکن ہم تمھیں بے اندازہ روپیہ خرچ کرنے کی اجازت کیسے دے دیں ؟ ـــــــــ آخر ہمارے پاس جو کچھ ہے ، کس لیے ہے ، اور کس مد میں صرف ہوگا ؟"

نواب حضرت محل نے بھی نازو کو راہ پر لانے کی کوشش کی ، اور مسکراتے

"بی سگن سے پوچھ لو!"

حضرت محل نے بات ختم کرتے ہوئے کہا :

"اچھا بھئی تم نہیں مانتیں، تو تمھاری ہی ضد سہی!"

ناز و حضرت محل کے گلے سے لپٹ گئی ، اس کی آنکھیں پُرنم تھیں، اور وہ کہہ رہی تھی :

"تم نے میرا دل رکھ لیا ——— میرا ٹوٹا ہُوا دل جوڑ دیا!"

کردیا، لیکن اس وقت ان کے ذکر کا موقع نہیں!"

"سبحان اللہ، اپنی اتنی بڑی مربیہ اور محسنہ کو یاد نہ کروں؟"

"ضرور یاد کیجیے۔ ———— لیکن دل میں، ان کا قصہ لے کر نہ بیٹھیے!" ——

اچھی زبردستی ہے ———— کچھ معلوم بھی ہے وہ ———— خدا جنت نصیب کرے ———— کیا تھیں، کتنی بڑی ہستی تھیں؟"

"بہت بڑی ہستی تھیں، ان کے بڑے ہونے کا اس سے بڑھ کر، اور اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی خالہ تھیں، یہ چیز جہاں آپ کے لیے باعثِ فخر ہے ان مرحومہ کے لیے بھی تھی!"

"بے شک، بے شک، ———— مجھے ان کا ایک واقعہ بھلائے نہیں بھولتا، کیا ہوا، ————

"ان کے کس کس واقعہ کو بیان کیجیے گا، وہ تو ہمہ صفت موصوف تھیں!"

"واللہ کیا لفظ کہا ہے" ہمہ صفت موصوف" واقعی وہ ایسی ہی تھیں ———— کیا تم نے انھیں دیکھا تھا؟ لیکن کیا دیکھا ہوگا وہ تو میرے ہی بچپنے میں مر گئی تھیں، تم تو اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئی ہو گی!"

"لیکن آپ کو دیکھ لینے کے بعد، ان کے بارے میں رائے قائم کرنا، کچھ زیادہ مشکل تو نہیں ہے ———— ؟"

"یہی بات عرش آشیاں والدۂ محترمہ بھی فرمایا کرتی تھیں، وہ تو کہتی تھیں، تیری تو صورت بھی گئی ہے اُن پر!"

"ضرور ایسا ہی ہوگا، ———— اس بڑھاپے میں جب آپ اتنے خوبصورت ہیں، تو بچپن اور جوانی میں کیا عالم ہوگا؟"

اب وہ سیانا ہو چکا تھا،

چنانچہ آج کوئی فیصلہ کر کے وہ بیٹی کے پاس آئیں، اتفاق کی بات استاد نتھے خاں پہلے ہی سے بیٹھے ہوئے تھے، اور نازو بھی زمرّد سمیت ابھی ابھی آئی تھی اور سب سے بے پروا، اور غافل برجیس قدر سے کھیل رہی تھی۔

سگّن کو آتا دیکھ کر حضرت محل نے سرو قد کھڑے ہو کر، اس کا استقبال کیا، پھر محبت بھرے لہجے میں کہا:

"امّاں، آپ نے کیوں تکلیف کی، مجھے بُلا لیا ہوتا؟"

وہ آئیں، اور پاس ہی بیٹھ گئیں، اور کہنے لگیں:

"کچھ پاؤں بھی چلانا چاہتیں بیٹی، ——— آ گئی!"

زمرّد نے اپنی خالہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا:

"ویسے تو آپ خدا کے فضل سے اچھی ہیں، لیکن کمزور ہو گئی ہیں!"

وہ بولیں:

"بڑھاپے میں کمزوری ہی ہو سکتی ہے، طاقت کہاں سے آئے گی؟"

حضرت محل نے کہا:

"آخر آپ اپنے آپ کو اتنا بوڑھا کیوں سمجھنے لگی ہیں؟ آپ سے کہیں زیادہ عمر کی کئی عورتیں میں نے دیکھی ہیں جو آپ سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں؟"

"ہاں بیٹی ہوں گی، یہ تو اپنی اپنی کاٹھی پر ہے، لیکن اس وقت میں ایک خاص بات کہنے آئی ہوں!"

"فرمایئے، ——— ارشاد، آپ کی ہر بات کی تعمیل میرے لیے باعثِ فخر و ناز ہے!"

"ہاں بیٹی جانتی ہوں، خدا تمھیں سلامت رکھے اور سدا سُکھی رکھے، ———

(۵)

برجیس قدر اب پاؤں پاؤں چلنے لگا تھا۔ توتلا توتلا کر باتیں بھی کرنے لگا تھا، ماں ہزار جان سے فریفتہ تھی، اور باپ دل وجگر سے صدقے۔

برجیس قدر میں کچھ ایسی کشش تھی کہ محل کے دوسرے لوگ بھی، جن میں شہزادے، شہزادیاں، ملازم، سب ہی شامل تھے، اسے بہت زیادہ چاہا کرتے تھے۔ سارے محل کے لیے وہ ایک کھلونا تھا، اور اس کھلونے سے سب ہی کھیلا کرتے اور دل بہلایا کرتے تھے۔

اور نازک کا تو عالم ہی دوسرا تھا!

اسے واقعی برجیس قدر سے اتنی ہی محبت تھی، جتنی ایک سگی، اور حد سے زیادہ محبت کرنے والی خالہ کو ہو سکتی تھی ——!

پہلے بھی قصرِ شاہی میں اس کی آمد و رفت تھی، اور اب محض برجیس قدر کو دیکھنے کے لیے، اسے کوئی تحفہ نذر کرنے کے لیے، وہ اکثر آیا کرتی تھی، —— بعض دفعہ مسلسل کئی کئی دن تک ہر روز، —— اور کبھی کبھی ایک دن میں متعدد بار، ——

سگن کا عزمِ زیارت اب تک برجیس قدر کی وجہ سے ملتوی ہوتا چلا آیا تھا۔

پہلے بیماری کی وجہ سے نہ جا سکیں، —— پھر اس انتظار میں رُک گئیں، کہ ہک پری (حضرت محل) ماں بن لے، اور اب اِس لیے رُکی ہوئی تھیں، کہ برجیس قدر ذرا بڑا ہو لے۔

اس نے کہا :

" اماں یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ ؟ "

وہ بولیں :

" ہاں بیٹی غلط نہیں کہتی ! "

حضرت محل نے پُوچھا :

" آخر کب آئیں گی آپ ؟ "

" کبھی نہیں ، ——— میں وہاں مرنے کے لیے جا رہی ہُوں ! "

" (بے قرار ہوکر) اماں · ——————"

" بیٹی ، میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب یہاں سے ہجرت کر کے جاؤں گی —— زیارتوں سے فارغ ہو کر مدینۂ منورہ چلی جاؤں گی ، اور کملی والے آقا کے دیس میں زندگی کے باقی دن گزار دُوں گی ! "

" لیکن اماں ، ———"

" دیکھ میری بچّی ، ——— میرے فیصلے میں تبدیلی کی کوشش نہ کر ، مُفت میں تُو گناہ گار ہوگی ، میرا یہ فیصلہ اٹل ہے ، اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ، ہاں خدا تمھیں توفیق دے تو آ سکتی ہو ! "

" اماں یہ آپ نے فیصلہ کر لیا ——— ؟ "

" بیٹی کچھ عاقبت کی بھی فکر کر لینے دے ، ——————— ویسے تو جانتی ہی ہے تجھے کتنا زیادہ چاہتی ہُوں ، ———"

" جتنا کوئی ماں نہیں چاہ سکتی ! "

" اور شہزادے کو کس طرح میں نے اپنی زندگی بنا لیا ہے ؟ "

" بے شک ، ———"

کہنا یہ تھا کہ پندرہ بیس دن میں قافلہ جارہا ہے، ——— میں اس کے ساتھ ہی جانا چاہتی ہوں!"

"(ناز سے لہک کر) ابھی نہیں اماں!"

"پھر کب بیٹی؟"

"اتنی جلدی کیا ہے، اگلے سال چلی جایئے گا!"

"اور اگر اگلے سال تک زندہ نہ رہی تو اس کا وبال کون لے گا؟"

"خدا نہ کرے، آپ بھی منہ بھر کیسی بات کہہ دیتی ہیں، انشاء اللہ ابھی برسوں زندہ رہیں گی!"

"اگر تیرا خیال صحیح بھی ہے، تو یہ دن دیارِ حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) میں کیوں نہ بسر کروں؟ ——— ساری زندگی گناہ میں گزری ہے۔ کچھ دن تو آقا کے آستانے پر بسر کر لوں!"

یہ کہتے کہتے وہ رونے لگیں، الفاظ میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ حضرت محل کی آنکھیں بھی آب گوں ہوگئیں!

اس نے کہا:

"اچھا چلی جایئے، ——— لیکن اسی قافلے کے ساتھ واپس آ جایئے، ایک تو آپ کے نہ ہونے سے میرا دل گھبرائے گا، دوسرے شہزادہ ——— برجیس قدر ——— آپ سے اتنا مانوس ہوگیا ہے کہ آپ کے نہ ہونے کو بہت محسوس کرے گا!"

"یہ تو ٹھیک ہے بیٹی، لیکن ——— واپس آنے والی بات غلط ہے ———؟"

یہ سُن کر حضرت محل گھبرا سی گئی!

استاد نھتے خاں کو ہجرت کا فیصلہ کرتے وقت بہت دشواری پیش آئی ——— کچھ وطن کی محبت ، کچھ حضرت محل کی کشش ، کچھ گراں قدر تنخواہ ، اور وقتاً فوقتاً تحفے تحائف کا خیال ، ! ———

یہ زنجیریں کچھ اس طرح پاؤں پکڑے ہوئے تھیں کہ ایک روز وہ سگن سے الجھ ہی گئے ، سامانِ سفر کی تیاری دیکھ کر :

" اماں کیا واقعی ہجرت کر رہی ہو ؟ "

سگن نے اپنی مشغولیت اور مصروفیت برقرار رکھتے ہوئے ذرا سے ذرا گردن اٹھائی اور استاد سے پوچھا :

" اور تم ——— ؟ "

وہ سٹ پٹا گئے :

" میں کیا ؟ ——

وہ بولیں :

" تم ہجرت نہیں کر رہے ہو ؟ "

وہ کہنے لگے :

" بھئی ، تم کر رہی ہو تو ہم بھی کر رہے ہیں ، لیکن آخر اس کی ضرورت کیا ہے ، ؟

"لیکن، دل میں جذبہ کچھ ایسا اٹھا ہے کہ تجھے چھوڑ کر، شہزادے سے مُنھ موڑ کر، اپنے سارے پیاروں، زمرّد، اس کی ماں، اور نازو وغیرہ کو، اتنا کچھ چاہنے کے بعد، ہنسی خوشی چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ نہیں بیٹی، میرا دامن نہ پکڑ، مجھے نہ روک۔ آقاؑ کی نگری مجھے بُلا رہی ہے۔ بلاوے کے آواز میرے کانوں میں ہر وقت گونجا کرتے ہیں۔ اگر میں نہ گئی، یا گئی، اور واپس آگئی تو عہد شکنی کی مرتکب ٹھہروں گی!"

"عہد شکنی کیسی امّی؟"

"مَیں نے خدا سے عہد کر لیا ہے کہ اس مرتبہ جاؤں گی تو بس ہجرت کر کے جاؤں گی، اور پھر کبھی بھی واپس نہیں آؤں گی!"

◎

دیا کروں گی، مجھ سے لے لیا کرنا!"

استاد بولے:

"یہ لو ـــــــ تم سے لے لیا کروں؟ ـــــــ کیا میری جیب خالی ہے بالکل؟"

وہ کہنے لگیں:

"اے خالی کیوں ہوتی، بہُت کچھ ہے اس میں، اور نواب صمصام الدولہ کے دس ہزار مرید!"

"وہی طعنے،!"

سگن بولیں:

"طعنے وعنے کچھ نہیں۔ تم اب لکھنؤ میں نہیں رہ سکتے۔ تمھیں ہمارے ساتھ زیارت کو جانا پڑے گا، اگر یہاں رہنے پر ضد کی، تو جانِ عالم سے کہہ کر جلاوطن کرادوں گی، اور وہاں جاکر اگر واپس آنے کی کوشش کی تو چوری کے الزام میں گرفتار کرادوں گی!"

"ارے بھئی پھانسی دلا دینا، لیکن کون کمبخت یہاں اکیلا رہنا چاہتا ہے، ساری زندگی تمھارے ساتھ گزاری ہے، اور اب تمھارے بغیر رہ کر کیا کروں گا!"

"(زیرِ لب تبسّم کے ساتھ) ارے مُوئے کیوں اپنا ثواب غارت کرتا ہے!"

"ثواب غارت کرتا ہُوں؟"

"اور کیا؟ ہجرت خدا کے لیے کر، خدا کے رسُولؑ کے لیے کر، کسی آدمی کے لیے کیوں کرتا ہے؟ ہجرت بھی کی اور قبول بھی نہیں ہُوئی!"

"واقعی، ـــــــ"

"اور کیا غیر واقعی؟ کسی بھی عالم سے پوچھ کر دیکھ لو، خدا سے توبہ کرو، اور صرف خدا، اور رسُولؑ کے لیے ہجرت کرو، کسی انسان کا خیال دل میں نہ آنے دو!"

آتی رہو، جاتی رہو، ——— آل اولاد سے تعلق بھی قائم رہے، اور زیارت کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ ہمیشہ کے لیے، وطن کو خیرباد کہہ دینا ہماری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں بھئی!"

سگّن نے اپنی مشغولیت سے ہاتھ اٹھایا، اور کھڑی ہوگئیں، اور استاد کو گھُورتے ہوئے کہا:

"میں کہتی ہوں کچھ سٹھیا گیا ہے بُڈھے؟"

اس طرزِ تخاطب نے استاد کو حواس باختہ کر دیا:

"لاحول و لا قوۃ، ——— ہر وقت بوڑھے ہونے کا طعنہ! ——— اس مسئلے کا تعلق میرے بوڑھے یا جوان ہونے سے کیا ہے سگّن بی بی؟"

وہ اسی اکھڑے ہوئے لہجے میں کہنے لگیں:

"دنیا خوب دیکھ لی، ——— عیش خوب کر لیا، دولت خوب کما لی، آرزوئیں، اور حسرتیں خوب پوری کر لیں، میری بچّی خدا کے فضل سے شاہ بیگم بن گئی، اور اب اللہ کے کرم سے ایک خوب صورت سے بچّے کی ماں بھی ہے ——— خدا نے مجھ پر یہ احسانات کیے، ——— اور میں بندگی کا اتنا حق بھی ادا نہ کروں کہ زندگی کے یہ چند روز اس کے آخری رسولؐ کے آستانے پر جھاڑو دیتے گزار دوں؟ ——— تُف ہے مجھ پر، اور پھٹکار ہے تُم پر!"

استاد دو قدم پیچھے ہٹے، اور پُوچھا:

"مجھ پر بھی؟"

وہ بولیں:

"اور کیا ——— ؟ آخر تُو کیوں رہنا چاہتا ہے یہاں؟ کون سی کشش، کھینچ رہی ہے تجھے؟ ——— کیا پانچ سو ماہوار کا درماہہ؟ چل، میں دے

" اچھا بھئی معاف کرو !"

" معاف کیا، ـــــــــــ رات تہجّد کی نماز پڑھو، سچّے دل سے توبہ کرو، اور چپ چاپ سامانِ سفر تیار کرو، اور یہ طے کر کے چلو کہ اب واپس آنا نہیں ہے۔ مَیں تو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو چھوڑ کر جا رہی ہُوں، اور یہ مُوا۔ زندگی بھر کے ساتھ کا لحاظ بھی نہیں کرتا کہ میرے ساتھ ساتھ چلا چلے ـــــــــــ ارے مُوئے تُو اکیلا تو نہیں جا رہا ہے۔ مَیں بھی تو چل رہی ہُوں !"

" ہاں بھئی چلیں گے ـــــــــــ اور اب واپس آنے کا نام لیں، تو جو چور کی سزا وہ ہماری !"

◎

"(کان پکڑ کر) الٰہی میری توبہ (گریہ آلود آواز میں) میرے رب میری ہجرت قبول کرلے، جو صرف تیرے لیے، اور تیرے رسولؐ کے لیے ہے، کر رہا ہُوں۔ مولا، مَیں بہت گناہ گار ہوں، مجھے معاف کردے، میرے گناہ بخش دے!"

یہ دعا مانگ کر، استاد نے کندھے پر پڑا ہُوا انگوچھا اٹھایا، اور اس سے اپنے آنسو پُونچھے!"

سگّن نے کہا:

"واقعی قائل ہوگئی استاد مَیں تمھاری؟"

"قائل تو خیر کب نہ تھیں، لیکن اس وقت کس بات پر قائل ہوئیں؟"

"تمھارے رونے پر!"

"یہ کیوں بھائی؟ —— کیا آنسو نہیں نکلے میری آنکھوں سے؟"

"خوب نکلے، —— یہی تو کمال تھا۔ لیکن استاد چُوک ہوگئی تم سے۔ مَیں ہُوں، میری بچّی ہے۔ جانِ عالم ہیں، نازو ہے، نواب صمصام الدولہ ہیں، زمّرو ہے، پکھراج ہے، اور دوسرے بہت سے لوگ ہیں۔ وہ تو تمھاری اس ایکٹنگ سے دھوکا کھا سکتے ہیں اور تمھارے ان آنسوؤں سے فریب میں مبتلا ہوسکتے ہیں۔ لیکن تم یہ بھول گئے کہ خدا، دل کے بھید جانتا ہے، وہ عالم الغیب ہے۔ ہر بات اس کے علم میں ہے۔ لہٰذا وہ تمھارے ان مگرمچھ کے سے آنسوؤں کو خوب سمجھتا ہے، —— اور خوار ہوئے یہ حرکت کرکے!"

"یعنی اس بدگمانی کی بھی کوئی حد ہے! یہ مگرمچھ کے سے آنسو تھے؟ مَیں جھُوٹ مُوٹ رو رہا تھا، میں نے نعوذ باللہ خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کی؟ کہو سگّن؟"

سگّن نے کمر پر ہاتھ رکھے رکھے جواب دیا:

"ہاں، ہاں، ہاں، ———— تمھاری سات پُشتوں سے واقف ہُوں استاد، مجھ سے کیا اڑو گے؟"

زینت اور شان و تجمّل کے اعتبار سے وہ بھی کچھ کم نہ تھے۔

شاہی بجرے میں حضرت جان عالم، نواب حضرت محل، نازو، زمرد، نواب منّن خاں، نواب صمصام الدولہ، دوسرے بجروں میں، دوسرے ارکان دوست، اور رؤسائے شہر، کوئی چھ بجروں کا یہ بیڑا تھا، گومتی اس وقت طوفان پر آئی ہوئی تھی، سیلاب تھا کہ بڑھتا ہی چلا جارہا تھا۔

یہ بجرے، بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ لوہے کے پل لے کی طرف روانہ ہوئے، پل پر اہالیانِ شہر کا انبوہ لگا ہوا تھا، کچھ تو اس لیے کہ خبر مشہور ہو چکی تھی، شاہی بجرا اس طرف آرہا ہے، اور لوگ، اپنے محبوب فرماں روا، اور اس کی ملکہ کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے بے تاب تھے، اور کچھ اس لیے کہ مدتوں سے یہ رسم چلی آرہی تھی، کہ گومتی میں جب سیلاب آتا تو اس پل کی بلندی سے لکھنؤ کے مشہور پیراک دریا میں کودتے اور اپنے پیرنے کے کمالات دکھاتے، زندہ دلانِ لکھنؤ ایسے موقعوں کے منتظر رہتے تھے، اور اپنے شہر کی آبرو بڑھانے والے یہ کمالات دیکھنے کے شائق رہا کرتے تھے،

پل سے کودنے کا وقت ہو چکا تھا، لیکن اب تک غوطہ خوروں، اور پیراکوں میں سے کسی نے کمالات دکھانے کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔

یہ لوگ بھی منتظر تھے کہ شاہی بجرا اس طرف آلے تو اپنا کام شروع کریں، جانِ عالم کا معمول تھا، ان کے سامنے اگر اس طرح کے کمالات دکھائے جاتے تھے تو وہ ان لوگوں کو انعامات اور تحائف سے نوازتے تھے۔

یکایک شور مچا، ——

"وہ رہا، ——

"شاہی بجرا آگیا، ——

لے : یہ بھی ایک قدیم اور مشہور پل ہے جو اب تک موجود ہے۔

(۷)

آج جان عالم چھتر منزل لے میں رونق افروز ہیں، حضرت محل بھی ساتھ ہیں، برسات کا موسم ہے، محل کے اندر خوب چہل پہل ہو رہی ہے، نازو بھی آئی ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے صمصام الدولہ بھی موجود ہیں۔

حضرت محل نے جان عالم سے کہا :

" آج تو دریا کی سیر کرنے کو جی چاہتا ہے جان عالم اس بندی کا ! "

جان عالم نے بڑے چاؤ، اور پیار سے جواب دیا :

" ہاں ضرور ——— ابھی انتظام ہُوا جاتا ہے ! "

اور واقعی جان عالم کا اشارہ پاتے ہی ذرا سی دیر میں بجرے گھاٹ پر آ لگے، جو عین محل کی دہلیز کے پاس تھا، شاہی بجرا تو بجائے خود ایک شاندار محل تھا ——— نہایت قیمتی فرنیچر، کئی کمرے، ہر کمرے میں گراں قیمت قالین اور غالیچے، خاصا لمبا چوڑا عرشہ، اس پر بھی مختلف مقامات پر بیٹھنے، اور ریلنگ کے سہارے دریا کی طوفاں بدوش لہروں کا نظارہ کرنے کا انتظام۔ دوسرے بجرے، اتنے شاندار تو نہ تھے، لیکن زیب و

لے : دریائے گومتی کے کنارے یہ نہایت شاندار، حددرجہ سبک و نازک شاہی محل تھا، جو اب تک موجود ہے، انگریزوں کے زمانے میں اسے کلب بنا لیا گیا تھا، ——— اور اب بھارت کی حکومت نے کچھ سرکاری دفاتر یہاں منتقل کر دیئے ہیں۔

"کہو شوق سے کہو!"

"آج شہر کے چوٹی کے پیراک اور ملنے ہوئے غوطہ خور حاضر ہیں، یہ لوگ پُل سے دریا میں کودیں گے اور اپنی پیراکی کے کمالات دکھائیں گے! —— کیا حضرت جان عالم کی اجازت ہے؟"

"شوق سے!"

"یہ لوگ اپنے آقا کو اپنے کمالات دکھانے کے لیے بے چین ہیں!"

"ہماری طرف سے اجازت ہے!"

اس شخص نے حضرت جان عالم کا شکریہ ادا کیا اور ادب کے ساتھ اُلٹے پاؤں قدم رکھتا واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد حضرت جان عالم نے ملکہ حضرت محل، نازو، زمرد، نواب منن خاں، اور نواب صمصام الدولہ کو بھی طلب کیا، جو اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے تھے، یہ لوگ جب ملکہ حضرت محل کی قیادت میں حاضر ہوئے تو حضرت جان عالم نے فرمایا:

"بھئی آج پیراک اپنے اپنے کمالات دکھائیں گے —— کیا تم لوگ نہیں دیکھو گے؟"

حضرت محل نے آداب شاہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ادب سے جواب دیا:

"جان عالم مجھے تو بڑی تمنا ہے، اس طرح کے کمالات دیکھنے کی، چرچا بہت سُنا ہے مگر بہ چشم خود دیکھنے کا موقع کبھی نہیں ملا!"

◎

"دیکھتے نہیں جانِ عالم خود بہ نفسِ نفیس عرشے پر کھڑے ہوئے ہیں!"

"بس اب مزہ آئے گا! ــــــ"

واقعی شاہی بجرا اسی طرف دریا کا دھارا کاٹتا، تیزی سے آ رہا تھا، اور خلقت کا یہ عالم تھا کہ وہ جانِ عالم کو ایک نظر دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ ــــــ

بجرا آیا،

اور کنارے کی طرف ایک گوشے میں کھڑا ہو گیا۔

ذرا دیر میں دوسرے بجرے جو عقب میں آ رہے تھے، وہ بھی آ گئے اور ذرا سا فاصلہ دے کر انھوں نے بھی لنگر اٹھا دیئے۔

جانِ عالم اب عرشے پر کھڑے ہوئے تبسّم فرما رہے تھے، اور انھیں دیکھ دیکھ کر خلقت خوشی سے بے خود ہوتی جا رہی تھی اور طرح طرح کے نعرے لگا رہی تھی!

اتنی دیر میں ایک کشتی پر شہر کے پیراکوں اور غوطہ خوروں کا نمائندہ حاضر ہُوا، اور اس نے اذنِ باریابی طلب کیا،

جانِ عالم نے اسے فوراً اپنے حضور میں طلب کر لیا۔

اس نمائندے نے کہا:

"حضرت جانِ عالم کے دیدار کے لیے یہ خلقت پہروں سے کھڑی ہے اور شرفِ دیدار حاصل کر کے مسرت سے بے خود ہوئی جا رہی ہے۔ ــــــ"

جانِ عالم نے قطعِ کلام کرتے ہُوئے فرمایا:

"ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ ہم جانتے ہیں ہماری رعایا ہمیں کس درجہ محبُوب رکھتی ہے، اور خود ہمارا بھی یہی حال ہے!"

"بے شک، بجا ارشاد فرمایا، حضرت جانِ عالم نے، ــــــ لیکن یہ غلام ایک خاص معروضہ لے کر حاضر ہُوا تھا!"

تہ نشین رہا۔ حضرت محل نے جانِ عالم سے کہا :

" یہ تو گیا، ——————

ابھی جانِ عالم نے جواب نہیں دیا تھا کہ بالکل بجرے کے سامنے وہ نمودار ہُوا، سر جھکا کر اپنے بادشاہ ذی جاہ کو آداب بجالایا۔ اس کے بعد۔ اس نے لیٹ کر —— جیسے کوئی مسہری پر لیٹا ہو —— پیرنا شروع کیا، دور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا تھا آرام سے لیٹا ہُوا ہے، قریب سے دیکھئے تو اندازہ ہوتا تھا آہستہ آہستہ پیر رہا ہے "!

حضرت محل نے بے ساختہ کہا :

" کیا کمال ہے ؟"

جانِ عالم نے فرمایا :

" لکھنؤ کو ایسے باکمالوں پر فخر ہے !"

اتنے میں یاور علی اٹھ بیٹھا، اور ایک مرتبہ پھر اس نے غوطہ لگایا، کوئی پندرہ منٹ کے بعد، وہ پُل کے پاس نمودار ہُوا، اس کا بھی لوگوں نے قلندر بخش کی طرح استقبال کیا اور اس کے فن کی خوب داد دی !"

یاور علی کے بعد، ایک اور شخص امداد علی نے پُل پر سے چھلانگ لگائی، وہ کبھی کھڑا ہوتا، کبھی بیٹھتا، کبھی لیٹتا، لیکن مسلسل پیرتا ہُوا شاہی بجرے کی طرف بڑھا۔ حضرت محل نے کہا :

" یہ تو سب سے بازی لے جاتا ہُوا معلوم ہوتا ہے ؟"

جانِ عالم نے ارشاد فرمایا،

" ہاں بھئی معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے، بدن پر اتنا قابو کہ اس پُر زور سیلاب میں بھی، جب چاہے کھڑا ہو جائے، جب چاہے لیٹ جائے، جب چاہے بیٹھ جائے، بہت بڑا کمال ہے !"

حضرت محل نے کہا :

" یہی تو بندی بھی عرض کر رہی تھی !"

(۸)

لوہے کا پل، خاصا اونچا پل ہے۔ اتنی اونچائی سے بل کھاتے، ناچتے، گرجتے، شور مچاتے پانی میں کودنا بڑے دل گردے کا کام تھا، بہتوں کا تو اتنی اونچائی سے نیچے دریا کی طرف دیکھنے ہی سے پتّہ پانی ہو جاتا تھا۔

بہرحال شاہی بجرے سے جیسے ہی سفید رومال لہرایا گیا، لکھنؤ کے استاد قلندر بخش نے پُل پر کھڑے ہو کر ایک مرتبہ "یا علی" کا نعرہ لگایا، اور پانی کے اندر!

یہ منظرِ عام دیکھ کر عالم لوگ بھی سراسیمہ ہو گئے لیکن حضرت محل پر تو اختلاج کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے بڑے اضطراب کے ساتھ جان عالم سے پُوچھا:

"جانِ عالم، کیا یہ آدمی ڈوب گیا؟"

وہ ہنس پڑے، اور فرمایا:

"نہیں بھئی، ابھی اُبھرتا ہے، ——— وہ دیکھو!"

اب جو حضرت محل نے نظر اٹھا کر دیکھا تو قلندر بخش پل سے خاصے فاصلے پر، اور شاہی بجرے سے قریب نمُودار ہُوا، وہ پالتی مار کر پانی پر بیٹھا ہُوا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا چارپائی پر بیٹھا ہے لیکن پاؤں کے انگوٹھے سے پَیر رہا تھا، اسی طرح پیرتا پَیرتا وہ بالکل بجرے کے سامنے آیا، جانِ عالم کو سر جھکا کر سلام کیا، اور پھر غوطہ لگایا، اور پُل کے پاس جا کر نکلا، لوگوں نے وفُورِ مسّرت سے اسے کندھے پر اٹھا لیا، اور خوب داد دی۔

اس کے بعد، ایک اور نوجوان بادر علی نے پُل سے چھلانگ لگائی اور کوئی پندرہ منٹ تک

"جی ہاں، اب چلنا چاہیئے، آج آپ نے ریذیڈنٹ، اور ریذیڈنسی کے بعض افسروں کو کھانے پر بھی مدعو کیا ہے!"

جانِ عالم نے بجرا واپس لے چلنے کی ملاح کو ہدایت دیتے ہوئے زیرِلب تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا:

"ہاں، ہمیں یاد ہے، اور اسی لیے ذرا پہلے چل رہے ہیں ورنہ یہ تماشا ابھی کچھ دیر اور دیکھتے، ــــ لکھنؤ کے باکمالوں کا فن اب تک کتنے عروج پر ہے یہ آج کی دعوت میں تمھیں معلوم ہوگا۔"

وہ مسکراتی ہوئی بولی:

"وہ تو ہر بات میں، اور ہر جگہ نظر آتا ہے!"

بہت جلد بجرا چھتر منزل میں پہنچ گیا، اور یہ لوگ قصرِ شاہی میں داخل ہو گئے۔ حضرت محل کو اس بات پر حیرت تھی کہ اس دعوت کے اہتمام کے سلسلے میں جانِ عالم نے اسے کوئی ذمے داری کیوں نہیں سونپی!"

اتنے میں امداد علی بالکل مجرے کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا، اور کھڑے کھڑے سلطان والا شان کو کورنش بجالایا۔

حضرت محل، جان عالم، اور دوسرے لوگوں کو توقع تھی کہ اب وہ اپنے کچھ کمالات دکھائے گا لیکن وہ مجرے کے سامنے آ کر ایک ستون کی طرح کھڑا ہو گیا، جس میں نہ کوئی جنبش تھی، نہ حرکت، یہ معلوم ہوتا تھا کوئی لکڑی کا لٹھ گاڑ دیا ہے کسی نے پانی میں، کامل نصف گھنٹے تک وہ اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا، پھر اس نے عرض کیا:

"حضرت جان عالم کیا اب غلام کو واپس جانے کی اجازت ہے؟"

جان عالم نے اس کے اس کمال سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا:

"تم نے ہمیں خوش کر دیا، واقعی تم باکمال آدمی ہو!"

وہ اسی طرح کھڑے کھڑے آداب بجالایا، اس کے بعد غوطہ لگایا، اور پل کے قریب جا کر ابھرا، ــــــ لکھنؤ والوں نے اس کا پہلے دونوں باکمالوں سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا۔

امداد علی کے بعد اور بھی کئی لوگوں نے اپنے اپنے کمالات دکھائے [۱]، جب کافی دیر ہو گئی تو جان عالم نے ارشاد فرمایا:

"اب واپس چلنا چاہیئے۔"

حضرت محل، اور نازو وغیرہ کا ابھی جی نہیں بھرا تھا، لیکن نطق شاہی کے خلاف کچھ عرض کرنے کی کسے جسارت ہو سکتی تھی؟ چنانچہ حضرت محل نے کہا:

---

[۱]: مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے اپنی کتاب "ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" ــــــ جو "گزشتہ لکھنؤ" کے نام سے بھی معروف ہے ــــــ میں لکھنؤ کے ان باکمالوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو مختلف فنون میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے، اسی کتاب میں انھوں نے لکھنؤ کے پیراکوں کا ذکر بھی کافی شرح و بسط سے فرمایا ہے۔

رکھتے تھے، وہ شعروشاعری سے اس درجہ دلچسپی رکھتے تھے کہ شہر میں معززین کے ہاں جومشاعرے ہُوا کرتے تھے، ان میں نہایت شوق اور جوش کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے، ——— اچھے اشعار کی دل کھول کر داد دیتے تھے، اور ان میں سے بعض تو ایسے تھے جو خود بھی شاعری کرتے تھے اور مشاعروں میں اپنا کلام سُنایا کرتے تھے اور داد حاصل کیا کرتے تھے۔

ان میں سے اکثر لوگوں نے تو یہ وضع و طریق سیاسی مصالح کی بنا پر اختیار کیا تھا، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جنھیں لکھنؤ کی تہذیب، تمدّن، معاشرت، اور سوسائٹی کچھ ایسی پسند آگئی تھی کہ واقعی وہ لکھنوی ہوکر رہ گئے تھے، ——— انھوں نے لکھنؤ کی عورتوں سے شادیاں کرلی تھیں، ان کے رہن سہن، کھانے پینے اور دوسرے طور طریق سے لکھنویت کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ جب یہ اپنی ملازمت سے استعفا دیتے، یا پنشن لیتے، تو اپنے وطن ——— انگلینڈ ——— نہ جاتے، لکھنؤ ہی میں مستقل اقامت اختیار کرلیتے [1]،

موجودہ ریذیڈنٹ، زبان کے میٹھے، برتاؤ کے نیک، اور، عام اصُول کے لحاظ سے مردِ معقول تھے۔

---

[1]: "شبابِ لکھنؤ" ——— ایک فرنگی کی لکھی ہُوئی کتاب ہے، اس میں اس نے دربارِ لکھنؤ کی مرقع کشی کی ہے، اور اپنے نقطۂ نظر سے صورتِ احوال کا نقشہ کھینچا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے ان انگریزوں، اور فرانسیسیوں کا ذکر بھی کیا ہے، جو لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت سے اس درجہ متاثر ہوئے تھے کہ بالکل اسی رنگ میں رنگ گئے تھے، اور اپنے وطن اور وہاں کی روایات کو بالکل بھول گئے تھے۔

(۹)

نواب ریذیڈنٹ بہادر، اگرچہ برطانوی سامراج کے نگہبان اور نمائندے تھے، اور رفتہ رفتہ اودھ کی حکومت پر شاہانہ اختیارات انھوں نے حاصل کر لیے تھے، لیکن اب تک جو اصول برتے جا رہے، اور آداب بجا لائے جاتے رہے تھے، ان میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

نواب ریذیڈنٹ بہادر انگریز تھے، لیکن شاہی دربار میں، جب حاضر ہوتے، یا شاہی ضیافت میں انھیں شرکت کا اعزاز حاصل ہوتا تو وہ بالکل بدل جاتے تھے۔

ایسے مواقع پر انگرکھا زیب بر کرتے، لکھنوی جوتے پہنتے، سر پر شاہی دربار میں حاضر ہونے والی ٹوپی رکھتے، رنگت سے کوئی دھوکا کھا جائے تو کھا جائے ورنہ ان کا لباس اور وضع و طریق دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ خالص لکھنوی نہیں ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُردو زبان پر عبور رکھتے تھے، نہ صرف یہ کہ اردو بہت اچھی بول لیتے تھے، بلکہ روز مرہ اور محاورات پر بھی ان کی نظر بہت وسیع تھی، شعر و شاعری سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، اساتذہ کے سینکڑوں شعر نوکِ زبان تھے، بڑے موقع سے اور بڑے صحیح تلفظ کے ساتھ انھیں پڑھا کرتے تھے، بلکہ بعض اساتذہ کا اور ان کے فن کا، اور زبان و بیان کا موازنہ بھی کیا کرتے تھے، اور بالعموم ان کی رائے بہت متوازن ہُوا کرتی تھی۔

جو انگریز، ——— بالواسطہ، یا بلاواسطہ شاہی دربار سے تعلق

کے ساتھ، آہستہ آہستہ اور دھاتی طاقت حاصل کرے گا کہ وہ اپنی خودمختاری کا تحفظ کر سکے،
جو بات آج ناممکن ہے، وہ کل ممکن ہو سکتی ہے! ——————
تاریخ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے!
یہی سوچ کر، وہ اپنے اور انگریزوں کے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار رکھنا چاہتے تھے!
اور چونکہ انھیں موجودہ ریذیڈنٹ کے ارادوں کی سن گن مل چکی تھی، اس لیے آج انھوں نے اس کی دعوت کی تھی کہ ذرا اسے ٹٹولیں اور اگر اسے کوئی بدگمانی ہو، تو اسے رفع کرنے کی کوشش کریں —— !

◎

لیکن، برطانیہ کے سامراجی مفادات کی جیسی نگہداشت یہ کرتے تھے، آج تک ان سے پہلے کسی ریذیڈینٹ نے نہ کی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لکھنؤ، انھیں کچھ ایسا بھایا تھا، ——— یہاں کی سرسبزی، شادابی، زرخیزی، اور دولت مندی نے ان کا دل کچھ اس طرح موہ لیا تھا کہ پورے ملکِ اودھ کو انگریزی حکومت میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

یہ بات اب تک ان کی زبان پر نہیں آئی تھی۔

لیکن ان کے انداز و اطوار سے یہ چیز نمایاں تھی۔

جانِ عالم واجد علی شاہ، جانتے تھے کہ بکسر کی شکست کے بعد، اب اودھ میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ انگریزوں سے لڑ سکے، اگرچہ رعایا میں وہ حد درجہ محبوب تھے، اور ہندو، مسلمان یکساں طور پر ان سے والہانہ عقیدت اور محبت رکھتے تھے۔ اور اگر کوئی وقت آتا تو یہ رعایا، اپنے بادشاہ اور اس کی مملکت کے تحفظ کے لیے جان پر کھیل جاتی، اور سب کچھ کر گزرتی، ——— یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی جانِ عالم کی کوشش اور خواہش یہی تھی کہ ٹکر کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ آخر کار ٹکر کا انجام شکست ہی کی صورت میں نکلے گا!

اسی احساس کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ سرکار برطانیہ کی ہر بات مان لیتے تھے، روپیہ، زمین، گاؤں شہر، جس چیز کا مطالبہ ہوتا، وہ ایں و آں نہ کرتے، خاموشی سے سپر انداز ہو جاتے!

ایسا کیوں تھا؟

وہ جانتے تھے انگریزوں سے لڑائی میں وہ جیت نہیں سکتے!

لیکن انھیں یقین تھا کہ اگر انگریزوں کو خوش رکھا جائے، انھیں کسی شکایت کا موقع نہ دیا جائے، ان کے ہر مطالبے کے آگے گردن جھکا دی جائے، تو اودھ کی حکومت قائم رہے گی، اور اس حکومت کے قائم رہنے کا مطلب یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی زمانے میں، خاموشی

جان عالم نے سچے دل سے کہا :

" ہم ، سرکارِ برطانیہ کی عزّت کرتے ہیں ، اس سے اپنے تعلقات زیادہ سے زیادہ محکم ، اور مستحکم کرنا چاہتے ہیں ، آپ سلطنتِ برطانیہ کے نمائندے اور ترجمان ، اور نقیب ہیں ، ـــــــــ ہمارا فرض ہے ، کہ آپ سے طعام و کلام کا سلسلہ جاری رکھیں ، تاکہ اگر ہمیں کوئی شکایت ہو تو آپ کے گوش گزار کر دیں ، آپ کو اگر کوئی شکایت ہو ، تو ہمارے سمع مبارک تک پہنچا دیجیے ، باہمی افہام و تفہیم اسی کا نام ہے ، اور اس طرح اصل مقصد یعنی دونوں حکومتوں کے تعلّقات میں دوام و استحکام پیدا ہو سکتا ہے ! "

ریذیڈنٹ بڑے ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر کورنش بجالایا ، پھر اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے کہا :

" بے شک عالی جاہ ! "

پھر کچھ سوچتے ہوئے کہنے لگا :

" اگرچہ سلطنتِ برطانیہ کی بالادستی شک و شبہ سے ماوراء ہے ، ـــــــــ لیکن میری حکومت ، اودھ کی حکومت سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی متمنّی ہے ! "

جان عالم نے فرمایا :

" پھر انشاء اللہ ہمارے مابین کبھی غلط فہمی نہیں ہوگی ، ـــــــــ ایک مرتبہ پھر ، ـــــــــ ہم آپ پر واضح کر دینا چاہتے ہیں ، کہ اگر کبھی کوئی توجہ طلب مسئلہ نظر کے سامنے آئے ، تو ہمیں اپنے مشوروں سے ضرور شاد کیجیے ! "

ریذیڈنٹ نے عاجزانہ اور نیازمندانہ طریقہ برقرار رکھتے ہوئے سنجیدگی

(۱۰)

جان عالم نیک، سادہ لوح، اور شریف آدمی تھے، اور اپنی کمزوری کو ضرورت سے زیادہ محسوس کرتے تھے۔

ریذیڈنٹ اتنا ہی ہوشیار، زمانہ ساز، مصلحت سنج، اور دوراندیش آدمی تھا، وہ تلوار میان سے باہر نکالنے سے پہلے، دوستی اور دل داری کی باتیں کرنے اور، تلوار نکالتے ہی آخری اور فیصلہ کن وار کرنے کا قائل تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سیاست اور امورِ مملکت کو سمجھنے اور برتنے میں دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

وقتِ مقررہ پر قصرِ شاہی میں وہ پہنچ گیا، اس کا شایانِ شان استقبال کیا گیا، اس کے عملے کے لوگوں، اور دوسرے عہدے داروں کی بھی اچھی طرح پذیرائی کی گئی۔

ریذیڈنٹ سیدھا، بادشاہ کے کمرے میں پہنچا، ——— آداب اور کورنش بجا لایا، نذر پیش کی، خالص دیسی لباس میں حاضر ہوا، اور بڑی فصیح و بلیغ اردو میں اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

اُس نے کہا:

"اس بندۂ بے دام کی اس سے بڑی عزت افزائی کیا ہوسکتی ہے کہ اعلیحضرت نے اسے کھانے کی دعوت دی!"

"کیا یہ کوئی قابلِ اعتراض بات ہے؟"

"قابلِ اعتراض" کہنا تو مشکل ہے، لیکن حضور کے شایانِ شان نہیں۔ بھلا، عام لوگوں سے سرکار کے ربط و ضبط، اور اختلاط کو از روئے سیاست کیسے مناسب سمجھا جا سکتا ہے؟"

"تو ایسے مواقع پر بھی ہمیں نہ جانا چاہیئے؟"

"فدوی کی ذاتی رائے تو یہی ہے!"

" (ایک آہ سرد کے ساتھ) اچھا، آئندہ ہم خیال رکھیں گے!"

"فدوی کو حضور والا سے اسی جواب کی توقع تھی!"

"اور وہ دوسری بات؟ ——— کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

"وہ بہت اہم ہے، اس پر اس سلطنت کے قیام و بقا کا انحصار ہے، اس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے، ورنہ میری حکومت کو مداخلت کر کے کوئی ایسی کارروائی کرنا پڑے گی، جو یقیناً حضور والا کے لیے تکلیف دہ ہو گی!"

"آخر کیا بات ہے وہ؟"

"وہ ہے مسجد بابری کا مسئلہ؟"

"یعنی؟"

"اس مسجد پر، جو ہندوؤں کے مقدس مقام پر بنائی گئی ہے، ہندو قابض ہو چکے ہیں، مسلمان بے دخل ہو چکے ہیں، لیکن امیٹھی کا ایک سر پھرا ملا امیر علی نعرۂ جہاد بلند کر کے میدان میں اترا ہے، اسے روکنا چاہیئے، نہ مانے تو قتل کر دینا چاہیئے۔ [1]

---

[1]: حضرت امیر علی شہید، انگریزی فوج سے لڑتے ہوئے، اس مسجد کی واگذاری کے لیے شہید ہو گئے، بعد میں ——— غدر کے بعد ——— مسلمانوں کا اس پر قبضہ ہو گیا لیکن اب بھارت کی حکومت نے پھر اس پر ہندوؤں کا قبضہ تسلیم کر لیا ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ کہا :

" بجا ارشاد فرمایا ، اعلیٰ حضرت نے ——— حکومتِ برطانیہ کی نمائندگی سے قطع نظر اسے مَیں اپنا ذاتی فرض سمجھتا ہُوں !"

جانِ عالم نے فرمایا :

" یہ آپ کی شرافت و نجابت کی انتہا ہے !"

ریذیڈنٹ نے مؤدبانہ انداز میں کہا :

" فی الحال دوؔ امور ایسے ہیں ، جنہیں میں سمع ہمایونی تک پہنچانا چاہتا ہوں ؟"

جانِ عالم نے کہا :

" ضرور ، ضرور ——— فرمایئے ، ہم ان پر پوری توجہ کریں گے !"

ریذیڈنٹ نے کہا :

" ایک تو یہ رعایا سے حضور کا زیادہ اختلاط ، مناسب نہیں ہے !"

" (دل میں رنجیدہ ہوکر) لیکن ہم کب ایسا کرتے ہیں ؟ ہم تو مہینوں محل سے باہر نہیں نکلتے ، وقت کا بڑا حصّہ راگ و رنگ اور عیش و عشرت ، یا ناٹک اور رہس وغیرہ میں صرف کرتے ہیں !"

" یہی حضور جانِ عالم کے شایانِ شان ہے ——— لیکن آج تو حضور نے اپنا اصول توڑا !"

جانِ عالم نے پوچھا :

" وہ کیسے ؟"

ریذیڈنٹ نے بتایا :

" شاہی بجرے پر سوار ہوکر ، لوہے کے پُل تک تشریف لے گئے ——— غوطہ خوروں ، اور پَیراکوں کا تماشا دیکھا !"

(۱۱)

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی رسمی باتیں ریذیڈنٹ بہادر، اور شاہ والا جاہ کے درمیان ہوتی رہیں۔ پھر کھانے کا وقت آگیا، اور شاہ اپنے وزرا کے ساتھ، اور ریذیڈنٹ اپنے حکام کے ساتھ کھانے کے کمرے میں پہنچے، ریذیڈنٹ کی وجہ سے کھانے کا انتظام میز کرسی پر کیا گیا تھا کہ ان انگریز حضرات کو کسی طرح کی کھانے میں دقت اور دشواری نہ ہو۔

شاہی رکاب داروں نے، آج اپنا سارا ہُنر صرف کر دیا تھا۔!

بادشاہ نے ایک نظر حاضرین پر ڈالی، اور فرمایا :

"بسم اللہ۔!"

کھانا شروع ہو گیا،

ریذیڈنٹ کے سامنے ایک بڑی سی قاب بریانی کی، اور اس کے پاس ایک چینی کا ڈونگا قورمے کا، اور ساتھ ہی ایک پلیٹ میں شامی کباب رکھے ہوئے تھے اتفاق سے ریذیڈنٹ کو یہ چیزیں مرغوب بھی کافی تھیں، اس نے اپنی پلیٹ میں بریانی ڈالی، اور پہلا ہی لقمہ کھا کے مبہوت رہ گیا۔

یہ بریانی کہاں تھی ؟

یہ تو چاولوں کی صُورت کی، نہایت اعلٰے درجے کی شیریں ڈش تھی، ہر چاول رس، بالائی، اور شکر سے بھرا ہُوا تھا، ——— جو بوٹیاں تھیں، وہ بھی درحقیقت گلاب جامن تھیں، اور حد درجہ لذیذ اور خستہ!

" لیکن مسجد ہر حالت میں مسجد ہے، آپ کو تو یہ کہنا چاہیئے کہ وہ ہندوؤں سے چھین کر مسلمانوں کو دے دی جائے، نہ کہ آپ اُلٹی بات کہہ رہے ہیں ؟"

" حضور والا فدوی کی یہ گزارش ہے کہ اجودھیا، جہاں یہ مسجد واقع ہے، ہندوؤں کا مقدس مقام ہے، بابر کو کیا حق تھا کہ یہاں مسجد بناتا ؟ اگر یہ مسجد قائم رہی تو ہندوؤں کی دل شکنی ہوگی، اور آپ کی رعایا میں، غالب ترین اکثریت انھی کی ہے !"

" تو، ————"

" جی ہاں امیر علی کو قتل کر دینا چاہیئے، ورنہ اسے واپس جانے پر آمادہ کرنا چاہیئے۔ ان دونوں میں سے ایک کام حضور کو کرنا ہی ہوگا !"

" ہم سوچیں گے "

" ضرور سوچیے، لیکن فدوی کی گزارش ملحوظ خاطر رہے !"

◎

بقیہ حاشیہ، صفحہ نمبر ۲۹۷ :

مسجد بابری کی تاریخ، " تاریخ اودھ " اور " تاریخ اجودھیا " اور " قیصر التواریخ " وغیرہ سے معلوم کی جاسکتی ہے۔

آج تک نہیں کھائی تھیں۔
سامنے ایک نہایت خوب صورت گلدستہ رکھا تھا، اس میں گلاب کے، موتیا کے، موگرے کے، اور دُوسرے بہت سے پھُول لگے ہوئے تھے، اور سب کی خوشبو الگ الگ محسوس ہو رہی تھی۔

حضرت جانِ عالم نے نواب ریذیڈنٹ سے کہا:

"یہ گلدستہ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟"

موصوف نے جواب دیا:

"بہت اچھا ہے، اتنی اچھی اور بھینی خوشبو، مزہ آگیا!"

حضرت جانِ عالم نے ارشاد فرمایا:

"لیکن یہ اپنی قسمت کا شاکی ہے، محروم تو یہ ہے اب تک؟"

ریذیڈنٹ بہادر نے اسے اٹھایا، سُونگھا، اور گہری سانس تک سے کر دیر تک سُونگھتے رہے، پھر اسے اس کی جگہ رکھ دیا، اور فرمایا:

"کیوں نہ ہو آخر شاہی چمنستان کے پھُول ہیں!"

بادشاہ سلامت مسکرائے، اور فرمایا:

"لیکن چکھیئے بھی تو سہی؟"

ریذیڈنٹ بہادر نے سراپا حیرت بن کر سوال کیا:

"چکھوں؟ ——— پھولوں کو چکھوں، یہ کیا فرما رہے ہیں جانِ عالم؟"

جانِ عالم نے اصرار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"یہ پھُول سونگھنے کے نہیں کھانے کے ہیں!"

ریذیڈنٹ بہادر نے ایک تعجب بھری نظر حضرت جانِ عالم پر، پھر گلدستے پر ڈالی، اور چمبیلی کا ایک پھُول لے کر مُنھ میں رکھا، اور یہ محسوس کر کے غرقِ حیرت رہ گئے کہ

ریذیڈنٹ مسکرایا، !

اور یہ " بریانی " جلدی سے اس نے ختم کی، پھر قورمے کی ڈونگے کی طرف ہاتھ بڑھایا، اور ایک دوسری پلیٹ میں قورمہ ڈالا، قورمے کی مہک نے اس کا مشام جان معطر کر رکھا تھا، ——— " بریانی " کھا کر منھ ضرورت سے زیادہ میٹھا ہو گیا تھا، سوچا، ذرا قورمہ چکھ لے۔ سامنے شیرمال کی پلیٹ بھی رکھی ہوئی تھی منھ میں قورمے کا لقمہ رکھا تو عجیب کیفیت، رنگ سالن کا، نہایت لذیذ قسم کا شیریں مشروب، اور رطابہ میں جو بوٹیاں نظر آرہی تھیں، وہ نہایت مزے دار، رس گلے، ——— ریذیڈنیٹ مسکرایا، اور یہ چیزیں بھی نوش جان کر گیا۔

سامنے کبابوں کی پلیٹ رکھی ہوئی تھی، اور ان سے مہک اٹھ رہی تھی، ——— بالکل تازہ، اور خستہ۔

پلیٹ میں دو کباب رکھے، سوچا اس طرح منھ نمکین کرلے،

لیکن یہ کباب کہاں تھے؟ ———

یہ تو بہت اعلے درجے کی بالو شاھیاں تھیں، ——— جو بالکل کباب کی طرح بنی ہوئی تھیں، !

ایک اور پلیٹ تھی !

جس میں تازہ تازہ، عمدہ عمدہ، چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بھنی ہوئی، اور تلی ہوئی رکھی تھیں، !

ریذیڈنٹ بہادر نے سوچا، یہاں تو دھوکا کھانے کا کوئی امکان نہیں ہے، منھ نمکین کرنے کی اس سے عمدہ کوئی صورت نہیں ہوسکتی، چنانچہ مچھلی کا ایک قتلہ اپنی پلیٹ میں ڈالا، اور چھری سے کاٹ کر، کانٹے کے سہارے منھ میں رکھا، اور منھ، ——— دہنِ شیریں بن گیا تھا، یہ اتنی اعلے درجے کی رس ملائیاں تھیں کہ صاحب بہادر نے،

اب آدابِ دربار کو بالائے طاق رکھ کر، موصوف نے ارشاد فرمایا :

"حضورِ والا، فدوی نے آج مٹھائی بہت کھالی، اب ذرا بھی گنجائش نہیں ہے!"

جان عالم نے تبسم فرمایا، اور کہا :

"شروع تو کیجئے!"

اور واقعی ریذیڈنٹ نے جب شروع کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مٹھائی کی صورت کے یہ بہترین نمکین کھانے، شامی کباب، کوفتے، قورمہ، بریانی، دہی بڑے، اور طرح طرح کے ماکولات سے عبارت تھی، وہ کچھ جھینپ سے گئے، ایک دفعہ جان عالم کو دیکھ کر، مسکرایا، اور مسکرا کر اس نے کھانا شروع کر دیا۔

◎

واقعی یہ نہایت خوش رنگ اور خوش مزہ مٹھائی تھی۔

جانِ عالم نے گلاب کا ایک پھُول اپنے دستِ مبارک سے توڑا، اور ریذیڈنٹ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا :

"اسے بھی نوش فرمایئے!"

ریذیڈنٹ بہادر نے گلاب کا پھُول ہاتھ میں لے کر دیکھا، خالص گلاب کا پھُول، وہی رنگ، وہی خوشبو، وہی پتیاں، کانٹے تک موجود، ——— اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہنے لگے :

"اسے بھی کھاؤں؟"

جانِ عالم نے ایک دل نواز تبسم کے ساتھ فرمایا :

"ضرور، ——— لیکن کانٹے نہ نکال پھینکئے گا!"

منھ میں رکھتے ہی کانٹے، حلوہ بن گئے، اور پھول بھی حلوہ ہی ثابت ہُوا۔ کھا چکنے کے بعد ریذیڈنٹ صاحب نے کہا :

"کمال ہے حضور والا،!"

حضور والا نے جواب دیا :

"ہمارے خاص رکاب داروں اور باورچیوں نے صرف آپ کے لیے اپنی جودتِ طبع اور ذکاوت و ذہانت سے یہ الوانِ نعمت تیار کیے ہیں!"

پھر حکم دیا :

کھانا حاضر کیا جائے!"

ذرا دیر میں یہ بظاہر نمکین لیکن درحقیقت میٹھی چیزیں دسترخوان سے اٹھالی گئیں، لیکن ریذیڈنٹ صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب پھر مختلف قسم کی مٹھائیاں سامنے رکھی تھیں۔ امرتی، گلاب جامن، رس گلے، رس ملائی، اور دوسری درجنوں قسم کی مٹھائیاں،

تبسّم فرمایا، اور کہا :

" اس کی بے بسی پر مجھے اس وقت بہت ترس آیا، جب کوفتہ سمجھ کر اس نے گلاب جامن کھائی ہے ——— لیکن مزا آگیا ہوگا !"

" جی بے شک !"

" یہ انگریز اپنے آپ کو ہر فن مولا خیال کرتے ہیں، لیکن آج معلوم ہُوا ہوگا کہ فن تو ہمارے پاس ہے !"

" جی سرکار، ——— اور یہ لوگ کھانا جانیں کیا، اُبلی ہُوئی ترکاریاں، اُبلا ہُوا گوشت، نہ نمک، نہ مرچ، روٹی کے بجائے نان پاؤ، میٹھے کا جی چاہا تو پڈنگ کھا لی، بھلا پڈنگ مقابلہ کر سکتی ہے، ہماری فرنی وغیرہ کا ؟"

" لاحول ولا قوۃ ، ! ——— اب ہمارا ارادہ ہے، ایک دن گارڈن پارٹی دیں !"

" جی سرکار !"

" جانتے ہو اس پارٹی کی خصوصیت کیا ہوگی ؟"

" ارشاد جانِ عالم ؟"

" باغ میں جتنے درخت، کلی، پھول، شگوفے وغیرہ ہوں گے ——— سب ہمارے رکاب داروں کے پکائے ہُوئے ہوں گے، صاحب ریذیڈنٹ، اور ان کی میم صاحبہ جس پھُول کو ہاتھ لگائیں گی، ماکولات میں سے کوئی بہترین چیز ثابت ہوگا وہ ! ——— اس کے بعد اصل پارٹی ہوگی !"

بقیہ حاشیہ، صفحہ ۳۰۴ :

رکاب داروں، اور باورچیوں کا بھی بڑی تفصیل سے تذکرہ کر کے ان کے اس طرح کے کمالات بیان کیے ہیں -

(۱۴)

ریذیڈنٹ بہادر کے جانے کے بعد، ــــــ حضرت جانِ عالم نے تبسم کرتے ہوئے فرمایا :

"خوب دعوت رہی !"

نواب مقن خاں نے دست بستہ عرض کیا :

"جانِ عالم کی جودتِ طبع کا کیا کہنا، ــــــــ ہر چیز اتنی لذیذ، کہ انگلیاں چاٹتا رہ گیا، !"

نواب صمصام الدولہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا :

"جی ہاں، انگلیاں چاٹتا رہ گیا، ــــــــ اور دھوکا کیسا کھایا ہر چیز میں ؟"

نواب مقن خاں بولے :

"دھوکا ؟ ــــــــ مَیں تو کہتا ہُوں، چکر کھا گیا۔ زندگی بھر آج کی دعوت یاد رکھے گا !" [1]

جانِ عالم، کبھی زور سے نہیں ہنستے تھے، یہ ان کے وقارِ شاہی کے خلاف تھا،

---

[1] : مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم نے اپنی یادگارِ زمانہ کتاب، "گزشتہ لکھنؤ" ــــــــ میں، لکھنؤ کے (باقی اگلے صفحے پر)

فریادرس بادشاه

"سبحان اللہ — ! واقعی لطف آجائے گا، اس پارٹی میں!"

"ہاں ہمارا خیال بھی یہی ہے!"

"اکڑتا کتنا ہے، جیسے ملکہ وکٹوریہ کا باپ ہو؟"

"کم کون ہے؟"

"سرکار اسے منھ لگاتے کیوں ہیں؟"

جان عالم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے!

(۱)

قحط تو نہیں، لیکن قحط کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی!

گیہوں کے دام چار روپے من تک چڑھ گئے تھے۔ خالص گھی ڈھائی روپے سیر بھی مشکل سے ملتا تھا، شکر دو آنے سیر ملنے لگی تھی، بکری کا گوشت تین آنے سیر ملنے لگا تھا، گائے کا چھ پیسے سے دو آنے ہوگیا تھا، !

اس "قحط" سے خلقت میں کہرام مچ گیا،

ایک روز جانِ عالم شہر کے گشت کو نکلے تو کئی فریادیوں نے سواری روک کر اپنی بپتا بیان کی۔ جانِ عالم نے اسی وقت ان کی مالی امداد کی، اور وعدہ کیا کہ حالات بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔

قصرِ شاہی واپس تشریف لائے تو بہت ملول و دل گرفتہ تھے،

حضرت محل نے یہ کیفیت دیکھی تو عرض کیا:

"آج کیا بات ہے کہ جانِ عالم افسردہ سے نظر آرہے ہیں؟"

جانِ عالم نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا:

"شہر میں قحط کی سی کیفیت ہے۔ گیہوں، شکر، گڑ، گھی، گوشت ہر چیز کے دام چڑھ گئے ہیں!"

حضرت محل نے بے پروائی کے ساتھ کہا:

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے جانِ عالم، کبھی کوئی چیز مہنگی ہوگئی، کبھی سستی، لوگوں کو تو فریاد

یہ علی نقی خاں صرف وزیر اعظم ہی نہیں تھے، بلکہ جانِ عالم کے خُسر بھی تھے۔ ان کی ایک صاحبزادی سے جانِ عالم نے عقد کر رکھا تھا۔

پروانہ پہنچتے ہی، علی نقی خاں فوراً ہانپتے کانپتے حاضر ہوئے۔ ویسے تو انھیں اپنے اوپر بڑا گھمنڈ تھا ایک تو بادشاہ کے خُسر، دوسرے نواب ریذیڈنٹ کے معتمدِ خاص، اس لیے ذرا پروا نہ کرتے تھے کہ رعایا ان سے کتنی بے زار اور متنفر ہے، البتہ حضورِ سلطان میں جب حاضر ہوتے تھے، تو آداب و رسوم کو پورے طور پر ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ آتے ہی آداب اور کورنش بجالائے اور سر جھکا کر دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

جانِ عالم نے ایسے لہجے میں جس میں تلخی بھی تھی، برہمی بھی، اور غضب بھی فرمایا :

"علی نقی خاں، ———————"

"جی سرکار ———————"

"شہر کا حال کیا ہے؟"

"بہت اچھا ہے، رعایا خوش حال، شاد کام اور دعاگو!"

"بازار کے نرخ کا کیا حال ہے؟"

"جی بازار کا نرخ؟"

"ہاں، ——————— چڑھا ہُوا ہے یا معمول پر ہے؟"

"بالکل معمول پر ہے؟"

"لوگ آسُودہ ہیں؟"

"بہت زیادہ"

"خوش حال، شاد کام، اور دعاگو ہیں؟"

"حد سے زیادہ!"

"(بلند آواز سے) تم جھوٹے ہو!"

کرنے کا بہانا چاہیئے، مفت میں حضور کا شیشۂ دل مکدر کر دیا ؛!"

جانِ عالم نے فرمایا :

"حضرت محل ایسی باتیں نہ کرو۔ اس طرح تم ہماری نظر سے گر جاؤ گی۔ جس رعایا نے ہمیں بادشاہ بنایا، اور سر پر تاجِ خسروی رکھا ہے۔ اسے بھوکا اور پریشان حال ہم نہیں دیکھ سکتے ——— کسی طرح بھی نہیں!"

حضرت محل سہم گئی، اس نے کہا :

"جانِ عالم مجھے نہیں معلوم تھا کہ حالات اتنے نازک ہیں، اور آپ اس درجہ متاثر ہیں۔ ورنہ ایسے الفاظ میرے منھ سے نہیں نکل سکتے تھے، کنیز معافی چاہتی ہے!"

جانِ عالم چپ رہے، اتنے میں اطلاع ملی کہ خاصہ تیار ہے، دسترخوان پر طرح طرح کے ایوانِ نعمت موجود تھے، جانِ عالم نے حضرت محل سے کہا :

"جب تک قحط کی کیفیت ختم نہیں ہو جاتی، گرانی دُور نہیں ہو جاتی، اور لوگوں کو پہلے بھاؤ پر چیزیں نہیں ملنے لگتیں، حضرت محل، ہمارے دسترخوان پر اتنی ساری، اور یہ چیزیں نہ آیا کریں!"

حضرت محل نے بڑے اضطراب کے ساتھ پُوچھا :

"پھر جانِ عالم ؟"

"ہم صرف دال روٹی، بلکہ روٹی چٹنی پر بھی گزر کر سکتے ہیں۔ ان تکلفات کی ضرورت نہیں، بس صرف ایک سالن کافی ہے، اور ہمارے باورچی خانے کا جو صَرف ہے وہ رقم غریب لوگوں میں تقسیم کر دی جائے۔"

پھر قبل اس کے کہ حضرت محل کے مُنھ سے کچھ نکل سکے، حضرت جانِ عالم نے حکم دیا کہ :

"وزیرِ اعظم علی نقی خاں کو حاضر کیا جائے۔"

"ہم تمھارے ساتھ صرف اتنی رعایت کر سکتے ہیں کہ تمھیں برخاست نہیں کرتے مستعفی ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔کل صبح سب سے پہلے جو چیز ہمارے سامنے پیش ہو وہ تمھارا استعفا ہونا چاہیئے!"

"اگر غلام کے لیے جان عالم نے یہ فیصلہ کرلیا ہے تو اس کے سوا چارہ نہیں!"

"ہاں یہ ہمارا اٹل فیصلہ ہے —— ہم تمھیں دیکھتے ہیں اور ہمارا خون کھول رہا ہے۔ کس درجہ ظالم اور سفاک شخص ہو تم، جاؤ، چلے جاؤ ہمارے سامنے سے، ہم ایسے شخص کی صورت بھی دیکھنا گناہ تصوّر کرتے ہیں!"

علی نقی خاں کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حضرت محل نے کہا:

"جان عالم، یہ ریذیڈنٹ کا چہیتا ہے، کچھ رنگ ضرور لائے گا!"

جان عالم نے برہمی کے انداز میں ارشاد فرمایا:

"ہم جانتے ہیں یہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ ہمارے خلاف جاسوسی کرتا رہتا ہے، ریذیڈنٹ سے بہت ملتا ہے اور واقعی یہ رنگ لا سکتا ہے۔ مگر ہمیں ذرا پروا نہیں —— ریذیڈنٹ کو نہ یہ حق ہے نہ اختیار کہ وہ ہمارے ذاتی معاملات میں سرکاری طور پر دخیل ہو کس شخص کو ہم وزیر اعظم بناتے ہیں اور کسے نہیں، یہ ہمارا کام ہے، ریذیڈنٹ کو اس سے تعلّق؟ صرف ایک بات کا ہمیں خیال رکھنا ہے کہ انگریزوں کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اور نظم مملکت کے بارے میں ریذیڈنٹ جو مشورہ دے اسے قبول کرلیں۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں!"

اس کے بعد جان عالم نے حکم صادر کیا کہ بازار کے چودھری حاضر کیے جائیں۔ یعنی ضروریاتِ زندگی فروخت کرنے والوں کے سرغنہ۔ فوراً لالہ چھیدی لال حاضر ہوئے جو اناج فروشوں اور شکر وغیرہ فروخت کرنے والوں کے سرغنہ تھے، اور امجد علی خاں حاضر ہوئے

علی نقی خاں کی گھگھی بندھ گئی، سارا گھمنڈ کافور ہو گیا۔ بڑی عاجزی اور مسکینیت کے ساتھ کہنے لگے:

"غلام سے اگر کوئی خطا ہوئی ہے تو ــــــــــــ"

"ہاں تم سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے، تم نے ہمیں دھوکا دیا، تم نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی، تم نے ہمارے سامنے واقعات کا غلط رخ پیش کیا، ــــ"

"غلام نے ــــــ؟"

"ہاں علی نقی خاں تم نے، ! ــــــ ہم نے آج بہت دنوں کے بعد شہر کا گشت کیا تھا۔ رعایا ہمارے قدموں سے لپٹ گئی، وہ گرانی سے تنگ آگئی ہے۔ گھی، گڑ، شکر، اناج، گوشت ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے ہیں، تم صرف وزارتِ عظمیٰ کر رہے ہو اور نہیں جانتے کہ رعایا کس حال میں بسر کر رہی ہے، حالانکہ جانتے ہو ہم اپنی وفادار رعایا کو کس درجہ محبوب رکھتے ہیں!"

"بے شک غلام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے!"

"پھر بھی ہمارے سامنے دروغ گوئی کی؟"

"غلطی ہو گئی سرکار!"

"نہیں اتنے بے پروا، فرض ناشناس، اور رعایا سے ذرا بھی ہمدردی نہ رکھنے والے شخص کو، ہم ایک منٹ کے لیے اپنا وزیر اعظم نہیں رکھ سکتے!"

"(قدموں پر سر رکھ کر) غلام معافی چاہتا ہے!"

"ناممکن ــــــ تم نے ہماری چوری کر لی ہوتی، ہمیں زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا ہوتا، ہم معاف کر دیتے، لیکن جو رعایا کا دشمن ہے وہ سب سے پہلے تاج کا یعنی ہمارا دشمن ہے اور ایسے شخص کو ہم معاف نہیں کر سکتے، سمجھ گئے؟"

"جی، ــــــــــ"

" سرکار صرف اس لیے کہ گوشت پر بھی، وزیر اعظم نے زائد محصول عائد کر دیا ہے، دوسرے جانوروں کا چارہ بھی بارش نہ ہونے کی وجہ سے مہنگا ملنے لگا ہے!"

" محصول ہم معاف کرتے ہیں، اس کے بعد بھی چارے کی گرانی سے جو فرق ہو، وہ روز کے روز ہمارے خزانے سے وصول کر لیا کرو۔ لیکن خبردار کل سے گوشت، سب کو پرانے بھاؤ پر ملے ایک دمڑی کا بھی اگر فرق ہُوا۔ تو نہ تمھاری خیر ہے، نہ قصابوں، اور قصائیوں کی، سب کو ہم جلا وطن کر دیں گے!"

" (قدموں پر سر رکھ کر) ظل اللہ کے حکم کی تعمیل ہو گی، ——— واقعی بادشاہ کو رعایا کا اتنا ہی ہمدرد ہونا چاہیئے، جتنے ہمارے جان عالم ہیں!"

لالہ چھیدی لال نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہُوئے کہا :

" بھگوان، مہراج کا سایہ، ہمارے سر پر ہمیشہ قائم رکھنا!"

جان عالم نے شفقت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا، اور فرمایا :

" اب تم لوگ جا سکتے ہو۔ ہم نے اب تک خاصہ نہیں نوش کیا تھا، فیصلہ کر لیا تھا جب تک بھاؤ اپنی سابقہ شرح پر لانے کا بندوبست ہم نہیں کریں گے ہم پر آب و دانہ حرام ہے!"

◎

یہ بکری، اور گائے کا گوشت بیچنے والوں کے لیڈر تھے۔

جانِ عالم نے لالہ چھیدی لال سے ارشاد فرمایا :

"بازار کا حال کیا ہے؟"

"حضور کا کرم ہے، ویسے دام آج کل کچھ بڑھ گئے ہیں!"

"کیوں بڑھ گئے ہیں؟"

"وجہ اس کی یہ ہے کہ ——————"

"کھو کھو ڈرو نہیں۔"

"ایک تو اس لیے کہ وزیر اعظم صاحب نے دو پیسہ فی روپیہ ہر چیز پر مزید محصول لگا دیا ہے، دوسرے اس سال بارش بھی کم ہوئی ہے!"

"اگر یہ محصول منسوخ کر دیا جائے؟"

"تو بھاؤ بالکل معمول پر تو نہیں آئے گا، لیکن اس میں خاصی کمی آجائے گی!"

"لالہ چھیدی لال ——————"

"جی سرکار۔"

"کل سے ہر چیز اپنے پُرانے بھاؤ پر بکے گی، اگر کسی نے ایک پیسہ بھی زیادہ وصول کیا تو ہم اسے عبرتناک سزا دیں گے، اور تمھیں بھی کافی سزا ملے گی —— ویسے وزیر اعظم کا مزید محصول ہم منسوخ کیے دیتے ہیں، اور خزانچی کو حکم دیتے ہیں کہ محصول کی منسوخی کے بعد بھی جو کمی رہے وہ ہمارے خزانہ سے ادا کر دیا جائے، لیکن رعایا کو اسی بھاؤ چیزیں ملتی رہیں، جس پر ملتی تھیں!"

"(قدموں پہ سر رکھ کر) ان داتا ایسا ہی ہوگا!"

"امجد علی خاں تم سامنے آؤ!"

"(سامنے آکر) جی سرکار!"

"گوشت کے دام کیوں چڑھ گئے ہیں ——؟"

[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
[illegible]

فرنگی شاطر

(۱)

خاصہ تناول کرنے کے بعد، جان عالم نے حضرت محل کی طرف دیکھا، اور فرمایا :

"بہت خوش نظر آرہی ہو اس وقت !"

وہ بولی : "واقعی جان عالم اس وقت میں بہت خوش ہوں !"

"یہ تو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں، لیکن اس کا کوئی سبب بھی تو ہوگا ؟"

"جان عالم میں خوش ہوں، بہت خوش !"

"مگر کس بات پر ؟"

"اب تک میرے دل میں آپ کی چاہت تھی جو ایک وفادار بیوی کے دل میں ایک شریف شوہر کی ہونی چاہیئے، اب تک میرے دل میں آپ کا احترام تھا، جو رعایا کے ایک فرد کے دل میں اپنے سُلطان کا ہونا چاہیئے، لیکن اب میرے دل میں آپ کی عظمت و عقیدت پیدا ہو چکی ہے !"

"(مسکرا کر) ارے یہ کیوں ؟ کیا ہم کوئی بزرگ اور ولی ہیں ؟"

"یہ میں نہیں جانتی، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ جان عالم نے اس وقت کام وہ کیا ہے، جس پر خدا ضرور خوش ہُوا ہوگا اور اس کا اثر ضرور بارگاہِ الٰہی سے ملے گا !"

"(زیرِ لب تبسم کے ساتھ) یہ کیسے جانا تم نے ؟"

"خدا ہر اس شخص سے خوش ہوتا ہے جو اپنے ابنائے جنس کے کام آئے اور اس بادشاہ سے تو بہت خوش ہوتا ہے جو اپنی رعایا کو سُکھ پہنچانے کے لیے دُکھ اٹھائے !"

"تمھاری ان باتوں نے ہمارا دل خوش کر دیا، !"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ زمرد اور نازو، متن خاں اور صمصام الدولہ نے اذن باریابی طلب کیا، جو فوراً دے دیا گیا، یہ لوگ آئے اور آداب و کورنش بجالاکر، اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

حضرت محل نے خوشی کا جھولا جھولتے ہوئے نازو سے کہا:

"کچھ سنا تم نے آج ہمارے جانِ عالم نے کیا کیا؟"

اشتیاق اور تجسس کے لہجے میں اُس نے پوچھا:

"بندی نے تو کچھ نہیں سنا!"

زمرد بول پڑی:

"لیکن سننے کا ارمان اور اشتیاق بہت ہے!"

حضرت محل نے، اس وقت کی ساری رُوداد مزے لے لے کر ان لوگوں کو سنادی۔

زمرد بولی: "اللہ جانِ عالم کو سلامت رکھے، واقعی بادشاہ ہو تو ایسا!"

نازو بولی: "ایک وہ بادشاہ ہیں جنھیں اپنے عیش و عشرت کے سوا کسی چیز کی فکر نہیں اور ایک ہمارے جانِ عالم ہیں، جو اپنی رعایا کا اتنا خیال رکھتے ہیں!"

حضرت محل نے نازو سے پُوچھا:

"سچ کہنا یہ کام کر کے جانِ عالم نے دونوں ہاتھوں سے ثواب لُوٹا یا نہیں؟"

وہ بولی: "بہت زیادہ! ——— اور تم نے بھی!"

"واہ ری پگلی، ——— مَیں نے کیوں؟"

"کنیز کے لیے یہ بھی بہت بڑا اعزاز ہے!"

"ہم کچھ ایسا محسوس کرتے ہیں تم ہم سے شروع سے کچھ زیادہ مانوس چلی آ رہی ہو!"

"بے شک یہی بات ہے جانِ عالم!"

"مگر اس کا سبب؟"

"سبب یہ ہے کہ بندی نے اپنے آقا میں انسانیت کا وہ جوہر دیکھا ہے جو اس زمانے میں نایاب ہے اور نایاب چیز کسے عزیز و محبوب نہیں ہوتی؟ کون اسے دل سے لگا کر نہیں رکھتا۔"

"ہماری کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے، ——— تم سے جو لگاؤ ہم محسوس کرتے ہیں، وہ کسی سے نہیں کرتے!"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے جانِ عالم!"

"تم نے سچ کہا، ——— لیکن ہم نے بہتوں کو چاہا، مگر ان سے غدّاری، بے وفائی اور کفرانِ نعمت کے سوا کچھ نہیں ملا!"

"یہ اپنا اپنا ظرف ہے!"

"حضرت محل تم ہمیں بہت محبوب ہو، !"

"کنیز کن الفاظ میں اس عزّت افزائی کا شکریہ ادا کرے!"

رات کو بڑی دیر تک مجلس جمی رہی، نازو کی بذلہ سنجیاں، سب پر بالا رہیں۔ اس نے نہ صرف حضرت محل کو، بلکہ جانِ عالم کو بھی بہت ہنسایا۔

کوئی دو بجے کے قریب مجلس برخاست ہوئی۔!

صبح جان عالم ابھی آرام کر رہے تھے کہ وزیرِ حضوری حاضر ہوا، اور آہستہ آہستہ جان عالم کے پاؤں دبانے لگا۔

ذرا دیر میں جان عالم کی آنکھ کھل گئی، وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے، اور فرمایا:

"کیا بات ہے؟"

وزیرِ حضوری، میر اختر علی خاں بہادر نے دست بستہ عرض کیا:

"نواب ریذیڈنٹ بہادر کا پیامی درِ دولت پر حاضر ہے!"

چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے جان عالم نے پوچھا:

"کیا اس وقت؟"

میر اختر علی خاں نے عرض کیا:

"وہ تو بہت سویرے حاضر ہو گیا تھا اور مُصر تھا کہ ریذیڈنٹ بہادر کا نامہ اسی وقت حضورِ شاہ میں پہنچایا جائے۔ لیکن غلام اب تک ٹالتا رہا، اب اس کا اصرار حد سے بڑھا آخر غلام حاضر ہوا، اور آقائے نامدار کو زحمت دی۔"

جانِ عالم نے فرمایا:

"اس لیے کہ تم جانِ عالم کے رحم و کرم کا جذبہ ابھارتی رہتی ہو!"

جانِ عالم نے ارشاد فرمایا :

"بے شک، ——— ہاں نازو تم نے سچ کہا۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ہم خیالی سے ہمیں بڑی تقویت ملتی ہے، اس طرح ہمارے ہر کام میں یہ شریک رہتی ہیں!"

"ثواب میں بھی؟"

"ہاں بے شک! ——— اب سوال یہ ہے کہ وزیرِ اعظم کا منصب کسے سونپا جائے۔ ہم یہ ذمہ داری کسی ایسے شخص کو دینا چاہتے ہیں، جو خدا ترس، ہمدرد اور شریف انسان ہو!"

صمصام الدولہ نے، جو خود بھی اس عہدے کے امیدوار تھے کہا :

"جانِ عالم کا انتخاب کبھی غلط نہیں ہو سکتا، جسے بھی آپ منتخب کریں گے، یقیناً معیار پر پُورا اترے گا۔"

نازو بول پڑی :

"لیکن وہ شخص آپ نہیں ہو سکتے، مُنھ دھو رکھیے!"

سب ہی ہنس پڑے!

نہیں لا سکتے تھے؟"

انگریز نامہ بر نے کہا :

"کچھ ایسی ہی بات ہو گی اس خط میں، ورنہ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ حضور ریذیڈنٹ بہادر، جانِ عالم کے آرام میں خلل انداز ہوتے!"

"خیر، ——— لاؤ نامہ کہاں ہے؟"

نامہ بر نے ایک مہر لگا ہُوا لفافہ پیش کیا۔

جانِ عالم نے وہ لفافہ ہاتھ میں لیا، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر میر اختر علی خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا :

"پڑھو کیا لکھا ہے؟"

نامہ اردو ہی میں تھا، میر صاحب نے فر فر پڑھنا شروع کیا :

بخدمتِ گرامی!

فریدوں رکاب، جمشید حشم، رستم دوراں، خاقانِ زماں، ——— سلطان والا شان، اعلیٰ حضرت جانِ عالم واجد علی شاہ صاحب بادشاہ ملکِ اودھ ———!

حضور والا،

فدوی دست بستہ عرض پرداز ہے کہ ایک نہایت اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے فدوی جلد از جلد باریاب ہونے کی اجازت چاہتا ہے، یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس پر دونوں مملکتوں، یعنی سلطنتِ برطانیہ اور مُلکِ اودھ کے خوشگوار یا ناخوشگوار تعلقات کا انحصار ہے،

امید ہے کمترین کا یہ معروضہ شرفِ قبول حاصل کرے گا، اور

"جاؤ، وہ نامہ لے آؤ جاکر!"

میر اختر علی خاں نے جواب میں عرض کیا :

"لیکن اسے حکم ہے کہ بدستِ خود نامۂ ریذیڈنٹ بہادر، حضرت جان عالم کی خدمت میں پیش کرے!"

بدمزہ ہوتے ہوئے جان عالم نے فرمایا :

"جاؤ لے آؤ اسے ہمارے حضور میں!"

میر اختر علی خاں گئے، اور ذرا دیر میں ریذیڈنٹ کے پیامی کو لے کر حاضر ہو گئے۔ جان عالم یہ دیکھ کر متحیر رہ گئے کہ یہ پیامی کوئی انگریز تھا!

اب تک کا معمول یہ تھا کہ ریذیڈنٹ بہادر اگر حضور شاہ میں کوئی خط یا نامہ بھیجتے تھے تو اپنے عملے کے کسی ہندو، یا مسلمان شخص سے یہ کام لیتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ انگریز کا بھیجنا ضرور کچھ معنی رکھتا تھا۔

وہ انگریز آیا، آداب اور کورنش بجا لاکر کھڑا ہو گیا۔

جان عالم نے اس پر ایک نظر ڈالی اور پوچھا :

"کیوں آئے ہو؟"

اس نے شستہ اور فصیح اردو میں جواب دیا :

"یہ حقیر پُرتقصیر اور فدوی کمترین، حضور، ریذیڈنٹ بہادر کا ایک نہایت ہی اہم نامہ لے کر حاضر ہوا ہے!"

جان عالم کی تیوریاں چڑھ گئیں، انھوں نے ذرا برہمی کے ساتھ پوچھا :

"کیا وہ جانتے نہیں۔ یہ ہمارے آرام کا وقت ہے؟"

"ضرور جانتے ہیں سلطان والا شان!"

"جانتے ہیں تو یہ نامہ مؤخر نہیں کیا جاسکتا تھا؟ کیا تم ایک گھنٹے کے بعد اسے

میر صاحب نے جواب دیا: "پانی تیار ہے، مصلّی بچھایا جا چکا ہے!"
جانِ عالم مسہری سے اٹھے، اور نامہ بر سے کہا:
"اب تم جا سکتے ہو!"
پھر اپنے کمرۂ خاص کے لیے جو وضو اور عبادت کے لیے مخصوص تھا تشریف لے جانے لگے،
جاتے جاتے انھوں نے میر صاحب سے دریافت فرمایا:
"کیا علی نقی خاں کا استعفا وزارتِ عظمیٰ سے آگیا!"
میر صاحب کو رات کی باتوں کی کچھ خبر نہیں تھی، پہلے تو وہ منھ کھولے بادشاہ کو دیکھتے رہے پھر
فرمایا: "استعفا؟"
جانِ عالم نے جواب دیا:
"ہاں ہم نے حکم دیا ہے کہ وہ استعفا دے دے، رعایا اس سے شاکی ہے، وہ نااہل ہے
—— آگیا ہوگا ضرور، تلاش کرو، اور عبادت سے فارغ ہو کر جب ریذیڈنٹ سے ہم مل لیں،
تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو!"
یہ سن کر میر صاحب کچھ چکرا سے گئے، انھیں علی نقی خاں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی، بلکہ
خار کھاتے تھے ان سے، لیکن علی نقی خاں کے دبدبے سے بھی واقف تھے، یہ اَن ہونی سی
بات سن کر بولے کچھ نہیں، خاموشی سے چلے گئے!

اسے فوراً اذنِ باریابی عطا ہوگا ؟"

بندۂ کمترین

دستخط و مہر ریذیڈنٹ

جانِ عالم نے یہ نامہ سُنا، اور میر اختر علی خاں سے فرمایا :

"اس کا جواب لکھ دو !"

آمادگی اور مستعدی کے ساتھ میر صاحب نے پُوچھا :

"جو ارشاد ہو، خادم لکھ دے !"

جانِ عالم نے کچھ سوچتے ہُوئے فرمایا :

"لکھ دو، دو گھنٹے کے بعد ریذیڈنٹ صاحب کو شرفِ باریابی عطا کیا جاتا ہے !"

میر صاحب خط کا جواب لکھنے لگے، اور نامہ بر نے کہا :

"لیکن خاقانِ دوراں، وہ تو اسی وقت اور ابھی ملنا چاہتے ہیں ؟"

جانِ عالم نے فرمایا :

"لیکن ہم اسی وقت اور ابھی نہیں مل سکتے ——— رات کو دیر سے سوتے ہیں، صبح دیر میں اٹھتے ہیں، لیکن بیدار ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ فجر کی قضا نماز ادا کرتے ہیں، پھر اوراد و ادعیۂ ماثورہ سے فراغت کرتے ہیں، اس میں پورا ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا ہے، پھر ہلکا سا ناشتہ کرتے ہیں، اور لوگوں کو اذنِ باریابی عطا کرتے ہیں، ——— لہٰذا ریذیڈنٹ بہادر کو دو گھنٹے سے پہلے وقتِ ملاقات نہیں دیا جا سکتا ۔!"

پھر نامہ بر سے مخاطب ہوتے اور اس کی طرف دیکھا پھر جانِ عالم نے میر صاحب سے فرمایا :

"کیا وضو کا پانی تیار ہے، [1]

---

[1] : تمام مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ نواب واجد علی شاہ، بڑے مذہبی آدمی اور صوم صلوٰۃ کے پابند تھے۔!

"یہ سادہ لوحی ہے آپ کی !"

" آپ کو وضاحت کرنا پڑے گی ان الفاظ کی ! "

" وضاحت یہ ہے کہ اگر آپ جان عالم کے عبادت خانے میں جانے سے پہلے تشریف لے آتے، تب بھی ملاقات نہیں ہو سکتی تھی !"

"یہ کیوں ——— ؟"

" جب تک وہ عبادت سے فارغ نہ ہو لیں نہ کسی سے ملتے ہیں نہ کوئی کام کرتے ہیں !"

" خواہ ملاقات کتنی ہی ضروری ہو، کام کتنا ہی اہم ؟ "

"جی ہاں ، آپ کا خیال درست ہے !"

" لیکن یہ اصول میری سمجھ میں نہیں آیا ؟ "

" مگر اس پر عمل درآمد شروع سے ہی ہو رہا ہے !"

" اچھا، کیا آپ ایک نوازش کریں گے ؟"

" ارشاد، ——— ہر خدمت کے لیے حاضر اور مستعد ہوں !"

"جان عالم جیسے ہی عبادت سے فارغ ہوں انھیں میری حاضری کی اطلاع دے دیں !"

" دے دوں گا، ——— لیکن کیا آپ انتظار کریں گے ان کا ؟"

" جی ہاں، ——— بات ہی ایسی ہے ، کام ہی ایسا ہے !"

" بہت خوب ، ——— جیسے ہی وہ عبادت سے فارغ ہوئے فوراً آپ کی آمد کی اطلاع دے دی جائے گی !"

" شکریہ ، ———"

" لیکن اتنے عرصے تک آپ کریں گے کیا ؟ ——— کیا طبیعت اکتائے گی نہیں ؟ "

" بالکل نہیں ، ——— کوئی کتاب دے دیجیے ، اسے پڑھتا رہوں گا، شاہی کتاب خانے میں تو کتابیں ایک سے ایک بڑھ کے ہوں گی !"

(۴)

جان عالم عبادت خانے میں چلے گئے، دروازہ اندر سے بند کرلیا، اور نماز، و اوراد میں معروف ہو گئے۔

عبادت خانے میں جان عالم کو گئے ہوئے مشکل سے پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ ریذیڈنٹ اپنے نامہ بر کے ساتھ آ گیا۔ اس نے آتے ہی وزیر حضوری میر اختر علی خاں سے کہا:

"جان عالم کو، از راہ کرم فدوی[1] کی حاضری کی اطلاع دے دیجیے!"

میر اختر علی خاں نے بے پروائی کے ساتھ جواب دیا:

"لیکن وہ تو عبادت خانے میں ہیں؟"

"وہاں اطلاع دے دیجیے!"

"اتنی بڑی جسارت تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں کر سکتا، جناب والا!"

"خواہ کتنا ہی ضروری کام ہو؟"

"خواہ زندگی اور موت کا سوال کیوں نہ ہو؟"

"آپ زیادتی کر رہے ہیں، بعد میں آپ کو پچھتانا ہو گا؟"

"پچھتا لوں گا، لیکن گردن کٹانے پر اپنے آپ کو آمادہ کر لوں یہ بہت مشکل ہے!"

"میں تو خط پاتے ہی آ گیا، میرا خیال تھا ابھی عبادت خانے میں نہیں گئے ہوں گے!"

---

[1] : ریذیڈنٹ وغیرہ سلاطینِ اودھ کے سامنے پورے آدابِ شاہی بجا لاتے تھے، اور اپنے آپ کو "فدوی" کہتے اور لکھتے تھے۔

(۵)

پورے دو گھنٹے کے بعد جانِ عالم عبادت خانے سے برآمد ہوئے، جیسے ہی وہ تشریف لائے، وزیرِ حضوری میر اختر علی خاں نے عرض کیا :

"سرکار جیسے ہی عبادت خانے میں تشریف لے گئے ہیں، ریذیڈنٹ آ گیا!"

"(چلتے چلتے رک کر) کیوں ؟"

"شرفِ باریابی حاصل کرنے کے لیے!"

"لیکن ہم نے لکھوا دیا تھا کہ دو گھنٹے سے پہلے شرفِ باریابی عطا نہیں کیا جا سکتا،!"

"جی ہاں، ——— پھر بھی حاضر ہو گیا، مَیں نے تو صاف صاف عرض کر دیا، اس وقت تو عبادت خانے کی طرف پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا، آپ کو انتظار کرنا ہوگا!"

"ٹھیک کہا!"

"بضد تھا کہ اطلاع کر دُوں، مَیں نے کہہ دیا دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو وہاں جائے اور عبادت میں مخل ہونے کی جُرأت کر سکے!"

"بہت ٹھیک کہا،!"

"تو اب اس سے کیا کہوں؟"

"بیٹھا ہے اب تک؟"

"وہ تو جم کر بیٹھ گیا ہے، اٹھنے کا نام نہیں لیتا!"

"ہم اپنے خاص کمرے میں جا رہے ہیں اسے وہاں لے کر آؤ!"

"جی ہاں، ہیں تو مگر

"مگر کیا؟ ——— اس میں تامل ہے کچھ آپ کو"؟"

"صرف اتنا کہ کوئی کتاب، لائبریری سے باہر نہیں نکالی جاسکتی، جب تک شاہ ذی جاہ حکم نہ صادر فرمادیں!"

"(حزنیہ ہوکر) پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"وہاں تشریف لے چلیے، جو کتاب مطلوب ہوگی، حاضر کردی جائے گی!"

"اچھا رہنے دیں، مَیں یہیں بیٹھتا ہُوں، طبیعت گھبرائی تو ٹہلنا شروع کردُوں گا۔ آپ بس اس کا خیال رکھیئے کہ جیسے ہی جانِ عالم عبادت خانے سے برآمد ہوں، میری اطلاع کر دیجیے اور کوشش کیجیے کہ فوری طور پر مجھے شرفِ باریابی حاصل ہوجائے۔

"بہت خُوب، ——— اطمینان رکھیئے، بالکل ایسا ہی ہوگا"!"

◎

اور وزارت کی گراں باریوں سے سُبک دوش ہو رہا ہے،
لیکن یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ اپنے آقا، اور مالک کی
جو محبّت اور عقیدت اپنے دل میں وہ رکھتا ہے۔ اس میں
نہ رتی برابر کمی آئی ہے، نہ آ سکتی ہے، وہ زندگی کی
آخری سانس تک اپنے آقا، اور مربی کی ہر خدمت بجالانا
اپنے لیے موجب فخر و سعادت سمجھے گا۔!"

نمک خوار قدیم
علی نقی خاں

جان عالم، استعفا پڑھ رہے تھے، اور دل میں محسوس کر رہے تھے، کہ اس خائن، غدّار، نمک حرام، اور احسان فراموش شخص نے خوب صورت الفاظ استعمال کر کے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہے، لیکن ہم مردم شناس ہیں۔ ہم جانتے ہیں وہ کس فطرت اور خصلت کا آدمی ہے، اب ہم اس پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ اب ہم وزارت کا منصب اسے سونپ نہیں سکتے۔ اب کسی قیمت پر ہم رعایا کی قسمت اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے، ــــــ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔

جان عالم یہ سوچ رہے تھے کہ میر اختر علی خاں وزیر حضوری، ریذیڈنٹ کو لے کر حاضر خدمت ہوئے، ــــــ ریذیڈنٹ آداب و کورنش بجالایا، اور وہ دبے پاؤں رخصت ہو گئے۔

میر صاحب کے جانے کے بعد، جان عالم نے علی نقی خاں کا استعفا ایک طرف رکھا اور ریذیڈنٹ سے ملاقات پُر تپاک کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو بہت تکلیف ہوئی؟"

ریذیڈنٹ نے دست بستہ عرض کیا:

"بہت خوب!"

"اور ہاں علی نقی خاں کا استعفا تلاش کیا؟"

"جی بہت تلاش کیا، !"

"مل گیا ——— ؟"

"نہیں جانِ عالم، ——— لیکن ابھی چند منٹ ہوئے اس نے بھیجا ہے!"

"اقتدار پرست، ——— رعایا پر زیادہ سے زیادہ ظلم کرکے بھی وہ اقتدار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔!"

"بے شک جانِ عالم وہ اسی طبیعت کا ہے!"

"کہاں ہے وہ استعفا؟"

"جانِ عالم کے خاص کمرے میں، جہاں کاروبارِ مملکت سرانجام دیئے جاتے ہیں، غلام نے رکھ دیا ہے!"

اتنی دیر میں جانِ عالم کا خاص کمرہ آگیا اور وہ اندر تشریف لے گئے، میر اختر علی خاں، ریذیڈنٹ بہادر کو باریاب کرانے کے لیے رخصت ہوئے۔ کمرے میں پہنچ کر جیسے ہی جانِ عالم اپنی مسندِ شاہی پر جلوہ آرا ہوئے۔ان کی نظر علی نقی خاں کے استعفا پر پڑی، ———

اُس نے لکھا تھا:

"چونکہ یہ فدوی، اپنے آقا اور مالک، حضرت جانِ عالم کے اعتماد سے محروم ہوچکا ہے، لہٰذا اب نہ زندگی میں لُطف باقی رہ گیا ہے، نہ زندگی کے مشاغل میں، لہٰذا نہایت ادب کے ساتھ حضورِ سلطانی میں اپنا استعفا پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے، غلام بے شک مستعفی ہو رہا ہے

خوشگوار بنانے میں بڑا حصّہ لیا ہے ،

" تو ــــــــ ؟ "

" اندیشہ ہے کہ ان کے استعفے سے تعلّقات کی استواری اور خوشگواری ختم ہو جائے گی ــــــ ؟ "

" (چڑکر) یہ صرف آپ کا خیال ہے ، ! "

" لیکن غلط نہیں جانِ عالم ؟ "

" بالکل غلط ہے ، ــــــــ سلطنتِ برطانیہ اور مملکتِ اودھ کے تعلّقات اگر استوار اور خوش گوار ہیں ، تو ہمارے دم سے ، ہماری وجہ سے ، فرض کیجیے ، کل ہم یہ تعلّقات ختم کر دینا چاہیں ، تو کیا علی نقی خاں میں یہ ہمّت ہے کہ ہمارے فیصلے کو بدل دے ؛ وہ ہمارا ملازم اور آلۂ کار ہے ۔ ہمارا اتالیق اور رہنما نہیں ، یہ تعلّقات اس کے بعد بھی اسی طرح رہیں گے ، جس طرح اب ہیں ! "

" جانِ عالم نے بجا ارشاد فرمایا ! "

" پھر آپ کو اس کی اتنی فکر کیوں ہے ؟ "

" اس کا سبب تو فدوی نے عرض کر دیا ! "

" آپ نہیں جانتے وہ کیا ہے ؟ "

" کیا ہے جانِ عالم ؟ "

" وہ رعایا کا دشمن ، مملکت کا غدّار ، اور ہمارا نا وفادار ہے ، ــــــــ ایسے شخص کو اتنے بڑے منصب پر ہم فائز نہیں رکھ سکتے ، ــــــــ آپ کو معلوم ہے اُس نے کیا کیا ؟ "

" اگر جانِ عالم ارشاد فرمائیں تو فدوی گوشِ ہوش سے سُنے گا ، ! "

" اس نے بغیر کسی معقول سبب کے بعض محاصل میں اضافہ کر دیا ، ! "

"تکلیف کیسی جانِ عالم ؟"

"انتظار کی زحمتِ بے جا کی !"

"(مسکرا کر) حضور ایسا نہ فرمائیں، ـــــــــ سرکار عبادت کر رہے تھے، اپنے خدا کو یاد کر رہے تھے، فدوی شرفِ حضوری حاصل کرنے کے انتظار میں بیٹھا تھا، اور خود بھی ثواب لوٹ رہا تھا۔!"

ریذیڈنٹ کی ان باتوں سے جانِ عالم کا تکدر کسی حد تک رفع ہُوا۔ انھوں نے پہلے سے زیادہ تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ کہا :

"لیکن اس وقت، آپ نے تکلیف کیوں کی آخر ؟"

ریذیڈنٹ نے دست بستہ جواب دیتے ہوئے کہا :

"واقعی فدوی بہت ناوقت حاضر ہُوا ہے، ـــــــــ"

"خیر کوئی بات نہیں، ـــــــــ ہمارے دل میں آپ کی جگہ ہے، آپ جب چاہیں آ سکتے ہیں، (مسکراتے ہوئے) البتہ عبادت کے وقت نہیں !"

"(زیرِ لب تبسم کے ساتھ) فدوی آئندہ ان باتوں کا پورے طور پر خیال رکھے گا، اور اپنی اس وقت کی غلطی کی معافی چاہتا ہے صدقِ دل سے، !"

"ہم نے معاف کیا، !"

"تو فدوی کو اجازت ہے کہ وہ اپنے معروضات پیش کرے ؟"

"ہاں ہاں ضرور، ـــــــــ"

"فدوی کو معلوم ہوا ہے کہ جانِ عالم نے، علی نقی خاں کو مستعفی ہونے کا حکم دیا ہے، اور انھوں نے استعفا بھی دے دیا ہے، ؟"

"ہاں، ـــــــــ لیکن آپ کو اس سے مطلب ؟"

"علی نقی خاں نے سرکارِ برطانیہ، اور مملکتِ اودھ کے تعلقات استوار کرنے اور

کر دینے کی ضرورت ہے!"

"(انتہائی کرب کے ساتھ) کیوں؟"

"یہ محاصل اس لیے بڑھائے گئے ہیں کہ حکومتِ ہند نے سلطنتِ اودھ کے دفاع اور تحفظ و بقار کے لیے جو فوجیں رکھی ہیں، ان کے سالانہ مصارف میں اضافہ ہوگیا ہے، اور ظاہر ہے یہ ساری رقم سلطنتِ اودھ کو ادا کرنی پڑے گی،[۱] ظاہر ہے شاہی خزانہ یہ نئی رقم نہیں ادا کرسکتا، ————— لٰہذا محاصل میں معمولی سا اضافہ کر کے یہ ضرورت پوری کی جاسکتی ہے، !"

"(پیچ وتاب کھاتے ہوئے) ہُوں، ————— لیکن سوال یہ ہے کہ ہمیں دفاع اور تحفظ و بقا کے لیے بیرونی، یا ملکی فوج کی ضرورت کب ہے؟"

"یہ کیوں جانِ عالم؟"

"ہمارا کوئی دشمن نہیں، ہمارے پڑوسیوں سے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہمارے تعلقات بہت بہتر ہیں۔ ہم پر حملہ آور ہونے کی کوئی نیت نہیں رکھتا، پھر اس فوج کا کیا ہوگا؛ اور اس کے مصارف خواہ مخواہ ہم کیوں ادا کریں؟"

"یہ تو پالیسی کا معاملہ ہے جانِ عالم!"

"کیا مطلب؟"

"ہماری حکومت کا خیال ہے کہ اگر اس نے حفاظتی فوجیں ہٹالیں، تو جو اس وقت دوست نظر آرہے ہیں، کل وہی دشمن بن کر چڑھ دوڑیں گے!"

---

[۱]: انگریزوں نے اودھ، حیدرآباد، اور دوسری مسلم ریاستوں کو نام نہاد دفاع اور تحفظ کا یقین دلا کر اپنی "رجمنٹ" یوں ہی کچھ چھوڑی تھیں یہ فوجیں صرف ان کے مفاد کے لیے کام کرتی تھیں، لیکن ان کے پورے مصارف مذکورہ ریاستوں سے نہایت بے دردی کے ساتھ وصول کیے جاتے تھے!

"جی ہاں کر دیا ہوگا!"

"اور اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ضروریاتِ زندگی سے متعلق اشیاء کی قیمتیں چڑھ گئیں، اور رعایا پریشان ہوکر فریاد کرنے لگی۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، مگر رعایا کی تکلیف نہیں دیکھ سکتے۔ اس کا دکھ نہیں برداشت کر سکتے، ——— وہ بھُوکی مرے، یہ دیکھنے سے پہلے ہم مرجانا پسند کرتے ہیں!"

"ایک انصاف دوست اور رعایا پرور بادشاہ میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں، وہ جانِ عالم میں بدرجۂ اتم موجُود ہیں!"

"نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم نے زائد محاصل منسُوخ کر دیئے، اور بنیوں وغیرہ کے چودھریوں کو بلا کر حکم دیا کہ تمام چیزیں سابق نرخ پر فراہم کی جائیں، ——— جو کمی ہو ہم سے لی جائے۔"

"سُبحان اللہ، کیا داد خواہی ہے، کیا رعایا پروری ہے'!"

"اور علی نقی خاں کو حکم دیا کہ فوراً استعفا دے دے!"

"اس نے استعفا دے دیا ہوگا؟"

"ہاں بہُت تامّل کے بعد، ——— اب ذرا دیر ہُوئی اس نے استعفا بھیجا ہے!"

"لیکن فدوی چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔"

"ہم سُن رہے ہیں توجہ سے'!"

"علی نقی خاں کا استعفا اگر منظور کر لیا گیا تو دولتِ برطانیہ، اور دولتِ اودھ کے تعلّقات حد درجہ کشیدہ ہو جائیں گے ——— ممکن ہے حالات حد درجہ نازک اور غیر متوقع صورت اختیار کر لیں'!"

"ہُوں، ——— اور،"

"جانِ عالم نے جو محاصل منسُوخ کیے ہیں، فوری طور پر انھیں پھر سے بحال

"یعنی، ——————

"وہ اسی نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گی، اور یہ حکومتِ برطانیہ کی توہین ہے کہ وہ ایک فیصلہ کرے اور اسے رد کر دیا جائے، ——————

"توہین، —————— ؟"

"جی ہاں، —————— اور حکومتِ برطانیہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، مگر اپنی توہین نہیں برداشت کر سکتی، اس کے لیے وہ جنگ بھی کر سکتی ہے، !"

"(انتہائی درماندگی کے ساتھ) فرض کیجیے ہم آپ کی باتیں مان لیں، ——

"فدوی کو جانِ عالم کے تدبّر سے یہی امید ہے۔"

"لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ علی نقی خاں وزیرِ اعظم رہے، یہی کام کوئی دوسرا ہمارا منتخب کیا ہُوا وزیرِ اعظم بھی کر سکتا ہے، !"

"بے شک کر سکتا ہے، لیکن ——————

"لیکن کیا؟

"سوال یہ ہے کہ جو شخص یہ کام بہ حُسن وخوبی انجام دیتا آیا ہے، وہی کیوں نہ کرے؟ خواہ مخواہ اسے ذلیل کر کے دوسرا شخص اس کی جگہ کیوں لایا جائے؟"

"تو ہمیں علی نقی خاں کا استعفیٰ نامنظور کرنا پڑے گا؟"

"فدوی یہی، درخواست لے کر حاضر ہُوا تھا!" —————— ایک بات اور رہ گئی، جو سمع مبارک تک پہنچانا تھی!"

"وہ کون سی بات؟"

"ہز ایکسی لینسی وائسرائے اسے پسند نہیں کرتے، کہ آپ رعایا سے زیادہ ربط ضبط بڑھائیں، —————— اس کی فریاد سُنیں، اور دادرسی کریں، یہ کام وزیرِ اعظم کا ہے، —————— ؟"

"ہمیں اس رائے سے قطعاً اتفاق نہیں ہے؟"

"نہ ہوگا، ـــــــ لیکن جیسا کہ فدوی نے عرض کیا، ـــــــ یہ معاملہ پالیسی کا ہے، اور ہماری حکومت اپنی ـــــــ "پالیسی" ـــــــ تبدیل نہیں کر سکتی ـــــــ"

"یعنی، ہم چاہیں یا نہ چاہیں، مگر سرکار برطانیہ ہماری مزعومہ ـــــــ "حفاظت" ـــــــ کے لیے اپنی فوجیں یہاں رکھے گی، اور ان کے مصارف ہمیں ادا کرنے پڑیں گے؟"

"فدوی کا جواب صرف "ہاں" ہو سکتا ہے۔"

"(ریذیڈنٹ کے اس فیصلہ کن، اور بدلے ہوئے لہجے سے متاثر ہوکر) اچھا فرض کیا یہ معاملہ پالیسی کا ہے، اور آپ کی حکومت اپنی پالیسی میں تبدیلی نہیں کر سکتی، وہ حسبِ مرضی افواج یہاں رکھے، اور ان کے مصارف ہم سے وصول کرے گی!"

"فدوی نے یہی عرض کیا تھا!"

جان عالم نے کہا:

"تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ بوجھ نئے محصول لگا کر عوام پر نہ ڈالا جائے، ـــــــ"

ریذیڈنٹ نے عرض کیا:

"پھر کیا صورت ہوگی؟"

جان عالم نے فرمایا:

"ہم خزانۂ شاہی سے یہ مطالبہ ادا کر دیں گے!"

یعنی جیب خاص سے؟"

"ہاں، ـــــــ"

"لیکن اس کا اثر دوسری ریاستوں پر بُرا پڑے گا!"

یہاں تو ریذیڈنٹ اور جان عالم میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر محل کے ایک دوسرے حصے میں حضرت محل، زمرّد، نازو، صمصام الدّولہ، اور نواب متّن خاں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، نازو نے کہا :

" یہ غارت گر، علی نقی خاں رخصت ہُوا، خدا کا شکر ہے رعایا عاجز آ چکی تھی اس سے ! "

حضرت محل نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا :

" ہاں، ——— سچ کہا تم نے، یہ منصب اب صمصام الدّولہ کو ملے گا، سُنا ہے ریذیڈنٹ آیا ہے، اس سے باتیں ہو رہی ہیں، وہ گیا، اور میں پہنچی یہ تجویز لے کر، ! "

یہ سُن کر جہاں نازو کھِل گئی، اور صمصام الدّولہ خوش ہو گئے وہاں زمرّد کا چہرہ اُتر گیا، نواب متّن خاں بھی کچھ بے کل نظر آئے، حضرت محل نے ان دونوں کی ذہنی کیفیت سمجھ لی، چنانچہ کہنے لگی :

" در اصل اس منصب کے سزاوار نواب (متّن خاں) صاحب تھے، دور اندیش ہیں، تجربہ کار ہیں، صاحب فہم و ذکاوت ہیں، لیکن ان کے لیے میں نے ایک اور تجویز سوچ رکھی ہے۔ "

یہ سُن کر نازو بھی خوش ہو گئی اور صمصام الدّولہ بھی، کیونکہ باہمی تعلّقات کی وجہ سے یہ دونوں نہیں چاہتے تھے کہ نواب صاحب محروم رہ جائیں اور زمرّد کو نشاطِ بے کراں کا موقع نہ ملے۔ یہ سُن کر نواب متّن خاں اور زمرّد کے چہرے پر بھی تازگی آ گئی کہ دیکھنا چاہیئے کہ حضرت محل اب کیا کہتی ہے ؛ وہ بولی :

" ظاہر ہیں حکومتِ ہند، اور ہماری حکومت کے تعلقات بڑے خوشگوار ہیں لیکن درحقیقت

"یعنی ہم اپنی رعایا سے رابطہ بھی قائم نہیں رکھ سکتے ؟"

"میری حکومت نہیں چاہتی کہ آپ یہ زحمت گوارا فرمائیں !"

"گویا ہماری حیثیت صرف شاہ شطرنج کی ہے ؟"

"فدوی ایسی گستاخی کر سکتا ہے ؟ لیکن یہ ضرور عرض کرے گا کہ جان عالم اور رعایا کے مابین اگر رابطہ قائم ہوتا رہا، ——— داد خواہی، اور فریاد رسی کا سلسلہ اگر جاری رہا، تو میری حکومت کو دشواریاں پیش آئیں گی، جن سے وہ بچنا چاہتی ہے، ——— اچھا فدوی اب اجازت چاہتا ہے اس نے جان عالم کا کافی وقت ضائع کیا، جس پر وہ نادم اور شرمسار ہے، !"

◎

یہ ہے کہ سفارت کا کام جیسا ہمارے نواب (متّن خاں) صاحب کریں گے کوئی نہیں کر سکتا۔"

حضرت محل نے نواب متّن خاں سے دریافت کیا :

"کچھ آپ بھی تو فرمائیے ؟"

وہ بولے :

"میں کیا عرض کروں ؟ اس در کا ہمیشہ سے غلام ہوں، سفارت تو بڑی چیز ہے چاکری کے لیے بھی تیار ہوں !"

نواب صاحب یہ کہہ رہے تھے اور ان کے چہرے بشرے سے مسرّت بے حساب ٹپکی پڑ رہی تھی، یہی کیفیت زمرّد کی تھی۔ ایک طرف تو وہ ممنون نظروں سے حضرت محل کو دیکھ رہی تھی، دوسری طرف اپنے مقدر کی بلندی پر ناز کر رہی تھی کہ حضرت محل نے کہا :

"مگر ایک بات کا صدمہ ہے ؟"

نازو نے پوچھا :

"صدمہ کس بات کا میری سرکار ؟"

وہ بولی :

"یہ بے مروّت زمرّد دور ہو جائے گی ہم سے !"

زمرد طعنہ کے ساتھ بولی :

"جی معاف کیجیے، نواب (متّن خاں) صاحب چاہے سفیر کبیر کے منصب پر فائز ہوں یا اس سے بھی کسی بلند منصب پر، لیکن بندی حضرت محل کا آستانہ چھوڑ کر لکھنؤ سے باہر نہیں جائے گی۔"

نازو نے ہنستے ہوئے کہا :

"واہ ری پگلی، جائے گی کیسے نہیں، جانا پڑے گا۔"

وہ بولی: "تم چلی جاؤ، اگر ایسا ہی شوق ہے ۔!"

حد درجہ کشیدہ ہیں، حکومتِ ہند، حکومتِ برطانیہ کی شہ پر زیادہ سے زیادہ اقتدار یہاں حاصل کرتی، اور جانِ عالم کو معطل کرتی جارہی ہے، لٰہذا ضرورت ہے کہ حکومتِ ہند کے پاس ہمارا ایسا سفیر جائے جو ایک طرف تو ہماری ترجمانی صحیح صحیح کرسکے، اور دوسری طرف، برطانیہ کی ہوسِ ملک گیری پر بھی اپنے تدبّر سے قدغن لگائے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جانِ عالم کا سچا دوست اور وفادار ہو، سچ پوچھو تو یہ کام وزارتِ عظمٰی سے بھی زیادہ اہم اور گراں بار ہے۔——

نازو بول پڑی :

"ہاں واقعی، ——

حضرت محل نے کہا :

" اور اس کام کے لیے نواب متّن خاں سے بڑھ کر کوئی موزوں آدمی نہیں ہوسکتا ؟"

زمرّد کی خوشی، اور نواب صاحب کی مسرّت دیکھنے والی تھی۔!

حضرت محل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

" پہلے میرا خیال یہی تھا کہ نواب (متّن خاں) صاحب کا نام وزارتِ عظمٰی کے لیے پیش کروں، پھر سوچا، اس کام کے لیے اتنے تدبّر اور مآل اندیشی کی ضرورت نہیں ہے، جتنی سفارت کے لیے، لٰہذا رائے اس پر جمی کہ یہ زحمت نواب صاحب کو دی جائے، ——

کیوں دوستو کیا رائے ہے ؟"

نازو نے کہا :

" اگرچہ تم نے وزارتِ عظمٰی کا درجہ سفارت سے گھٹا دیا ہے، لیکن مجھے سو فیصد اتفاق ہے، یہ کام ہمارے نواب (صمصام الدّولہ) صاحب کے بس کا نہیں، وزارت تو ایک ایسا کام ہے، جو لگے بندھے اصُولوں کے ماتحت ہوتا ہے، اسے تو نواب صاحب کرلیں گے، لیکن سفارت ان کے اچھے نہیں کرسکتے ،!"

نواب صمصام الدّولہ نے کہا : " مَیں تو کچھ بھی نہیں کرسکتا بھئی، لیکن ایمان کی تو

ابھی نازو نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ایک باندی دوڑی دوڑی آئی، اور حضرت محل سے کہنے لگی :

"جانِ عالم نے سرکار کو یاد فرمایا ہے، ابھی اسی وقت!"

وہ اٹھتی ہوئی، اور مسکراتی ہوئی بولی :

"وہ تو ہمیشہ اسی طرح یاد فرمایا کرتے ہیں۔ چل، چلتی ہوں، ——— کیا وہ کرسٹان (ریذیڈنٹ) گیا؟"

"جی ابھی ابھی گیا ہے!"

حضرت محل نے شاہی کوشک کا رُخ کرتے ہوئے زمرّد، اور نازو، اور ان دونوں کے شوہروں سے کہا :

"ہم سب چلیں، تاکہ اسی وقت ساری باتیں طے ہو جائیں؟"

انھیں کیا عُذر ہو سکتا تھا۔ یہ پُورا قافلہ حضرت محل کے پیچھے پیچھے روانہ ہُوا۔

آستانۂ شاہی پر پہنچ کر حضرت محل نے دریافت کیا :

"کیا بندی حاضر ہو سکتی ہے؟"

جانِ عالم نے جواب دیا :

"ہاں بھئی آ جاؤ!"

حضرت محل ہنسنے لگی، !

نازو نے سوال کیا :

" پھر نواب (منّن خاں) صاحب کیا کریں گے ؟ "

" کچھ ہمیشہ کے لیے تو جائیں گے نہیں، ——— آتے جاتے رہیں گے دوسرے تیسرے مہینے ؟ "

آخر نواب صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی :

" ہاں بھئی تم نہ جانا، بندہ خود دوسرے تیسرے مہینے نہیں، ہر مہینے سر کے بل حاضر ہوتا رہے گا، ! "

زمرّد نے نازو کی طرف دیکھا اور پوچھا :

" سن لیا ؟ "

◎

"آپ نے منظور کر لیا ؟"

"نہیں، ———"

"یہ کیوں ؟ ——— نیک کام میں دیر کیوں ؟"

"علی نقی کا استعفا ہم منظور نہیں کر سکتے ——— !"

"اے یہ کیوں ؟"

"ہیں کچھ ایسی ہی مجبوریاں ؟"

"وہ بدستور، رعایا کا خون چاٹتا رہے گا، اور آپ دیکھتے رہیں گے ؟"

"(ایک آہ سرد کے ساتھ) یہ سب کچھ ہوگا حضرت محل !"

حضرت محل نے اب پہلی مرتبہ جان عالم کی طرف دیکھا، چہرہ حد درجہ اندوہگیں اور ملول نظر آ رہا تھا، اس نے بیقرار ہو کر دریافت کیا :

"میں قربان، مزاج تو اچھا ہے ؟"

"ہاں، ———"

"پھر کیا بات ہے ؟"

"کون سی بات ؟"

"خلاف معمول چہرہ اُترا ہُوا دیکھ رہی ہُوں !"

"ہاں ہمیں بہت صدمہ ہے، اس وقت !"

"کیا میرے جیتے جی بھی ؟"

"اس معاملے میں تم بھی کچھ نہیں کر سکو گی حضرت محل ؟"

"لیکن وہ معاملہ کیا ہے ؟"

نازو بول پڑی :

"ضرور کوئی خاص بات ہوگی، ———"

لیکن، اس جواب میں حسبِ سابق کڑاکا نہیں تھا، کچھ اضمحلال تھا۔ حضرت محل نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا :

" لیکن اس بندی کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں، ——— کیا انھیں بھی اذنِ باریابی ملے گا ؟"

جانِ عالم کی آواز آئی :

" زمرّد، نازو، صمصام الدّولہ اور منّن خاں ہوں گے ؟"

حضرت محل نے جواب دیا :

" جی سب، ———"

جانِ عالم نے فرمایا :

" ہاں لیتی آؤ انھیں بھی، کچھ ضروری مشورہ کرنا ہے !"

حضرت محل، اور نازو وغیرہ کے چہرے پر مسرّت اور نشاط کی کیفیت چھلک رہی تھی، لیکن جانِ عالم کے چہرے پر افسردگی، اور ملال کی کیفیت نمایاں تھی۔

حضرت محل نے پوچھا :

" گیا وہ موا کرشان ——— ؟"

جانِ عالم نے جواب دیا :

" ہاں گیا !"

" آیا کیوں تھا غارت گر ؟ ——— کم سے کم دو گھنٹے تو بیٹھا ہوگا ؟"

" ہاں اتنی دیر بیٹھا، کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں !"

" اچھا، خیر اس پر لعنت بھیجیے، ——— یہ ارشاد فرمائیے، نواب علی نقی خاں کا استعفا آیا ؟"

" ہاں آگیا، ———

"خدا خیر کرے سانحہ کیسا؟"

حضرت محل بولی :

"جانِ عالم، خدا کے لیے ———— اب تابِ انتظار نہیں رہ گئی ہے!"

جانِ عالم نے از اوّل تا آخر سارا ماجرا سنا دیا۔!

سب لوگ دم بخود بیٹھے سُنتے رہے، جیسے ان میں جان ہی نہیں ہے،

جانِ عالم نے حضرت محل سے پوچھا :

"اب بتاؤ؟"

وہ ایک عزم کے ساتھ گویا ہوئی :

"تلوار کا جواب تلوار، ———— ہم اپنی توہین نہیں برداشت کر سکتے، اس بدتمیز اور گستاخ ریذیڈنٹ کو حکم دیجیے کہ زیادہ سے زیادہ ۲۴ گھنٹے کے اندر بوریا بستر باندھے، اور ہمارے ملک سے نکل جائے۔"

جانِ عالم نے سوال کیا :

"اس سے کیا ہوگا؟"

"انگریزوں کو معلوم ہو جائے گا، ہم موم کی ناک نہیں ہیں، جدھر چاہیں، گھما دیں!"

نازو بولی :

"انگریزوں کی فطرت یہ ہے کہ طاقت کے سامنے جھکتے اور ضعف کے سامنے شیر ہوتے ہیں!"

زمرّد نے کہا :

"جب وہ محسوس کر لیں گے کہ ہم طاقتور ہیں تو ان کا طرزِ عمل بدل جائے گا!"

بڑی حسرت کے ساتھ جانِ عالم نے ارشاد فرمایا :

جان عالم نے کہا :

" ہاں واقعی بہت خاص بات ہے !"

زمرّد نے کہا :

" تو پھر یہ لونڈیاں کس لیے ہیں ، ارشاد فرمایا جائے ؟"

حضرت محل نے بھی تقاضا کیا :

" فرمایئے تو سہی بات کیا ہے ؟"

جان عالم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا :

" واقعی سنو گی ؟ ——————— سُن سکو گی ؟"

حضرت محل کا رنگِ رُخ بدل گیا ، اس نے کہا :

" آخر معلوم تو ہو بات کیا ہے ؟ یہاں تو مارے ہول کے جی نکلا جا رہا ہے !"

نازو نے کہا :

" یہی کیفیت میری بھی ہے !"

زمرّد بولی :

" قسم لے لو ، یہاں تو ایک سانس تلے ہے ، ایک اُوپر ؟"

حضرت محل بولی :

" ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی سانحہ ہو گیا ہے ؟"

جان عالم نے کہا :

" ہاں یہی بات ہے !"

دانتوں تلے انگلی دباتے ہوئے نازو نے کہا :

" سانحہ ؟"

اضطراب اور بے کلی کے ساتھ زمرّد بولی :

حضرت محل کا پھول سا چہرہ کملا گیا تھا، وہ اس وقت بہت پریشان نظر آرہی تھی، اس نے پہلو بدلتے ہوئے کہا :

"تو پھر کیا ہوگا جان عالم ؟"

جان عالم نے ایک آہِ سرد کے ساتھ جواب دیا :

"وہی جو ریذیڈنٹ چاہیں گے ؟"

"یعنی، علی نقی اپنے منصب پر برقرار رہے گا ؟"

"ہاں حضرت محل، ———— ہم کو معزول کیا جا سکتا ہے، مگر علی نقی کو برخاست نہیں کیا جا سکتا !"

"یہ تو اچھی زبردستی ہے !"

"وہی تو ہے !"

"جب رعایا، آپ کو اتنا چاہتی ہے، تو پھر نواب صمصام الدولہ کی تجویز منظور کیوں نہیں کر لیتے ؟"

"یعنی جنگ ———— ؟"

"جی جان عالم، ! !"

"حضرت محل تم بہت بھولی اور نیک ہو !"

"لیجیے، میرے اوصاف بیان ہونے لگے !"

"بدقسمتی تو یہی ہے کہ ہم طاقت ور نہیں ہیں !"

نواب منّن خاں نے کہا :

" اگر حضور کا حکم ہو تو غلام جاتا ہے، اور ریذیڈنٹ کی گردن لے کر حاضرِ خدمت ہوتا ہے ؟"

نواب صمصام الدّولہ زیادہ جوش میں تھے ، کہنے لگے :

" زیادہ سے زیادہ یہی نا کہ جنگ ہوگی ؟ —— ہم اس کے لیے تیار ہیں - ہم لڑیں گے اور بکسر کا بدلہ لے کر ثابت کر دیں گے کہ ہم کیا ہیں ؟ اور کیا کر سکتے ہیں ؟"

جان عالم نے طنز کرتے ہوئے کہا :

" واقعی ، ——————

نواب صمصام الدّولہ کچھ جھینپ سے گئے ، پھر کچھ نہ کہہ سکے ، نواب منّن خاں نے بھی اپنی شمشیرِ آزاد میان میں کر لی ، زمرّد ، نازو اور حضرت محل سب خاموش تھیں ؟

"ذرا سوچیے تو سہی، آپ نے رعایا سے وعدہ کیا تھا کہ زائد محاصل منسوخ کردیں گے، اور اب؟"

"اب نہیں کریں گے!"

"مگر اس کا اثر رعایا پر کیا پڑے گا؟"

"ہم ذلیل ہوں گے، ——— اور انگریز یہی چاہتے بھی ہیں! ان کی خواہش ہے کہ ہم ذلیل ہوں، اور رعایا ہم سے نفرت کرنے لگے!"

زہرہ جل کر بولی:

"کر چکی، کہیں کی نہ ہو، وہ بھی سب کچھ جانتی ہے!"

"ممکن ہے تمھارا خیال صحیح ہو؟"

"میرے دماغ میں تو ایک ہی بات آتی ہے جانِ عالم؟"

"کہہ ڈالو، ہم سب سن رہے ہیں اور غور سے سُنیں گے!"

"آج یا کل، یا پرسوں، ہمیں بہر حال جنگ کرنا پڑے گی؟"

"لیکن اس کا نتیجہ جانتی ہو کیا ہوگا؟"

"مَیں نہیں جانتی جانِ عالم؟"

"ہم جانتے ہیں، اور تمھیں بتائے بھی دیتے ہیں، ———"

"جی ———"

"جھانسی کا حشر[1] کیا ہوا تمھیں معلوم ہے؟"

---

[1]: یہ ایک مرہٹہ ریاست تھی، لیکن انگریزوں نے اس بہانے سے کہ مہاراجہ کی کوئی صلبی اولاد نہیں ہے اور وہ متبنیٰ کو ولی عہد تسلیم کرنا نہیں چاہتے۔ ریاست کا مہارانی کی دردناک فریاد کے باوجود الحاق کر لیا، حالانکہ اصولاً وہ مجبور تھے کہ متبنیٰ کو بھی ولی عہد تسلیم کرلیں، کیونکہ ریاستوں سے معاہدے بھی ایسے ہی تھے۔

"اور کیا، ؟ ——— سوچو تو سہی، محبت کرنے والی رعایا کا خون پانی کی طرح بہتا دیکھوں اور کچھ نہ کر سکوں؟"

"کیا اس خون میں حرارت نہیں ہے؟ جوش نہیں ہے؟ جذبہ نہیں ہے؟ گرمی نہیں ہے؟"

"سب کچھ ہے ——— لیکن ایک چیز کی کمی ہے؟"

"وہ کیا جان عالم؟"

"وہ یہ کہ شجاع الدولہ نے بکسر کے میدان میں شکست کھائی [1] اور اس شکست نے ان کی پوری نسل میں، مجھ سمیت احساس کمتری پیدا کر دیا۔ ہم نے یقین کر لیا ہم انگریز سے نہیں جیت سکتے، اس یقین نے ہمارا حوصلہ پست کر دیا، اور ہم نے خود جنگی تیاریوں کا سلسلہ بند کر دیا، اور انگریزوں کی پشت پناہی پر اعتماد کرنے لگے، روہیل کھنڈ کے فرماں روا، حافظ رحمت خاں کا قتل [2]، درحقیقت ہمارا قتل تھا، اس دن ہم نے، خودکشی کی تھی، اور اب اس کے اثرات و نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ریذیڈنٹ مہذب الفاظ میں ہمیں حکم دیتا ہے اور ہم اپنی مرضی کے بالکل خلاف اس کی تعمیل پر مجبور ہیں!"

"کیوں مجبور ہیں؟"

"اس لیے کہ لڑ نہیں سکتے!"

---

[1] : اس جنگ کی تفصیل، اور شجاع الدولہ کی شکست کے حالات تمام تاریخوں میں بیان کیے گئے ہیں، ——— لیکن سیر المتاخرین میں زیادہ اہم تفصیلات درج ہیں۔

[2] : حافظ رحمت خاں سے شجاع الدولہ نے جنگ چھیڑ کر جو ظاہری کامیابی حاصل کی تھی، اسی دن سے اودھ کی مملکت پر انگریزوں کی بالادستی قائم ہوگئی، کیونکہ یہ فتح "انگریزوں کی پشت پناہی سے حاصل ہوئی تھی۔

زمرّد نے دانتوں تلے انگلی دباتے ہوئے پوچھا :

"دلّی کی حکومت بھی نہیں ؟"

"ہاں وہ بھی نہیں ، ——— یہ بڑی ہوشیار قوم ہے ، رفتہ رفتہ ، اپنا تسلّط سارے مُلک پر جما چکی ہے ۔ میسور گیا ، اس کی شجاعت ذرا کام نہ آئی ۔ پُونہ کی مضبوط مرہٹہ حکومت ختم ہوگئی ، اور سارے ہندوستان کے ہندو والیان ریاست حیرت اور عبرت کے ساتھ یہ تماشا دیکھتے رہے ۔ کولھاپور ، اور ناگپور کا حشر بھی یہی ہُوا ، سکھوں کی نہایت طاقتور حکومت "پنجاب" اب کس کے قبضے میں ہے ؟"

"ہائے غضب ، خدا موت بھی نہیں دیتا ظالموں کو ، !"

"ایک ظالم مرتا ہے دُوسرا اس کی جگہ آجاتا ہے !"

"اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ سارا ہندوستان انگریز ایک دن ہڑپ کرلیں گے !"

"بے شک !"

"واہ بھئی یہ بھی اچھی رہی ، زبردست مارے اور رونے نہ دے ؟"

"یہی ہوتا ہے ، ! ——— البتہ اگر کچھ اطمینان حاصل ہے تو انھیں جو انگریزوں کے ساتھ ہیں ۔ حیدر آباد کو دیکھ لو ، سندھیا (گوالیار) کو دیکھ لو ، ہلکر (اندور) کو بھی دیکھ لو !"

"اس کا صاف مطلب تو یہ ہُوا کہ ہمیں انگریزوں کا محکوم بن کر رہنا پڑے گا ——— ؟"

"مطلب تو یہی ہے !"

حضرت محل اب تک خاموشی سے یہ تمام باتیں سُن رہی تھی ، اب خاموش نہ رہ سکی ، کہنے لگی :

"جانِ عالم ایسی ذلّت کی زندگی سے تو موت اچھی !"

"جی جانتی ہوں، ـــــــــــــ اس ریاست کا انگریزوں نے الحاق کر لیا اور رانی کو معزول کر دیا، ـــــ

"بس یہی حشر اودھ کا بھی ہو گا!"

حضرت محل بے ساختہ بول پڑی:

"خدا نہ کرے!"

نازو نے صمصام الدّولہ کی طرف دیکھا اور کہا:

"ایسا صرف اسی وقت ہو سکتا ہے، جب غلام اپنی گردن کٹا لیں!"

زمرّد نے بھی تائید کی:

"اور کیا؟ ـــــ بھلا ہم نمک خواروں کے جیتے جی ایسا ہو سکتا ہے؟"

جان عالم نے تبسّم فرمایا، اس تبسّم میں کتنی افسردگی تھی، اسے صرف حضرت محل ہی محسوس کر سکی، اور فرمایا:

"تمھارے اس جذبے کی ہم قدر کرتے ہیں، لیکن بے نتیجہ گردنیں کٹانے سے حاصل؟ حقیقت کتنی ہی تلخ ہو، لیکن اسے تسلیم ہی کر لینا چاہیئے، اور حقیقت یہ ہے کہ انگریز اب اتنی قوت حاصل کر چکے ہیں کہ سارے ہندوستان کی کوئی ریاست ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسی لیے وہ بالادستی کا مظاہرہ بار بار کر رہے ہیں!"

نازو نے بڑی برہمی کے ساتھ کہا:

"خدا غارت کرے ان کمبختوں کو!"

جان عالم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

"اب تو کیفیت یہ ہے کہ انگریزوں سے دہلی کی حکومت بھی ٹکّر نہیں لے سکتی، جو مرکزی حکومت ہے اور جس کا ہندوستان کی تمام ریاستیں احترام کرتی ہیں [1]

---

[1]: "تاریخ ہند" از ڈاکٹر ایشوری پرشاد۔

نہیں ہے، تو یہی کرنا پڑے گا!"

"لیکن ہم اکیلے کیوں مریں؟"

حضرت محل نے تائید کی:

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں، !"

جان عالم نے دریافت فرمایا:

"تو کیا پروگرام ہے پھر؟"

صمصام الدولہ نے جواب دیا:

"مار کر مریں گے!"

فیصلہ کن لہجے میں جان عالم نے ارشاد فرمایا:

"نہیں صمصام الدولہ یہ نہیں ہوسکتا، ——— ہم اپنی بے گناہ رعایا کا خونِ ناحق، بے نتیجہ اور رائیگاں طور پر نہیں بہنے دیں گے، خود جب کہو اپنی گردن پر تلوار پھیر لیں، یا زہر کھالیں، !"

◎

جان عالم نے بغیر تامّل و تذبذب کے ارشاد فرمایا :

" ٹھیک ہے تمھارا خیال ، واقعی ایسی زندگی سے موت اچھی ، لیکن یہ تو بتاؤ موت کس کی ؟ "

صمصام الدّولہ نے عرض کیا :

" ہم جیسے تمام نمک خواروں کی ! "

نواب منّن خاں نے بھی پُرزور تائید کی :

" بے شک ، ـــــــــ ایسے جینے میں مزا کیا ؟ "

" ہم تیار ہیں ، کوئی تاریخ مقرر کر لو ، ـــــــــ اس روز ہم سب زہر کھا کر خودکشی کر لیں ! "

حضرت محل چیخ پڑی ،

" خودکشی ـــــــــ ؟ "

نازو نے روتے ہوئے کہا :

" جان عالم ، دشمن خودکشی کریں گے ؟ "

جان عالم نے جواب دیا :

" جان عالم کے " دشمن " نہیں ، ـــــــــ خود جان عالم اور وہ تمام لوگ ، جو ان کا ساتھ دینا چاہتے ہیں ! "

زمرّد رونے لگی ، اس نے کہا :

" ہائے ایسی باتیں سُننے سے پہلے بندی مرکیوں نہ گئی ؟ "

صمصام الدّولہ نے اپنے حوصلے کو پھر سے ابھارا ، اور کہا :

" جان عالم یہ تو عجیب سی بات ہے کہ ہم لوگ خودکشی کر لیں ؟ "

جان عالم نے بڑی سادگی کے ساتھ جواب دیا : " بھائی اگر ذلّت کی زندگی منظور

صمصام الدّولہ کا بچّہ اس منصب پر فائز ہو گا ، ؟"

" (ہنس کر) ناممکن ؟"

" کیوں والاجاہ ؟"

" ایک وقت میں دو دو وزیر اعظم نہیں ہو سکتے ، !"

" لیکن حضور تو مستعفی ہو چکے ہیں ، !"

" مگر بادشاہ سلامت نے ہمارا استعفا واپس کر دیا ہے ، ہم پر اعتماد کا اظہار فرمایا ہے ، اور ہمارے عائد کیے ہوئے محاصل کو برقرار رکھا ہے !"

" ایں یہ کیا ؟"

ایک دوسرے مصاحب شیخ مراد علی نے کہا :

" ہاں صاحب ، ان بادشاہوں کا کیا ، گھڑی میں تولہ ، گھڑی میں ماشہ ، ——— کبھی کچھ ، کبھی کچھ !"

مرزا رستم بیگ بولے :

" سچ ہی تو کہا ہے کسی دل جلے شاعر نے ؎

بہ گاہے بہ سلامے بر رنجند !

بہ گاہے ، بہ دشنامے خلعت دہند

——— !"

شیخ مراد علی نے تائید کرتے ہوئے فرمایا :

" ہاں بھئی ٹھیک ہی تو کہتے ہو ، ——— لیکن یہ اچھا ہوا کہ ہماری سرکار بدستور وزیر اعظم رہیں گے ، آقائے ولی نعمت کی بندہ پروری سے ، !"

علی نقی خاں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا ، اور کہا :

" جی یہ جو کچھ ہوا ہے ، بے شک ، آقائے ولی نعمت کی بندہ پروری کا کرشمہ ہے ،

(۹)

نواب علی نقی خاں وزیر اعظم سلطنتِ اودھ ، اپنی شاندار حویلی میں رونق افروز ہیں ، اردگرد ، حاشیہ نشین ، اور مصاحب بیٹھے ہُوئے ہیں ، نواب صاحب اس وقت بہت خوش نظر آرہے ہیں ، !

ایک مصاحب مرزارستم بیگ نے کہا :

" سنا ہے حضور نے استعفا دے دیا ؟"

مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوُئے علی نقی خاں نے جواب دیا :

" بھئی ہمارا دماغ تو کچھ خراب نہیں ہے کہ خواہ مخواہ دُودھ کی تھالی پر لات ماریں ، اور استعفا دے دیں !"

" تو کیا حضور یہ شہر کے بے فکروں کی گپ ہے ؟"

" گپ بھی نہیں ہے !"

" پھر میری سرکار ؟"

" جانِ عالم ، اس ذرۂ بے مقدار پر بہُت خفا ہوُئے ، جو نئے محاصل ہم نے لگائے ہیں ، ان پر اعتراض کیا ، اور منسوخ کر دیا ، پھر ہمیں حکم دے دیا کہ استعفا دے دیں چنانچہ ہم نے بھی استعفا لکھا ، اور بھیج دیا ، !"

"غضب خدا کا ، حضوُر نے استعفا دے دیا ، ——— اب ضرور وہ

" اے میں قربان، کیا بات فرمائی ہے۔" چمک " کے ساتھ " مہک " خدا سلامت رکھے، حضور کا جواب نہیں!"

" ہم سب کو صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی درازئ عمر، اور ترقیٔ اقبال کی دُعا کرنی چاہیئے!"

" (ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاکر) اللہ آمین!"

" ہم نے آج صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی دعوت بھی کی ہے، ——— ایسی شاندار دعوت ہوگی کہ جان عالم کے ہاں کی دعوت بھول جائیں گے!"

" جو رکاب دار، اور باورچی، سرکار کے پاس ہیں، وہ شاہوں، اور شہریاروں کے پاس کہاں؟"

◎

______ لیکن تم کسے آقائے ولی نعمت سمجھ رہے ہو ؟"

" حضرت جانِ عالم کو ، اور کِسے ؟"

" ہِش بے وقوف کہیں کا !"

" پھر سرکار ؟"

" میرے آقائے ولی نعمت صاحب ریذیڈنٹ بہادر ہیں !"

" صاحب ریذیڈنٹ بہادر ؟"

" ہاں ، ______ انھیں جب حال معلوم ہُوا تو گئے ، آپ کے " آقائے ولی نعمت " یعنی جانِ عالم کے پاس اور ان سے فرمایا ، یا تو علی نقی خاں کا استعفا نامنظور کرو ، اس پر اعتماد کا اظہار کرو ، اس کے لگائے ہوئے محاصل برقرار رکھو ، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ !"

" کیا فرمایا حضور ، جنگ ؟"

" ہاں بھئی جنگ ، ______ اور جانتے ہو ، آج تک جنگ میں انگریز بہادر سے کوئی جیت نہیں پایا ، !"

" بے شک ، بے شک !"

" لہٰذا ، آپ کے " آقائے ولی نعمت " نے ہتھیار ڈال دیئے !"

" اور کیا کرتے ؟"

" کچھ کر ہی نہیں سکتے تھے !"

" بے شک !"

" اب بندہ پہلے سے زیادہ اختیار و اقتدار کے ساتھ وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر متمکن ہے !"

" انشاءاللہ تاحیات متمکن رہیں گے ؟"

" انشاء اللہ کا کیا سوال ، یہ تو اتنی ہی اٹل حقیقت ہے ، جتنی سُورج کی چمک اور پھُول کی مہک !"

بڑے جوش و خروش کے ساتھ علی نقی خاں نے کہا :

"حضور والا نے بالکل بجا فرمایا، سرکار برطانیہ کے ایک اشارے پر یہ فدوی اپنی گردن کٹا سکتا ہے !"

"ہمیں یقین ہے !"

"مجھے تو خوشی اس دن ہوگی، جس روز سلطنتِ اودھ کا حکومتِ ہند سے الحاق ہو جائے گا، اور ہمارے بادشاہ سلامت معزول ہو جائیں گے ؟"

"یہ کام تو کرنا ہی ہے، لیکن ذرا دانشمندی کے ساتھ، ——————مسجد بابری کا کیا ہُوا ؟"

"اس پر ہندو قابض ہیں !"

"انھیں قابض رہنے دو !"

"بہت خُوب !"

"اور اُس دیوانے ملّا لے کا کیا ہُوا ؟"

"بہت خطرناک شخص ہے !"

"یہ تو ہم بھی جانتے ہیں، مگر آج کل کر کیا رہا ہے ؟"

"جہاد کی تیاریاں !"

"ہُوں —————جہاد کی تیاریاں، یہ تو بہت بُرا ہوگا !"

"لیکن، —————"

"لیکن ویکن کچھ نہیں، ——— اس شخص کو رام کرنے کی کوشش کرو، اگر راہ پر نہ آئے تو قتل کر دو !"

لے : مولانا سیّد امیر علی جنھیں انگریز دیوانہ ملّا کہا کرتے تھے اور جنھوں نے ہر طرح کی تحریص و ترغیب کے باوجود مسجد کی بازیابی کے لیے بالآخر جامِ شہادت نوش کیا ۔!

(۱۰)

علی نقی خاں نے صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی دعوت پر یقیناً پچاس ہزار روپے خرچ کر دیئے ہوں گے۔ وہ بات تو کہاں آ سکتی تھی جو جان عالم کے ہاں کی دعوت میں تھی، پھر بھی نہایت شاندار دعوت تھی۔ اور دعوت کے اختتام پر علی نقی خاں نے نہ صرف — ریذیڈنٹ بہادر کو، اس کی بیوی کو، بلکہ عملے کے تمام افراد کو، گراں بہا تحائف، اور نذرانے پیش کیے۔ ریذیڈنٹ کی بیوی کو، زیور کا مرصع بہ جواہرات کا سیٹ پیش کیا تھا۔ اس کی قیمت کسی طرح ایک لاکھ روپے سے کم نہیں ہوگی، !

بہ وقت رخصت خلوت میں، دونوں کے مابین کچھ باتیں ہوئیں، ریذیڈنٹ نے مسکراتے ہوتے پوچھا :

"کہو کام چل رہا ہے بالکل ٹھیک ؟"

علی نقی خاں نے ریذیڈنٹ کے قدموں پہ سر رکھ دیا، اور عرض کیا :

"حضور نے غلام کی عزّت رکھ لی، اسے ذلّت سے بچا لیا، ورنہ کہیں اسے واقعی مستعفی ہونا پڑتا، یا اس کے عائد کیے ہوئے محاصل منسوخ کر دیئے جاتے، تو اس کا وقار دو کوڑی کا رہ جاتا، !"

ریذیڈنٹ نے علی نقی خاں کا سر اٹھا کر، اسے پھر اپنے پاس بٹھا لیا، اور کہا :

"ہم وفاداروں کی قدر کرنا جانتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں تم سب سے پہلے سرکار برطانیہ کے وفادار ہو پھر کسی اور کے، !"

(۱۱)

حضرت محل کے عشرت کدے میں زمرّد، نازو، ممّن خاں اور صمصام الدّولہ موجود تھے، حضرت محل حد درجہ دلگیر اور پریشان حال نظر آرہی تھی، اس وقت رات کے دو بجے تھے اور محل میں سب سو رہے تھے۔ سنّاٹا چھایا ہُوا تھا۔!

گفتگو کا آغاز حضرت محل نے کیا:

"جانِ عالم کی مایوسانہ باتوں نے مجھ پر خواب و خور حرام کر دیا ہے!"

زمرّد نے کہا:

"میرا خود یہی حال ہے، رات رات بھر نیند نہیں آتی!"

نازو کہنے لگی:

"دن ہو یا رات، کیسی ہی مصروفیت ہو، بس یہی ایک چیز دماغ میں گھوما کرتی ہے!"

صمصام الدّولہ نے کہا:

"بھئی یہ اضطراب اور تشویش اپنی جگہ پر ہے۔ لیکن اس سے کام نہیں چلے گا؟"

ممّن خاں نے پُوچھا:

"پھر کیا کرنا چاہیئے ہمیں؟"

حضرت محل نے امید بھری نظروں سے صمصام الدّولہ کو دیکھا اور نظر جھکالی، زبان سے کچھ کہا نہیں، لیکن آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

نازو خود بھی رونے لگی، اور اس سے لپٹ گئی۔:

"ایسا ہی ہو گا عالی جاہ !"

"اس معاملے میں پھر تمھاری بادشاہ سلامت (واجد علی شاہ) سے ٹکر ہو گی اور ضرور ہو گی !"

"غلام کا خیال بھی یہی ہے !"

"لیکن ہم تمھارا ساتھ دیں گے، ——— اور ممکن ہے، یہی واقعہ، الحاق، اور معزولی کا سبب بن جائے ؟"

"لیکن عوام ——— ؟"

"ان میں تفرقہ پیدا کر دو !"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے، شیعہ اور سُنّی کا تفرقہ، اور کئی قسم کے تفرقے !"

"ہمیں تمھارے تدبّر پر بھروسا ہے، ہر طرح کی حکمت عملی سے کام لو، اور حکومت کا خزانہ بے دریغ خرچ کرو !"

"بہت خوب !"

"بے شک کرتی ہے!"

"اس محبت کرنے والی رعایا میں سے ایسے کافی جاں نثار نکل آئیں گے۔ جوان کے وقار اور مرتبے کو قائم رکھنے کے لیے جان پر کھیل جائیں گے؟"

"یقیناً یقیناً . . !"

"ضرورت ہے کہ ایسے جاں نثاروں کا ایک گروہ بنایا جائے، اور اسے تمام افکار سے آزاد کر دیا جائے، یعنی اس کے تمام مصارف ہم پورے کریں . . !"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پہلے ان جاں نثاروں کو فوجی تربیت دی جائے گی . . !"

"اچھا . ——— پھر؟"

"پھر ان سے دو کام لیے جائیں گے؟"

"کون سے کام؟"

"ایک تو غداروں کا قتل!"

"کیا کہا غداروں کا قتل؟"

"ہاں . ——— میں نے ایسے غداروں کی ایک فہرست تیار کر لی ہے، جو ظاہر میں دم جان عالم کا بھرتے ہیں، اور حقیقتاً انگریزوں کے آلۂ کار، جاسوس، اور نمک خوار ہیں . . !"

"ان لوگوں کو قتل کراؤ گے؟"

"ہاں . ———"

"کون کون لوگ ہیں؟"

"کئی سو . ——— لیکن ان سب کا سربراہ علی نقی خاں ہے۔ پہلے اُس کی باری آئے گی، پھر دوسروں کی!"

"خدا کے لیے، آنسو پونچھو ——— بھلا رونے سے کیا ہوگا؟"

زمرد نے بہت ضبط کیا، لیکن آنسو اس کی آنکھوں سے بھی ٹپکنے لگے، اس نے کہا:

"ہم رونے کے لیے نہیں، کچھ سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں!"

نازو نے صمصام الدولہ سے دریافت کیا:

"کچھ کہہ تو رہے تھے، کیا سوچا ہے؟ کہتے کیوں نہیں؟"

صمصام الدولہ نے کچھ سوچتے ہوئے، بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا:

"ایک بات تو بہر حال طے شدہ ہے؟"

نواب منّن خاں نے غور سے یہ بات سنی اور پوچھا:

"کون سی بات؟"

"یہ کہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گا؟"

"یعنی ———"

"انگریز جانِ عالم کو اور زیادہ دبانے کی کوشش کریں گے!"

"ہاں نظر تو ایسا ہی آتا ہے؟"

"اور ، بجا طور پر جانِ عالم اتنے مایوس ہیں کہ مقابلے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتے۔"

"تم بھی کہتے ہو ، بجا طور پر؟"

"ہاں منّن خاں!"

"یہ کیوں بھلا؟"

"انگریزوں کی فوجی طاقت اتنی زیادہ اور مضبوط ہے، اور ہماری فوجی طاقت اتنی کم، اور کمزور ہے کہ اگر مقابلہ ہوا تو صرف چند گھنٹوں میں فیصلہ ہو جائے گا!"

"پھر ———؟"

"ہم سب جانتے ہیں کہ جانِ عالم سے رعایا بہت محبت کرتی ہے!"

" یہ کیوں بھائی ؟ "

" ان جاں نثاروں سے ، نہ صرف ریذیڈنٹ ، بلکہ دوسرے انگریزوں کا قتل بھی کرانا چاہیئے ؟ "

" یہ نقصان دہ بات ہو گی ؟ "

" یہ کس لیے ؟ "

" انگریز سمجھ جائیں گے ۔ ان کے خلاف زیر زمین تحریک یہاں چل رہی ہے ۔ وہ جان عالم کو مجبور کریں گے کہ اس کا سراغ لگائیں ، اور جو جاں نثار گرفتار ہو ، اسے عبرت انگیز سزا دیں ، ! "

" پھر تم نے کیا سوچا ہے ؟ "

" میری رائے یہ ہے کہ ان جاں نثاروں کی ایک ٹولی ، کلکتہ بھیجی جائے ؟ "

" اماں کیا کہہ رہے ہو کلکتہ ؟ "

" ہاں ، ——— "

" وہاں کیا کرے گی ؟ "

" یہاں کسی انگریز کو اس سے نقصان نہیں پہنچے گا ، اور وہاں جو انگریز ، ——— حتیٰ کہ گورنر جنرل تک ——— اس کی زد پر آگیا ، زندہ نہیں رہ سکے گا ! "

" زندہ باد ، بڑی عمدہ تجویز ہے ! "

نازو مُسکرائی ، اور کہنے لگی :

" بس تجویزیں بنوالو ان سے ، ——— اس کام میں ان کا دماغ خوب چلتا ہے (مٹھن خاں سے) کیوں بھائی صاحب ؟ "

مٹھن خاں نے جواب دیا :

" لیکن ظالم نے غضب کی تدبیر سوچی ہے ! "

" بات تو معقول ہے !"

" ان جاں نثاروں کے مختلف مراحل میں امتحانات لیے جائیں گے، اور جب یہ یقین ہو جائے گا کہ ان میں سے کوئی فرد بھی، خواہ اسے کتنی ہی اذیت کیوں نہ دی جائے، افشائے راز نہیں کرے گا، اور تب اس سے اصل کام لیا جائے گا کہ اگر گرفتار بھی ہو جائے، تو راز راز رہے۔!"

صمصام الدولہ تمھاری تجویز بڑی عمدہ اور معقول ہے، لیکن کیا عمل میں آسکے گی ؟"

"کیوں نہ آئے گی !"

" سوچ لو۔ !"

" خوب سوچ لیا ہے، ——— ضرورت صرف اس کی ہے کہ ان لوگوں کو، ہر طرح کی مالی دشواری نہ پیش آئے، اور ان میں سے کوئی آدمی گرفتار، یا قتل ہو، تو اس کے متعلقین کو گم نام طریقے سے، اتنی رقم پابندی سے پہنچتی رہے، جتنی میں ان کے گھر کا کام چل رہا تھا، !"

" صمصام الدولہ خوب، ——— لیکن دوسرا کام کیا لوگے، ان لوگوں سے ——— ؟"

" دوسرا کام لکھنؤ سے باہر لیا جائے گا !"

" لکھنؤ سے باہر ؟"

" ہاں !"

" یعنی ہم نہیں سمجھے ؟"

" ان جاں نثاروں سے اپنے قومی غدّاروں کو تو قتل کرایا جائے گا، لیکن ان میں سے کسی کو اجازت نہ ہوگی کہ کسی انگریز کو ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھ سکے، ———"

" احمقانہ بات ؟"

حضرت محل نے کہا :

" نواب صاحب آپ کی رائے نہایت مناسب ہے. کام اسی طرح شروع ہونا چاہیئے !"

حضرت محل کی اس تائید سے نازو بھی بہت خوش ہوئی، اور نواب صمصام الدّولہ کا حوصلہ بھی بہت بڑھ گیا۔ دل میں بہت خوش ہوئے کہ محبوب کی نظر میں کچھ وقعت اور اس کے دل میں کچھ جگہ تو ہے!

زمرّد نے مسکراتے ہوئے پوچھا :

" تو نواب صاحب کب سے یہ نیک کام شروع ہو رہا ہے ؟"

نواب صمصام الدّولہ نے جواب میں کہا :

" وہ تو بہت جلد شروع ہو جائے گا۔"

زمرّد بولی :

" میں تو کہتی ہوں ابھی سے شروع ہو جانا چاہیئے !"

نواب صمصام الدّولہ نے جواب دیا :

" ہو سکتا ہے، ————"

" مگر ———— ؟"

" مگر یہ کم از کم ان لوگوں کو جو یہاں موجود ہیں، زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا چاہیئے ———— !"

زمرّد بولی :

" ہم سب کا تعاون آپ کو حاصل ہے !"

حضرت محل نے کہا :

" ہم سب دل و جان کے ساتھ آپ سے تعاون کریں گے !"

نازو نے کہا : " بے شک !"

حضرت محل جواب تک خاموش بیٹھی تھی، کہنے لگی :

"واقعی بڑی عمدہ تجویز ہے۔ ——— نواب صاحب کی ذہانت قابلِ داد ہے!"

زمرّد نے کہا :

"بس اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دینا چاہیئے، اور سب سے پہلے وہ نمک حرام علی نقی خاں جو ہے، اس کی گردن اُتار دینی چاہیئے،!"

صمصام الدّولہ نے سمجھاتے ہوئے کہا :

"علی نقی خاں کی باری ذرا دیر میں آئے گی!"

زمرّد الجھ پڑی، کہنے لگی :

"واہ یہ کیوں؟"

نازو نے کہا :

"کیا اس لیے کہ ظالم کی رسّی دراز ہوتی ہے؟"

صمصام الدّولہ نے زیرِ لب تبسّم کے ساتھ کہا :

"یہی سمجھ لو، ——— اگر ہم نے پہلے علی نقی خاں پر ہاتھ ڈالا، تو عام خیال یہی ہوگا کہ یہ کوئی سازش ہے!"

حضرت محل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا :

"ہاں یہ تو ہے!"

صمصام الدّولہ نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا :

"لہٰذا شروع میں ہم ایسے غدّاروں کو لیں گے، جو علی نقی خاں کے دست و بازو، اور انگریزوں کے محکمۂ خفیہ کے سرگرم کارکن ہیں۔ پھر علی نقی خاں کی باری بھی آجائے گی،!"

نواب منّن خاں بھی اس وقت جوش میں تھے، کہنے لگے :

"چار لاکھ میں دوں گا، ـــــــ نواب صاحب یہ رقم کل آپ کے در دولت پر میرا کارندہ پہنچا آئے گا، مطمئن رہیئے !"

حضرت محل، جس نے اس جوش و خروش میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا، کہنے لگی :

"آپ لوگوں نے یہ ایثار، میری محبت میں کیا ہے !"

نازو نے لقمہ دیا :

"تمھاری محبت میں بھی، اپنے ملک کی محبت میں بھی !"

حضرت محل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

"ایک ہی بات ہے، ـــــــ بہرحال پندرہ لاکھ میں پیش کرتی ہوں !"

نواب متّن خاں بولے :

" ایک مرتبہ نہیں، سو مرتبہ بے شک !"

نواب صمصام الدولہ بولے :

" لیکن ایک سوال ہے ؟"

سب ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے ، انھوں نے کہا :

" سوال یہ ہے کہ بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے ؟"

نازو خفا ہو گئی :

" پھر بہکے، کس طرح سے باتیں کرنے لگے ؟"

نواب متّن خاں نے فرمایا :

" یہ بات کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آئی ؟"

نواب صمصام الدولہ بولے :

" اس کام کو شروع کرنے ، اسے جاری رکھنے اور اس کے مصارف پورے کرنے کے لیے روپے کی ضرورت ہے !"

حضرت محل نے سوال کیا :

" ہاں ٹھیک کہا آپ نے ، ــــــ کتنے روپے کی ضرورت ہے آپ کو ؟"

نواب صمصام الدولہ نے کہا :

" کم از کم پندرہ لاکھ روپیہ چاہیئے ــــــــــ اپنی طرف سے تین لاکھ روپیہ میں پیش کرتا ہوں !"

نازو بولی : " ایک لاکھ میری طرف سے بھی قبول ہوں ، رقم معمولی ہے لیکن خلوص کو دیکھتے ہوئے بہت ہے !"

زمرّد نے کہا : " تو کیا بندی کسی سے ہیٹی ہے ، ــــ چلو ہماری طرف سے دو لاکھ !"

"جی ہاں —— پارٹی کی تشکیل کا کام تو انشاء اللہ کل ہی سے شروع کردوں گا، تربیت کا مرحلہ بھی ساتھ ساتھ طے ہوتا جائے گا، لیکن میرے پاس نہایت کارآزمودہ، معتمد اور منجھے ہوئے لوگ ۲۵ — ۳۰ کی تعداد میں پہلے سے موجود ہیں، ——"

"پہلے سے ——؟"

"جی ہاں، —— مَیں نے طے کر لیا تھا کہ اگر پارٹی والی بات نہیں بنی، تو اپنے صرف سے اور اپنے طور پر جو کچھ ہو سکے گا، کروں گا، ان لوگوں کی تربیت مکمل ہو چکی ہے؟"

"تربیت بھی مکمل ہو چکی ہے؟"

"جی ہاں بہت اچھی طرح، —— لہٰذا پارٹی کی تشکیل کے دوران میں، ایک ایک مہینے کے وقفے سے یہ لوگ محدود پیمانے پر کام کرتے رہیں گے، تاکہ کھلبلی تو مچ جائے گی، اس کے بعد بھرپور حملہ ہوگا، ! اور انشاء اللہ برطانوی سامراج کے پرخچے اُڑ جائیں گے!

نازو بولی:

"تمہارے منہ میں گھی شکر، مجھے ان انگریزوں سے اتنی نفرت ہوگئی ہے کہ ——

"جتنی مجھ سے بھی نہیں ہو گی!"

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور محفل کی سنجیدگی نشاط و طرب کی فضا میں بدل گئی!

◎

(۱۲)

نواب مٹن خاں، اتنی بڑی رقم جمع ہو جانے سے بہت خوش ہوئے، کہنے لگے :

" اب انشاء اللہ کام بن جائے گا، ! "

بڑے تیقن اور اعتماد کے ساتھ صمصام الدولہ نے جواب دیا :

" ضرور بنے گا، اور دشمن دنگ رہ جائے گا ! "

مٹن خاں نے سوال کیا :

" یار لکھنؤ میں کس کی شامت آئی ہے یعنی کس کی گردن کٹے گی ؛ اور کلکتہ میں کون عروس مرگ سے، سب سے پہلے ہم آغوش ہونے والا ہے؛ "

نازو بولی : " یہ بھی اچھی رہی، سوت نہ کپاس، کوری سے لٹھم لٹھا ؛ "

حضرت محل نے ہنستے ہوئے کہا :

" ہاں بھئی، ابھی تو اسکیم زیر غور آئی ہے، پارٹی بنے گی، لوگوں کو تربیت دی جائے گی، اس کام میں چھ مہینے تو صرف ہو جائیں گے، پھر یہ باتیں بھی سوچ لی جائیں گی اطمینان سے ؛ "

صمصام الدولہ نے کہا : " پارٹی کے بننے، اور ممبران پارٹی کی تربیت میں میرا خیال ہے ایک سال صرف ہو جائے گا ؛ "

" ہاں، اور کیا ——— کوئی بچوں کا کھیل ہے یہ بھی ؟ "

" لیکن کام ابھی شروع ہو جائے گا ! "

" (حیرت سے) پارٹی کی تشکیل اور تربیت سے پہلے کام شروع ہو جائے گا !؟ "

"بھئی خوب کہا، ——— اب بتائیے نواب صاحب، بڑا حاضر جواب سمجھا کرتے تھے اپنے آپ کو!"

وہ بے بسی کے ساتھ بولے:

"بھئی، ——— ان کے سامنے تو میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو حاضر جواب نہیں سمجھا!"

زمرّد نے چڑتے ہوئے کہا:

"کیسی کُٹّی ہوئی ہے نازو کے سامنے آپ کی!"

وہ بولے:

"ہاں ہوئی ہے، اور زندگی بھر ہوتی رہے گی، ——— یار صمصام، تم تو لُطف لے رہے ہو باتوں سے، کچھ کہو نا؟"

نواب صمصام الدّولہ نے جواب میں کہا:

"مَیں نے تو یہ باتیں سُنی بھی نہیں، ——— مَیں تو آپ کے اہم ترین سوال کا جواب سوچ رہا تھا!"

مٹّن خاں نے پُوچھا:

"تو سوچ لیا؟"

وہ بولے:

"ہاں، ——— بہُت اچھی طرح!"

"تو کون ہے قضا کا مارا؟ نام تو اس کا؟"

صمصام الدّولہ نے کہا:

"رستم بیگ!"

"(اُچھل کر) کیا کہا، رستم بیگ؟"

(۱۳)

ان ہلکے سے قہقہوں اور دل چسپیوں کے بعد، بات پھر اپنے اصل موضوع پر آن کر ٹِک گئی:

نواب منّن خاں نے کہا:

"یاروں سے کیا پردہ، بتاؤ تو سہی، لکھنؤ میں سب سے پہلے کون عروس مرگ سے ہمکنار ہوگا؟"

نازو بولی:

"بات تو کچھ نہیں مگر وہی مثل کہ:

"حلق سے نکلی، خلق میں پھیلی،!"

منّن خاں نے مسکراتے ہوئے کہا:

"بھئی ہم مانتے ہیں بڑی شوہر پرست ہو، لیکن اس مسئلے پر اگر یہیں بحث ہو جائے، تو تبادلۂ خیال کے بعد زیادہ صحیح رائے قائم ہوگی۔ آپ کے شوہر نامدار بہر حال آدمی ہیں، ان سے غلطی ہو سکتی ہے؟"

وہ چڑتی ہوئی بولی:

"ہاں ان سے غلطی ہو سکتی ہے، نہیں ہو سکتی تو آپ سے!"

زمرّد نے نازو کا ساتھ دیتے ہوئے کہا:

علی نقی خاں اس وقت متفکر اور مغموم وملول بیٹھا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کسی جان لیوا فکر میں مبتلا ہے، بار بار پہلو بدلتا تھا، اور اضطراب و اضطرار کے عالم میں کبھی مسند پر بیٹھ جاتا تھا، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔

اتنے میں رستم بیگ آتا دکھائی دیا، اسے دیکھتے ہی علی نقی خاں کے چہرے پر، اطمینان وسکون کی کیفیت پیدا ہوگئی، اس نے کہا:

"کتنی دیر سے ہم تمھارا انتظار کر رہے ہیں اور تم اب آئے ہو؟"

رستم بیگ نے سامنے پڑے ہوئے مونڈھے پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا:

"سرکار ہی کے کام میں مصروف تھا!"

"تم نہ جانے کب تک مصروف رہوگے، اور یہاں صاحب ریذیڈنٹ بہادر نے ڈانٹ بتیار کی ہے کہ امیر علی کا جہادی قافلہ ہر قیمت پر روک لیا جائے۔ خواہ اس قافلے کا ایک ایک آدمی کیوں نہ قتل ہو جائے،

"یہ تو آپ نے صحیح فرمایا، لیکن معاملہ اتنا بے ڈھب ہے کہ ہر تدبیر الٹی ہو جاتی ہے!"

"ہر تدبیر الٹی ہو سکتی ہے، لیکن شیعہ سُنی اختلاف پیدا کر دینا تو مشکل نہیں ہے؟"

"کیوں مشکل نہیں ہے؟"

"شیعوں کو اس بہانے سے مُٹھی میں لیا جا سکتا ہے کہ محض شیعہ ہونے کے جرم میں، بادشاہ سلامت کے خلاف امیر علی نے یہ مہم چلائی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ شیعہ سلطنت اور حکومت کو ختم کر دے،

"ہاں، ——— بڑا زہریلا آدمی ہے، علی نقی خاں کا دستِ راست بنا ہُوا ہے، ریذیڈنسی میں باقاعدہ جاسوسی کرتا ہے، ——— تنخواہ بھی پاتا ہے اور انعام بھی!"

"بہ ظاہر تو وہ صرف مصاحب ہے!"

"جی ہاں، ——— یہ "بہ ظاہر" والے لوگ ہی زیادہ خطرناک ہُوا کرتے ہیں، علی نقی خاں، اور ریذیڈنٹ کے مابین رابطے اور واسطے کا کام ——— یہی نمک حرام دیتا ہے، اس کا قائم مقام پیدا کرنے میں علی نقی خاں کو دیر لگے گی، ایسے نازک معاملات میں اعتماد بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے!"

(۱۵)

مرزا رستم بیگ کی بہم پہنچائی ہوئی یہ اطلاع، اور یہ خبر، نواب علی نقی خاں کے لیے اتنی غیر متوقع اور اس درجہ حیرت انگیز تھی کہ بے ساختہ ان کے منھ سے نکلا :

" کیا کہا تو نے اُلّو کے پٹھّے ! "

اپنی وفاداری اور نیاز مندی کا یہ صلہ پاکر رستم بیگ کو ایک جھٹکا سا لگا، لیکن آدمی معاملہ فہم اور دور اندیش تھے، جانتے تھے، علی نقی خاں سے اور ریذیڈنسی سے جو کچھ وہ کما لیتے ہیں اس کا چوتھائی حصّہ بھی، کسی اور طرح نہیں کما سکتے، لہٰذا شیرِ مادر کی طرح، یہ تلخ گھونٹ پی گئے، اور بڑی ملائمت کے ساتھ کہا :

" حضور بندے نے تو ایک خبر پہنچائی تھی، اور میرا یہ فریضہ ہے کہ کوئی بات آپ سے ہرگز اور کسی قیمت پر نہ چھپاؤں، آپ کو تاریکی میں نہ رکھوں، تاکہ آپ بروقت اس کا تدارک، اور انسداد کر سکیں ؛ "

مرزا رستم بیگ کی ان باتوں نے علی نقی خاں کے اشتعال میں کسی حد تک کمی کی، انھوں نے بھی ٹھنڈے اور ملائم لہجہ میں کہا :

" یہ تو سچ کہتے ہو، مگر اب سوال یہ ہے کہ میں صاحب ریذیڈنٹ بہادر کو کیا جواب دوں گا ؛ اگر ان کی مرضی کے مطابق میں کام نہ کر سکا، تو وہ مجھ سے برہم ہو جائیں گے، اب تک جو اعتماد کرتے آئے ہیں، وہ ختم ہو جائے گا، بادشاہ سلامت ویسے ہی خار کھائے ہوئے ہیں مجھ سے، یہ وزارت عظمیٰ صرف ریذیڈنٹ کے سہارے پر قائم ہے، یہ سہارا اٹھا تو کیا ہو گا ؟ "

یہ سُنتے ہی سارے شیعہ ہمارے ساتھ ہو جائیں گے !"

"لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا ؟"

"یہ کیوں ؟ ——————"

"اوّل تو بادشاہ کی ذات سے عقیدت کے معاملے میں شیعہ سُنی برابر کے شریک ہیں [1] دوسرے مسجد کے احترام میں بھی شیعہ سُنی سوال پیدا کرنے کی کوشش آپ کے مجتہد العصر صاحب نے ناکام بنا دی ؟ ——————

"یعنی —————— ؟"

"علمائے فرنگی محل، اور مجتہدین لکھنؤ اور مجتہد العصر صاحب دام اقبالہم نے متفقہ طور پر ایک استفتہ کے جواب میں فتویٰ دیا ہے کہ مسجد بہر حال مسجد ہے، اور اس کا تحفظ، ہر مسلمان کا فرض ہے خواہ وہ شیعہ ہو یا سُنی ؛ [2] چنانچہ شیعوں میں بھی وہی جوش پایا جا رہا ہے جو سُنیوں میں ہے !"

---

[1] : قیصر التواریخ ،

[2] : حدیقہ شہدا ، ۔

امیرالمجاہدین سید امیر علی کے قافلۂ جہاد میں جن لوگوں نے شرکت کی تھی، وہ زیادہ تر معمولی قسم کے لوگ تھے، لیکن یہ لشکر روز بروز بڑھتا جا تا تھا۔

اب لشکر میں مزید پانچ چھ سو آدمیوں کا اضافہ ہو گیا تھا!!

یہ شاہجہاں اور بریلی وغیرہ کے پٹھان تھے۔ [1]

اس خبر نے رستم بیگ کو اور زیادہ حواس باختہ کر دیا۔

فرنگی محل کے علماء، اور لکھنؤ کے مجتہدین کا اتحاد ہی کچھ کم تشویش انگیز نہ تھا کہ یہ پٹھان آن نکلے!!

اس کے معنی یہ تھے کہ اگر جہاد شروع ہُوا، تو ان پٹھانوں کی وجہ سے لشکر مجاہدین کو خاصی تقویت پہنچے گی، کافی ہندو مارے جائیں گے، انگریز لشکر نے اگر شرکت کی تو وہ نقصان اٹھائے گا اور شاہی فوج مسجد کے معاملے میں ویسے ہی بددل ہے یا تو لڑنے سے انکار کر دے گی یا راہِ فرار اختیار کرے گی۔

اگر ایسا ہُوا تو کیا ہو گا؟

پھر نواب علی نقی خاں کے سامنے رستم بیگ کیا مُنہ لے کر جائے گا؟

یہ سوچ کر، رستم بیگ کی حالت زیادہ سے زیادہ خستہ اور درماندہ ہوتی جا رہی تھی، آخر ایک ترکیب اُن کی سمجھ میں آئی اور اس ترکیب کے ذہن میں آتے ہی وہ سیدھے لشکرِ مجاہدین میں جا پہنچے۔

مختلف لوگوں کے کیمپ الگ الگ لگے ہوئے تھے، ۵ – ۶ سو پٹھانوں کی راؤٹیاں

---

[1] : تاریخ اودھ

"بجا ارشاد فرمایا سرکار نے، لیکن ذرا کچھ مہلت تو دیجیے، غلاموں کو؟"

"کتنی مہلت چاہتے ہو تم؟"

"کم سے کم ایک ہفتہ تو مل جائے!"

"نہیں رستم بیگ یہ مدت موجودہ حالات میں بہت زیادہ ہے!"

"اچھا تین دن سہی!"

"چلو منظور، ——— لیکن تین دن میں تم کون سے جھنڈے گاڑ لوگے؟"

"حضور، بندے پر بھروسا کریں تو سہی!"

"بھئی بھروسے کا جہاں تک تعلق ہے، اس ساری دنیا میں تم سے زیادہ کسی پر ہم بھروسا نہیں کرتے!"

"غلام کو یقین ہے۔!"

"لیکن یہ سوال ہمارے لیے موت اور زندگی کا سوال بن گیا ہے!"

"انشاء اللہ نہ صرف حضور زندہ رہیں گے، بلکہ سُرخ رُو ہوں گے، ——— یہ دعویٰ ہے اس غلام کا۔!"

نواب صاحب مسکرانے لگے!

رستم بیگ نے اطمینان کا سانس لیا۔!

(۱۷)

نواب علی نقی خاں ابھی ابھی ریذیڈنٹ بہادر سے طویل ملاقات کر کے واپس آئے ہیں۔ اور حد درجہ دلگیر اور آشفتہ خاطر نظر آرہے ہیں۔ اتنے میں رستم بیگ آتے ہوئے دکھائی دیئے، انھیں دیکھ کر نواب صاحب کی تیوریاں چڑھ گئیں، لیکن زبان سے کچھ کہا نہیں، مرزا صاحب جب بالکل قریب آگئے، تو نواب صاحب نے ارشاد فرمایا:

"معلوم ہے میں کہاں گیا تھا؟ اور کہاں سے واپس آرہا ہوں؟"

"بالکل نہیں عالی جاہ؟"

"مجھے صاحب ریذیڈنٹ بہادر نے طلب فرمایا تھا اور ایک طرح سے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اس دیوانے ملّا کا معاملہ جلد از جلد ختم کر دوں؟"

"پھر آپ نے وعدہ کر لیا؟"

"وعدہ کر لیا؟ —— ارے بھئی کس برتے پر وعدہ کروں؟"

"غلام کے برتے پر!"

"تم کون سا کارنامہ انجام دے کے آئے ہو؟"

"بہت بڑا؟"

"سناؤ، ذرا ہم بھی تو سنیں!"

مرزا رستم بیگ نے لشکر مجاہدین کا سارا ماجرا کہہ سنایا، نواب صاحب کے چہرے پر بشاشت اور مسرت کے آثار پیدا ہو رہے تھے، ساری رام کہانی سن کر انھوں نے کہا:

ایک ساتھ ایک ہی جگہ پر نصب تھیں :

رستم بیگ تیر کی طرح سیدھے یہیں پہنچے، اور ان پٹھانوں کے مجمع میں داخل ہو کر، ایک صاحب سے جو عالم، اور لیڈر معلوم ہوتے تھے، پوچھا :

"کیوں حضور، کیا بادشاہِ وقت کی اجازت کے بغیر جہاد جائز ہے ؟" [1]

انھوں نے کہا : "نہیں" !

مرزا صاحب نے کہا : "پھر آپ قتل ہونے آئے ہیں یا شہید ہونے ؟"

مرزا کی یہ بات مولانا کے دل میں کچھ ایسی بیٹھی کہ عزم جہاد ترک کر کے اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلے گئے، مجاہدین میں بھی اختلال پیدا ہُوا،

امیر المجاہدین نے سمجھایا :

"غلبۂ اسلام کے لیے بادشاہ کی اجازت کے بغیر جہاد ناجائز ہے، لیکن اسلام کو زرغۂ اعدار سے بچانے کے لیے اجازت ضروری نہیں !"

مجاہدین رک گئے، لیکن پٹھان تو جا چکے تھے !

---

[1] : تاریخ اجودھیا،

فوراً منشی جی حاضر ہوئے، نواب صاحب نے حکم دیا :

" رستم کو مبلغ دو ہزار روپے ابھی عنایت کیے جائیں ! "

رستم بیگ جب انعام لے چکے تو نواب صاحب نے ان سے فرمایا :

" یہ حویلی بھی تمھاری ہی ہے، جی چاہے یہیں رہو، ورنہ کافی وقت ہے، اپنے گھر ہو آؤ، ہمیں مغرب کے بعد ریذیڈنسی جانا ہے، ابھی تو دو پہر ہے، غروب آفتاب تک آجاؤ ! "

" بہت اچھا، ! "

یہ جواب دے کر مرزا صاحب اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے، !

◎

"بھئی یہ تو بہت اچھا رہا !"

"جی عالی جاہ !"

"واقعی یہ تمھارا عظیم کارنامہ ہے !"

"سمجھتا تو غلام بھی کچھ ایسا ہی ہے ؟"

"تم نے صرف ۵-۶ سو پٹھانوں کو رخصت نہیں کیا، امیر علی کی کمر توڑ دی، لشکرِ مجاہدین کی قوت پارہ پارہ کر دی، علما اور مجتہدوں کا اقتدار ختم کر دیا، اور صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی خوشنودی حاصل کر لی !"

"(مسکرا کر) عالی جاہ ابھی تو انھیں غلام کے اس کارنامے کی خبر بھی نہیں ہوئی ہے ؟"

"ہو جائے گی، ــــــ بہت جلد ہو جائے گی، آج شام کو ہمیں پھر ان کی خدمتِ عالی میں حاضر ہونا ہے۔ ہم انھیں یہ ماجرا سنائیں گے، ــــــ لیکن ایک کام کیوں نہ کرو ؟"

"کون سا کام عالی جاہ ؟"

"تم بھی ہمارے ساتھ ریذیڈنسی چلو، ــــــ یقیناً تمھاری اس ذہانت، اور فراست، اور اس عظیم کارنامے پر وہ تمھیں نوازیں گے، انعام دیں گے، ہو سکتا ہے، تمھارے درماہے میں اضافہ کر دیں گے ؟"

"حضور کا ارشاد ہے تو چلا چلوں گا ــــــ لیکن،"

"ہاں کہو، کیا کہنا چاہتے ہو تم ؟"

"غلام صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ اس کے لیے یہ ڈیوڑھی، سب کچھ ہے، یہاں سے جو کچھ وہ پا لیتا ہے، وہ ہر انعام اور درماہے سے بڑھ کر ہے !"

"ہم تمھارے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں، تمھاری یہی وفاداری ہے، جس نے ہمارے دل میں گھر لیا ہے، ــــــ ہم بھی تمھیں انعام دیں گے، ابھی، ــــــ یہاں آؤ ــــــ !"

یہ صدا سنتے ہی ایک خادم حاضر ہوا، نواب صاحب نے کہا :

"جاؤ منشی جی کو بلا لاؤ !"

"کام تو بہت معمولی ہے!"

"پھر بھی سہی کیا؟"

"بس یہ کہ دربار شاہی میں جو لوگ آیا کریں ان کے نام لکھ لیا کروں، اور شام کو فہرست بنا کر ملاحظہ شاہ میں پیش کر دیا کروں!"

"یہ معمولی کام ہے؟"

"غلام تو یہی سمجھتا ہے عالی جاہ!"

"ہمارے بادشاہ سلامت ضرورت سے زیادہ سادہ لوح ہیں، ورنہ یہ اہم اور گراں قدر کام تمہیں نہ سونپتے!"

"اس میں اہمیت کیا ہے عالی جاہ؟"

"بہت زیادہ ہے ـــــــ لیکن تم اس چکر میں نہ پڑو، جس سفارش پر تمہیں یہ ملازمت ملی ہے، اس کی قیمت ادا کرو!"

"قیمت ـــــــ؟"

"ہاں، ـــــــ قیمت یہ ہے کہ دو فہرستیں بناؤ، ایک ملاحظہ شاہ میں پیش کردو، دوسری ریذیڈنسی میں دے آیا کرو جا کر!"

"بہت خوب، ایسا ہی ہوگا!"

"بادشاہ سلامت کا تمہارے ساتھ سلوک کیسا ہے؟"

"اب تو بہت اچھا ہو گیا ہے!"

"شروع میں اچھا نہیں تھا؟"

"بالکل نہیں، ـــــــ کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آتے تھے!"

"پھر یک بیک ٹھیک کیسے ہو گیا؟"

"ہوا یہ کہ ایک دن میرے خاندان کو پوچھا، وہ بتایا، تو دفعتہً ارشاد فرمایا، کیا تو پتن کا بیٹا ہے؟

(۱۸)

حسبِ معمول نواب علی نقی خاں، عصر کے بعد زنان خانے سے نکل کر مردانے میں آ گئے، اپنے آدمی کو پہلے ہی حکم دے رکھا تھا کہ نمازِ مغرب میں، پڑھ کر ریذیڈنسی جانا ہے، لہٰذا فٹن تیار رہے۔

اپنی وسیع اور کشادہ حویلی کے سرسبز لان پر وہ ایک شاندار کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے سامنے دس پندرہ کرسیاں اور پڑی ہوئی تھیں، ان پر دوسرے اہلِ غرض، ملاقاتی، اور مصاحب بیٹھے ہوئے تھے، نواب صاحب اخلاق و تپاک کے ساتھ ہر ایک گفتگو کر رہے تھے،

اتنے میں حاضرین میں سے ایک شخص کی طرف دیکھ کر نواب صاحب نے فرمایا، :

"کیوں میاں کلن تمھارے مسئلے کا کیا ہوا؟"

وہ مسکرا کر بولا :

"بھلا حضور کی، اور صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی سفارش ناکام ہو سکتی تھی، فوراً ملازمت مل گئی اگرچہ غلام نے محسوس یہ کیا کہ بادشاہ سلامت ان سفارشوں اور تقرر سے کچھ خوش نہیں ہیں!"

علی نقی خاں نے بے رخی کے ساتھ کہا :

بادشاہ سلامت کی خوشی یا ناخوشی کا ذکر چھوڑو، یہ بتاؤ تمھیں ملازمت دربارِ شاہی میں مل گئی؟"

"مل گئی عالی جاہ!

"کیا کام سونپا گیا ہے تمھیں؟"

کلن خاموش ہوگیا، لیکن اس کے دل میں کھٹک سی پیدا ہوگئی کہ یہ ماجرا کیا ہے آخر، وزیر اعظم، صاحب ریذیڈنٹ کی خدمت میں حاضر باشوں کی فہرست پیش کرنے پر کیوں مُصر ہیں؟"

اس کے دل ودماغ میں کش مکش سی برپا تھی:

کبھی خیال آتا، میں ٹھہرا ملازم، وزیر اعظم، اور ریذیڈنٹ کی سفارش سے مجھے ملازمت ملی ہے، ان کا کہا کرنا چاہیئے، واقعی سفارش کی کچھ قیمت بھی تو ہونا چاہیئے، اور مجھے اس کے سوا بھی کرنا چاہیئے،

کبھی سوچتا، ضرور اس میں بادشاہ سلامت کا زیاں ہے!

آخر ایک غیر ملک کے نمائندے کو اس فہرست کی کیا ضرورت ہے؟ ——!"

جی چاہتا، اس ملازمت ہی کو ترک کر دینا چاہیئے،

لیکن گھر کی ناگفتہ بہ حالت فوراً سامنے آجاتی، اس گھر کو مٹتے اور تباہ ہوتے کس طرح دیکھ سکوں گا؟

پھر جان عالم کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے:

"تُو پتن کا بیٹا ہے؟"

جب میں نے اقرار کیا تو فوراً گلے سے لگایا، اور کہا:

"خدا بخشے، ہمارا بچپن کا ساتھی تھا!"

میں نے کہا ہاں، فوراً گلے سے لگالیا، میری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ کر دیا، اور فرمایا، پَتّن، خدا اسے بخشے ہمارا بچپن کا ساتھی تھا، تمھارا ناک نقشہ اس سے بہُت ملتا ہے۔ ہم تمھیں اسی کی طرح عزیز رکھیں گے۔"

"چلو یہ بھی بہت اچھا ہُوا۔ ـــــ لیکن دیکھو اپنی اصل ذمّہ داری کبھی فراموش نہ کرنا؟"

"یعنی دوسری فہرست؟"

"ہاں، وہی!"

"لیکن یہ غدّاری تو نہیں ہوگی آقائے ولی نعمت کے ساتھ؟"

"احمق ہو تم، ـــــ بھئی پَتّن ہمارا تو لنگوٹیا یار تھا، بادشاہ سلامت سے زیادہ تم پر ہمارا حق ہے، اور اس میں غدّاری کاہے کی؟ صاحب ریذیڈنٹ اس بات سے باخبر رہنا چاہتے ہیں کہ بادشاہ سلامت کے حضور میں کون کون لوگ باریاب ہوتے!؟"

◎

بھر کر، اگراں قدر تنخواہ لے کر اپنے بادشاہ کی مخبری کروں، یہ نہیں کر سکتا، خواہ ملازمت رہے یا نہ رہے!"

اس فیصلے کے بعد اسے اطمینان سا ہوگیا، دل نے ایک طرح کا سکون سا محسوس کیا، اتنے ملازم آیا، اور اس نے وضو کے لیے پانی رکھے جانے کی اطلاع دی۔ نواب صاحب نے وضو کیا، مغربین کی نماز پڑھی، اور پوچھا :

" فٹن تیار ہے؟"

جواب ملا :

" جی تیار ہے!"

نواب صاحب فٹن کی طرف روانہ ہوئے، لیکن سوچتے جا رہے تھے، مرزا رستم بیگ اب تک کیوں نہیں آیا؟

◎

اور یہ بھی تو فرمایا تھا :

" تمھارا ناک نقشہ اس سے بہت ملتا ہے ، ——— ہم تمھیں اسی کی طرح عزیز رکھیں گے !"

اور میری تنخواہ میں بھی ایک دم پچاس روپے ماہوار کا اضافہ کر دیا ،

کیا اتنے مہربان ، رعیت پرور اور بندہ نواز بادشاہ کو دھوکا دوں ؟

اس خاندان کی وفاداری تو میری گھٹی میں پڑی ہے ،

والد مرحوم نے مرتے وقت جو چند وصیتیں کی تھیں ایک ان میں یہ بھی تھی :

" اپنے بادشاہ سلامت کے وفادار رہنا ، اس کے پسینے پر خون بہا دینا باعثِ فخر سمجھنا ، !"

یا اللہ میں کیا کروں ؟

کاش یہ ملازمت مجھے نہ ملی ہوتی !

نہ ریذیڈنٹ بہادر کے حکم سے ، اور ——— وزیر اعظم کے فرمان سے سرتابی کر سکتا ہوں ،

اور ، ——— اپنے بادشاہ سے بھی غدّاری نہیں کر سکتا ، اس کی مخبری نہیں کر سکتا ،

یہ مخبری نہیں تو اور کیا ہے کہ سفارش کی " قیمت " کے طور پر حاضر باشوں کی فہرست کی ایک نقل ریذیڈنٹ بہادر کی خدمت میں پیش کر دیا کروں ——— !

کیا استعفا دے دُوں ؟

یا فہرست پیش کرنے سے انکار کر دُوں ؟

آخر کافی سوچ بچار کے بعد کلّن نے یہ فیصلہ کیا کہ بادشاہ کی مخبری کسی قیمت پر بھی نہیں کرے گا ، زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ فاقے کرنا پڑیں گے سو وہ منظور ، لیکن پیٹ

وہ روتا ہُوا بولا :

"جی ہاں وہ قتل ہوگیا !"

نواب صاحب نے اپنے حواس پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پوچھا :

"اس کا تو کوئی بھی دشمن نہیں تھا، اسے کس نے قتل کیا ؟"

سہراب نے ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ کہا :

"یہی تو حیرت ہے سرکار، ــــــــ غروب آفتاب کے وقت وہ تیار ہُوا۔ میں نے پوچھا، اب کہاں چلے ؟ وہ بولا ، حضور وزیر اعظم صاحب نے یاد فرمایا ہے مجھے، ــــ"

"اس نے ٹھیک کہا، واقعی ہم نے اسے بلایا تھا، ــــ پھر ؟"

"لباسِ فاخرہ پہن کر وہ باہر آیا، اتنے میں گلی سے ایک شخص نکلا، اور اس نے تابڑ توڑ چاقو کے کئی وار کیے، بیچارہ دھان پان پہلے سے تھا، اتنے سارے حملوں کی تاب کیا لاتا ؛ نڈھال ہوکر گرا اور دم توڑ دیا ، !"

"(انتہائی صدمے سے) دم توڑ دیا ؟"

"(روتے ہوئے) جی سرکار !"

"یعنی مرگیا وہ ؟"

"جی سرکار !"

"آخر کس جرم میں ؟"

"یہی تو پتہ نہیں چلتا ؛"

"قاتل کا بیان نہیں لیا گیا ؟ ــــــــ وہ کیا کہتا ہے ؟"

"قاتل ہے کہاں جو اس کا بیان لیا جائے ؟"

"کیا مطلب ؟ ــــــــ کیا قاتل گرفتار نہیں ہو سکا ؟"

"جی نہیں سرکار !"

(۲۰)

نواب صاحب ابھی فٹن تک مشکل سے پہنچے ہوں گے کہ رستم بیگ کا بڑا بھائی، سہراب حاضر ہُوا۔

نواب صاحب نے اس کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا:

"تم کیوں ناوقت آ ٹپکے، ہم تو رستم کے منتظر تھے؟"

یہ سُنتے ہی، سہراب دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ نواب صاحب فٹن پر چڑھتے چڑھتے رک گئے۔ فرمایا:

"کیا بات ہے روتے کیوں ہو؟"

سہراب نے پچھاڑیں کھاتے ہوئے کہا:

"رستم، ـــــــ میرا قوتِ بازو!"

نواب صاحب چل کر اس کے قریب آ گئے، شفقت کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور پوچھا:

"کیا بات ہے؟ ـــــــ کیا ہُوا رستم کو؟"

سہراب نے بڑی مشکل سے اپنے گریۂ بے اختیار پر قابو پاتے ہوئے کہا:

"قتل ـــــــ"

جیسے نواب صاحب کے سینے پر کسی نے گھونسہ مار دیا، انھوں نے سراپا اضطراب بن کر پوچھا:

"قتل ـــــــ؟"

رستم بیگ کے قتل کا پتہ کوششِ بسیار کے باوجود نہیں چل سکا۔ علی نقی خاں نے کوتوال شہر کو انعام کا لالچ بھی دیا، اور سزا کی دھمکی بھی۔ اور اس نے چاروں کھونٹ اپنے آدمی دوڑائے مگر قاتل کچھ اس طرح لاپتہ ہُوا تھا کہ کہیں بھی اس کا سراغ نہیں لگ سکا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ قاتل کو بہ چشم خود دیکھنے والا کوئی گواہ اب تک فراہم نہ ہو سکا تھا، اور اسی پر اس کے سراغ کا انحصار تھا۔

ادھر علی نقی خاں کا حال یہ تھا کہ انھیں رستم کے قتل کا اتنا غم نہیں تھا، جتنی یہ فکر تھی کہ بہت سے راز اس کے ساتھ گئے، اور اب اس جیسا مخلص، مستعد، کارگزار، اور وفادار آدمی پیدا کرنا آسان نہ تھا اس کی جگہ خالی تھی، اور اس خالی جگہ کو، کوئی پُر نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت جانِ عالم نے بھی علی نقی خاں اور کوتوالِ شہر کو بُلا کر تاکید کی :

"اس مظلوم کے قاتل کا سراغ جلد از جلد لگنا چاہیئے۔ ہمارے دل میں اس مرحوم کی بہت جگہ تھی، وہ ہمارا پشتینی وفادار تھا، اس کا باپ، اس کا دادا، سب ہمارے وفادار تھے!"

یہ فرما کر ابھی علی نقی خاں، اور کوتوالِ شہر رخصت نہیں ہُوئے تھے، اپنے میر منشی کو طلب فرما کر حکم دیا:

"رستم بیگ کے ہاں، دو ہزار روپے فوراً پہنچا دو، اس کی بیوہ کا ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کر دو، اور اس کے بچّوں کی تعلیم و تربیت کے مصارف خزانۂ شاہی سے ادا کیے جائیں، ! ——— اور ہاں تجہیز و تکفین کے جملہ مصارف جو ہُوئے

"اس نے قتل کیا، اور صاف بچ کر نکل گیا؟"

"جی سرکار یہی ہُوا!"

"(ایک عزم کے ساتھ) اس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا، ہم اس کا بدلہ لیں گے، اور قاتل کی بوٹی بوٹی کاٹیں گے!"

"کاش ایسا ہو؟"

"ضرور ایسا ہو گا!"

نواب صاحب نے فٹن واپس کر دی، اپنے کمرے میں تشریف لائے، اور حکم صادر فرمایا کہ پولیس کے افسرِ اعلیٰ، یعنی کوتوالِ شہر کو فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا جائے!

پھر وہ سر جھکا کر بیٹھ گئے، واقعی انھیں رستم بیگ کے قتلِ ناگہانی کا بہت صدمہ ہُوا تھا ـــــ!"

◎

نواب صمصام الدولہ نے جواب دیا :

"جی ہاں اس لیے بھی، ـــــــ اور اس لیے بھی کہ وہ صاحب ریذیڈنٹ بہادر کا بھی ملازم تھا، اور دونوں جگہ سے تنخواہ اور انعامات مخبری اور جاسوسی کے سلسلے میں وصول کیا کرتا تھا؛"

"وہ ہمارے خلاف مخبری کرتا تھا؛"

"جی ہاں، جان عالم، ـــــــ اور یقیناً اس کا قتل حضور ہی کے کسی جاں نثار نے کیا ہے، ورنہ واقعی وہ امن پسند شخص تھا، کسی سے اس کا لڑائی جھگڑا نہ تھا۔!"

جان عالم نے کوئی جواب نہیں دیا، حیرت سے صمصام الدولہ کو دیکھنے لگے!

ہوں، ہماری طرف سے ادا کیے جائیں!"

علی نقی خاں نے یہ احکام و ہدایات سُن کر عرض کیا:

"خدا جانِ عالم کو تا ابد سلامت رکھے، اور ان کا ستارۂ اقبال چمکتا رکھے، کتنا خیال فرماتے ہیں وہ اپنے جاں نثاروں کا!"

جانِ عالم نے فرمایا:

"اگرچہ مرحوم ہمارا باقاعدہ متوسلی نہیں تھا، بلکہ تمھارے یہاں ملازم تھا، لیکن ۲۵ روپیہ ماہوار خاندانی پنشن اس کو ملتی رہتی تھی، اس خاندان کی وفاداریاں ہم بُھلا نہیں سکتے، اور اپنے جاں نثاروں کی قدر افزائی ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟"

علی نقی خاں نے سر ادب سے جھکا کر عرض کیا:

"بے شک جانِ عالم!"

اس موقع پر نواب منّن خاں، اور نواب صمصام الدولہ بھی حاضر تھے۔ علی نقی خاں کے جانے کے بعد صمصام الدولہ نے کہا:

"اگر جان کی امان پاؤں تو میں بھی کچھ عرض کروں؟"

جانِ عالم نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ہم سے تو دشمن کی جان کو بھی خطرہ نہیں ہوسکتا، نہ کہ تم جیسے مخلص اور بہی خواہ۔۔۔ کہو"

صمصام الدولہ نے عرض کیا:

"جانِ عالم نے رستم بیگ کے خاندان کی جو دستگیری فرمائی، وہ آپ کے شایانِ شان تھا۔ اس کے قاتل کا سراغ لگانے کی جو ہدایت فرمائی یہ بھی عین تقاضائے عدل و انصاف تھا۔ لیکن، وہ جانِ عالم کا وفادار ہرگز نہیں تھا۔"

جانِ عالم نے پوچھا:

"کیا اس لیے کہ وہ علی نقی خاں کا ملازم تھا؟"

"جی، —— اور صرف یہی نہیں، ابھی چند روز کی بات ہے میرا ایک خانہ زاد ظفر علی ہے، ظفر علی اور رستم بیگ دونوں بچپن کے دوست اور ساتھی ہیں، کہنا چاہیئے لنگوٹیا یار ہیں، اس نے ظفر علی سے کہا، یار کیا پچاس پر تل پر نواب صاحب کے ہاں پڑے ہو، یہ بھی لیتے رہو، اور ریلو ریذیڈنٹ صاحب کے ہاں سے تمھارے پانچ سو مقرر کرائے دیتا ہوں، ظفر علی نے پوچھا، وہ کیسے؟ وہ کہنے لگا۔ تمھارے نواب صاحب جان عالم کے ہر وقت کے حاضر باشوں میں ہیں، سُن گن لیتے رہو ان دونوں میں کیا باتیں ہوتی ہیں اور سرکار برطانیہ کے خلاف کون کیا اظہار خیال کرتا ہے، بس اتنی سی رپورٹ پہنچانا پڑے گی!"

"پھر ظفر علی نے کیا جواب دیا؟"

"وہ کہنے لگا، نا بابا، مَیں اپنے آقا سے غداری نہیں کر سکتا۔ مجھے کہنے کو پچاس ملتے ہیں، لیکن انعام و اکرام ملا کے پانچ سو پڑ جاتے ہیں، بہت ہیں؟"

"تم سے یہ واقعہ ظفر علی نے خود بیان کیا؟"

"جی ہاں —— ابھی جب غلام حضور کے ہاں حاضر ہو رہا تھا تو اس نے خود یہ کہانی سنائی اور مجھے مشورہ دیا کہ ایسے لوگوں سے ہوشیار رہوں! یہاں آیا تو اس کے قتل کی صدائے بازگشت سُنی!"

"ظفر علی کام کا آدمی ہے، قابلِ قدر آدمی ہے!"

"بے شک، جان عالم! —————— مَیں نے اس کی تنخواہ دو سو روپے اُسی وقت کر دی تھی!"

○

(۲۲)

تھوڑی دیر کے بعد جان عالم نے، نواب منّن خاں سے کہا :

"تم نے سنا، صمصام الدّولہ نے کیا کہا ؟"

وہ بولے : "جی غلام نے سُن لیا !"

"تمھارا کیا خیال ہے ؟"

"وہی جو صمصام الدّولہ کا ہے ؟"

"یعنی رستم بیگ ہمارے خلاف علی نقی اور ریذیڈنٹ سے مخبری کیا کرتا تھا ؟"

"جی ہاں، ————"

"لیکن تمھیں کیسے معلوم ہُوا ؟"

"موٹی سی بات ہے علی نقی خاں اسے ایک ہزار ماہوار تنخواہ دیا کرتے تھے ؟"

"ایک ہزار ؟"

"جی ہاں —— جان عالم !"

"یہ تو بہت ہُوئی، وہ کون ایسا قابل تھا ؟"

"کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس سے کوئی خاص کام لیا جاتا تھا اور وہ مخبری کے سوا کیا ہو سکتا ہے ؟"

"لیکن ریذیڈنٹ، ————"

"غلام نے اور صمصام الدّولہ نے اور ہم دونوں کے آدمیوں نے بارہا اسے ریذیڈنسی آتے جاتے دیکھا ہے"

"واقعی ———— ؟"

محل کے اندر.......

سازش اور زندگی کی چہل پہل ——

۱

کافی دیر تک جانِ عالم کی خدمت میں منّن خاں اور صمصام الدّولہ حاضر رہے، پھر محل کے اندر گئے، زمرّد اور نازو کا بڑا وقت اب یہیں صرف ہوتا تھا، منّن خاں نے زمرّد سے کہا :

" بھئی اب ہم حویلی جا رہے ہیں !"

وہ مسکراتی ہوئی بولی :

" میں نے تو منع نہیں کیا ہے آپ کو ؟"

ابھی منّن خاں نے جواب میں کچھ کہا نہیں تھا کہ جمائی لیتے ہوئے صمصام الدّولہ نے نازو کی طرف دیکھ کر کہا :

" ہاں بھئی اب چلنا چاہیئے ؟"

چہرے پر کسی قسم کا تاثر ظاہر کیے بغیر اس نے کہا :

" خدا حافظ ، جائیے !"

صمصام الدّولہ نے کہا :

" تو کیا اکیلا جاؤں . تم نہیں چلو گی ؟

وہ بولی : " ہم دونوں ، ———— یعنی میں اور زمرّد ، اب ایک ہفتے تک یہیں رہیں گی !"

" ایک ہفتے تک ؟"

" ہاں بھئی ہاں !"

بے چارے منن خاں کچھ جھینپ سے گئے، زمرّد نے ان کی پشت پناہی کرتے ہوئے کہا:

"اے ہے تم بڑی کم سن ہو؟"

وہ بولی:

"کم سن تو ہم دونوں ہیں۔ تمھارے نواب صاحب تم سے ۳۰-۳۵ برس بڑے اور ہمارا نواب ۴-۵ برس بڑا ہوگا۔!"

زمرّد نے اکتا کر کہا:

"اچھا بھئی بخشو، یہ کیا دُکھڑا لے کر بیٹھ گئیں؟"

وہ بولی:

"میں تمھاری توہین نہیں برداشت کرسکتی!"

زمرّد ہنس پڑی:

"میری توہین؟"

منّن خاں نے صمصام الدولہ سے کہا:

"چلو بھئی، ان لوگوں کو جو جی میں آئے کہہ لینے دو۔! ہم لوگ بنے اس لیے ہیں کہ یہ کہیں اور ہم سُنا کریں۔!"

حضرت محل نے ان دونوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا:

"بات یہ ہے کہ آصف الدّولہ[1] کے امام باڑے میں ایک مجلس میری طرف سے

---

[1]: آصف الدولہ کا امام باڑہ لکھنؤ کی بہترین عمارتوں میں سے ہے۔ اس کی بھول بھلیاں بہت مشہور ہے اور سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اس کے بہت وسیع اور کشادہ ہال کی چھت ہے، اتنی بڑی چھت بغیر ڈاٹ کے، انگریز ماہرین تعمیرات نے اس کی خوبیٔ تعمیر کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔!

"لیکن کیوں ؟"

"پوچھ لیجئے اپنی سرکار (حضرت محل) سے ؟"

صمصام الدولہ نے حضرت محل سے پوچھا تو کچھ نہیں، البتہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف تکنے لگے، اس نے کہا :

"ہاں یہ دونوں، کم از کم ایک ہفتہ یہاں رہیں گی !"

منّن خاں نے کہا :

"اگر حضور کی مرضی ہے تو، ——————"

صمصام الدولہ بول پڑے :

"پھر کیا عرض کیا جاسکتا ہے ؟"

نازو تلملا کر بولی :

"اگر حضور کی مرضی نہ ہوتی تو شاید آپ چوٹی پکڑ کر لونڈی کو لے جاتے، منھ دھو رکھیئے ایسے کوئی اور لوگ ہوتے ہوں گے !"

صمصام الدولہ نے کہا :

"تم تو جیسے بھری بیٹھی تھیں ؟ بھلا میری یہ مجال ہے کہ تمھاری مرضی کے خلاف کچھ کرسکوں، تم تو اس قدر حاوی ہوگئی ہو مجھ پر کہ جو مرضی ہوتی ہے حکم دیتی ہو، اور میں بے چون وچرا تعمیل کرتا ہُوں !"

نواب منّن خاں نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا :

"بھائی بہ خدا ہماری بھی یہی کیفیت ہے !"

نازو بولی :

"آپ ٹھہرے بوڑھے مریل، زمرّد آپ سے کم از کم ۳۰-۳۵ سال چھوٹی ہوگی، اس کے ایثار، اور قربانی کا تقاضا بھی ہے، آپ کو کرنا بھی چاہیئے !"

صمصام الدّولہ نے جواب دیا :

"ہاں، ———— لیکن اپنے آقا کے دشمن کا، اپنے ملک کے دشمن کا، اپنی قوم کے دشمن کا، !"

نازو کا تجسّس قائم رہا، اس نے سوال کیا :

"بتاؤ تو سہی کس نے اس غارت گئے کو مارا ؟"

"نام تو نہیں بتاؤں گا، بس اتنا کافی ہے کہ ہمارا آدمی ہے !"

"اور اگر وہ پکڑ لیا گیا ؟"

"اوّل تو یہ ناممکن ہے، وہ ہرگز پکڑا نہیں جا سکتا، اور بہ فرضِ محال پکڑ بھی لیا گیا، تو مَیں نے جانِ عالم کو بتا دیا ہے، ————

"یہ کہ قاتل کون تھا ؟"

"یہ کہ رستم بیگ مخبر اور جاسوس تھا، !"

"پھر کیا ہو گا ؟"

"اب اس کا قاتل گرفتار ہو جائے تو بھی پھانسی نہیں پا سکتا! ———— اور ہمارے پاس ایسے وسائل بھی ہیں کہ ہم اسے جیل سے آزاد کرا لیں !"

"ہائے غضب، تم ڈاکو ؟ تم قاتل ؟"

"ہاں بھئی سب کچھ سننا پڑتا ہے !"

"خدانخواستہ اگر کوئی افتاد پڑی تو تم تو دھر لیے جاؤ گے اور یہ نواب (مظفّر خاں) مزے کریں گے، ——— انھیں بھی کیوں نہیں برابر کا شریک کر لیتے، تاکہ دونوں کا یکساں حشر ہو، !"

"(ہنستے ہُوئے) تم خواہ مخواہ نواب صاحب کو چڑا رہی ہو ؟"

"اے تو کچھ جھُوٹ کہہ رہی ہُوں ؟"

"بالکل جھُوٹ ؟"

منعقد ہو رہی ہے، یہ صرف خواتین کی مجلس ہوگی، اور اس کا سارا انتظام و انصرام نازو اور زمرّد کے سپرد ہے، اس مجلس میں جان عالم کے لیے مَیں دعا مانگوں گی کہ انگریزوں کے شر سے خدا انھیں محفوظ رکھے، اور ان کی سلطنت قائم رکھے۔ غریبوں اور محتاجوں کو خیرات بھی تقسیم ہوگی!"

منّن خاں جاتے جاتے رک گئے، اور کہنے لگے :

" بڑی عمدہ تجویز ہے!"

صمصام الدّولہ نے بھی تائید کی :

" ہم لوگ جو کچھ کوششیں کر رہے ہیں وہ اپنی جگہ، لیکن، دل سے نکلی ہوئی دعا کے تیر بہ ہدف ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں!"

حضرت محل نے سوال کیا :

" یہ رستم بیگ کا کیا قصّہ ہے؟ کس نے اسے قتل کر دیا؟ کوئی شرپسند آدمی تو نہیں تھا؟"

صمصام الدّولہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا :

" وہ انگریزوں کا مخبر تھا، ہم نے اسی کو تاکا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے موت کے گھاٹ اتار کر رہیں گے؟"

نازو نے پوچھا :

" لیکن کس نے اسے قتل کیا؟"

صمصام الدّولہ نے جواب دیا :

" مَیں نے صرف مَیں نے!"

وہ مسکراتی ہوئی بولی :

" قاتل، !"

زمرّد نے کہا :

" اس کا ذمّہ میں لیتی ہُوں ، آپ اس کی باتوں میں وقت نہ ضائع کیجئے ، یہ تو خواہ مخواہ کی باتیں کرکے زیادہ سے زیادہ دیر تک آپ کو روکے رکھنا ، اور آپ کی باتیں سننا چاہتی ہے !"

نازو نے زمرّد کو ہلکا سا دھکّا دیا ، اور کہا :

" چل ، جھوٹی کہیں کی ، ———— مَیں پروا نہیں کرتی کسی کی ، جس کا جی چاہے بیٹھے ، جس کی مرضی ہو جائے !"

صمصام الدّولہ نے ادب سے سر جھکایا ، اور کہا :

" بجا فرمایا ، آپ کیوں پروا کرنے لگیں کسی کی ، لیکن اس وقت تو جانا ہی مناسب ہے ، ———— آیئے نواب صاحب !"

◎

"یہ لو، وُہ کیسے ؟"

"نواب صاحب عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں، اور مَیں ان کا حد سے زیادہ ادب کرتا ہوں —

"زمرّد یاد رکھنا، —————

"زمرّد سے زیادہ تم یاد رکھو، یہ یاد رکھو کہ عمر کے اس تفاوت کے باوجود، ہمارے مقاصد ایک ہیں، خیالات ایک ہیں، منزلِ مقصود ایک ہے، افکار ایک ہیں، ہم ہر حالت میں ایک ہیں، اور ایک رہیں گے، ہمیں کوئی جُدا نہیں کرسکتا، پھانسی کا پھندا پڑے گا تو دونوں کی گردنوں میں، —

"خدا نہ کرے، —————

"اور خلعت ملے گا، انعام و اکرام کی بارش ہوگی تو دونوں پر، ————— ہم دونوں کوئی کام ایک دوسرے سے چھپا کر نہیں کرتے، بلکہ باہمی صلاح و مشورے کے بعد کرتے ہیں، اور یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ اس کے ذمّہ دار یکساں طور پر ہم دونوں ہیں، —————

حضرت محل ہنسنے لگی، اس نے کہا :

"یہ نازو تو آدھی پاگل ہے، محض آپ کو چھیڑنے اور نواب (منّن خاں) کو چڑانے کیلیے یہ باتیں کر رہی تھی، ورنہ یہی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے آپ کی اور نواب صاحب کی سچّی دوستی کے وہ گُن گا رہی تھی کہ آپ کی یہ لمبی اور پُر اثر تقریر بھی اس کے سامنے ہیچ ہے !"

نواب منّن خاں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا :

"میں جانتا ہوں، بہت اچھی طرح جانتا ہُوں !"

صمصام الدولہ نے مسکراتے ہوئے کہا :

"تو پھر مجھے اپنے الفاظ واپس لے لینے چاہئیں ؟"

نواب صاحب نے جواب دیا : "فوراً !"

صمصام الدولہ نے کہا : "بہت اچھا واپس لے لیتا ہُوں !"

نازو بولی : "لیکن مَیں واپس کروں جب ؟"

نہیں، اور مَیں کچھ ایسے تردداتِ میں مُبتلا رہا کہ تمھیں بُلوا بھی نہ سکا، اچھا ہُوا تم آگئے، اب یُوں کرو، ——————

کلّن نے سر جھکا کر کہا :

"جی ارشاد، ——————

صمصام الدّولہ نے فرمایا :

"فی الحال تم ہمارے ہاں کام کرو، تمھارے والدِ مرحوم سے میرے بڑے گہرے دوستانہ تعلّقات تھے، ——————

"اسی لیے تو ہر بپتا کے وقت آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہُوں، ——————

نواب صاحب نے فرمایا :

" اچھا کرتے ہو!"

کلّن نے عرض کیا :

" پہلی مرتبہ جب میرُ منشی کے پاس مجھے آپ نے بھیجا تھا، تو دو سو روپے مرحمت فرمائے تھے، ——————

"وہ ختم ہو چکے ہوں، یا جب ختم ہوں، اور لے سکتے ہو!"

"نوازش ہے آپ کی!

نواب صاحب نے فرمایا :

ہاں تو، تم ہمارے ہاں کام شروع کر دو، فی الحال تمھیں ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ ملے گا کھانا یہیں کھاؤ گے، کچھ عرصے کے بعد اضافہ بھی کر دیا جائے گا۔"

"لیکن، ——————

"ہاں ہم جانتے ہیں، تمھاری تعلیمی استعداد زیادہ نہیں ہے!"

"زیادہ کیا بالکل نہیں ہے، —————— نہ ہونے کے برابر، !"

(۲)

صمصام الدولہ اپنی حویلی پہنچے تو سارے مصاحب اور حاضر باش انتظار کر کے واپس جا چکے تھے، دیوان خانے میں بڑی سی مومی شمع جل رہی تھی، اور ایک شخص سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا، ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کسی سخت پریشانی اور ذہنی کش مکش میں مبتلا ہے، !

صمصام الدولہ جیسے ہی دیوان خانے میں داخل ہوئے، وہ شخص سروقد احتراماً کھڑا ہو گیا، انھوں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، اور کہا :

" ارے کلن میاں تم !"

وہ ادب سے بولا :

" جی خانہ زاد ہی ہے !

لیکن اتنے ناوقت ؟

کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں !"

انھوں نے کہا :

" میں سمجھ گیا، ملازمت کا معاملہ ہو گا، ——— بھئی یہ معاملہ اتنا چھوٹا تھا کہ حضرت جانِ عالم سے کچھ عرض کرنا میں نے مناسب نہ جانا، میر منشی سے کہا تھا، مگر اس نے عُذر کر دیا کہ عملۂ شاہی میں کسی نئے آدمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ——— میں منتظر رہا کہ تم آؤ، تو یہ واقعہ بتا دوں، تم آئے

"علی نقی خاں، اور ریذیڈنٹ کی سفارش سے یہ ملازمت ملی!"

"علی نقی خاں اور ریذیڈنٹ کی سفارش سے؟"

"جی ہاں، ــــــــــــ"

"لیکن تمھیں ان دونوں کی سفارش حاصل نہیں کرنی چاہیئے تھی!"

کلّن نے عرض کیا:

"مَیں تو ان کے ہاں جانے کا حوصلہ بھی نہیں کرسکتا تھا!"

صمصام الدّولہ نے پوچھا:

"پھر، ــــــــــــ"

"رستم بیگ اصرار کر کے مجھے لے گئے تھے دونوں جگہوں پر!"

"انھیں تم کیا جانو؟"

"میر منشی کے ہاں سے جب دل گرفتہ، اور مایُوس مَیں لوٹا، تو باہر یہ کھڑے نظر آئے، پُوچھا:

"زندگی سے بے زار کیوں نظر آرہے ہو؟"

مَیں نے سارا ماجرا سُنا دیا، !

ہنسے اور کہنے لگے:

"میر منشی کا باپ بھی تمھیں ملازمت دے گا، ــــــــــــ اور پھر آپ کا نام لے کر کہا، ان کی یہاں کیا چلتی ہے، آؤ، میرے ساتھ، ! آج اور ابھی ملازمت ملی جاتی ہے، ــــــــ مَیں ان کے ساتھ ہو لیا، وہ مجھے پہلے علی نقی خاں کے ہاں لے گئے، ان سے تخلیے میں کچھ باتیں کیں، پھر ان سے ایک خط لکھایا، اس کے بعد ریذیڈنٹ کے پاس لے گئے، اس سے انگریزی میں کچھ باتیں کرتے رہے۔ اُس نے بھی ایک خط لکھ کر دے دیا!"

"اس کی فکر نہ کرو، ـــــــ خرید و فروخت کا کام اپنے ذمّے لے لو!"

"جی خرید و فروخت، ـــــــ"

"ہاں، ـــــــ حویلی میں جو چیز بھی خریدی جائے، وہ تم ہی خریدو گے، اس کا حساب بھی تم ہی رکھو گے، ـــــــ"

لیکن جناب والا، ـــــــ

"یہ بہت ہلکا کام ہے، آسانی سے کر سکتے ہو، !"

"وہ تو ہے، لیکن ـــــــ"

"اب لیکن کیا؟ ـــــــ تنخواہ کم ہے؟ ـــــــ اچھا دو سو لے لیا کرنا، !"

"جی نہیں ـــــــ مجھے عملۂ شاہی میں ملازمت مل گئی ہے!"

"لاحول ولا قوۃ، ـــــــ یہ میر منشی کتنا جھوٹا آدمی ہے، مجھ سے معذرت کر دی، اور تمھیں ملازمت دے دی!"

"جی اُس نے تو نہیں دی!"

"(متحیّر ہو کر) پھر کس نے دی؟"

"خود حضرت جان عالم نے!"

(اور زیادہ متحیّر ہو کر) حضرت جان عالم نے؟ تُم اُن کی خدمت میں حاضر ہو گئے تھے، ـــــــ خیر ٹھیک ہے تمھارے والد ممتن کو وہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں، اور اس کے قدر گزاروں میں ہیں!"

"لیکن، ـــــــ وہ ملازمت مجھے حضرت جان عالم نے والد سے واقفیت اور شناسائی کی بنیاد پر نہیں دی!"

"(سراپا تحیّر بن کر) پھر؟"

خط اسی وقت پہنچا دیجیے، اور ان کا کرشمہ دیکھ لیجیے۔"

میر منشی صاحب سے کچھ بن نہ پڑا، واقعی خط لے کر فوراً حضرت جانِ عالم کی خدمت میں گئے۔ اور ذرا دیر کے بعد واپس آئے تو پروانۂ ملازمت ان کے ہاتھ میں تھا، میں ملازم رکھ لیا گیا تھا!"

"چلو اچھا ہُوا، ہمیں خوشی ہُوئی ——— کام کیا ہے؟"

"بہت معمولی؟"

"پھر بھی؟"

"بس آئندہ و روندگی فہرست تیار کرنا، اور دوسرے روز خدمتِ والا میں پیش کر دینا!"

"خوشی ہوئی ——— تم بھی خوش ہو؟"

"جی ہاں تھا تو!"

"(حیران ہوکر) کیا کہا؟ کیا اب خوش نہیں ہو؟"

"بالکل نہیں!"

"(سراپا حیرت بن کر) ارے یہ کیوں؟

میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ استعفا دے دوں؟"

"استعفا؟ ——— تم مستعفی ہو جانا چاہتے ہو؟"

"جی ہاں جناب والا!"

"لیکن خدا کے بندے کیوں؟"

کلّن نے عرض کیا:

"میں اپنے آقائے ولی نعمت سے غدّاری نہیں کر سکتا، ان کی مخبری نہیں کر سکتا۔ اِس ملازمت کے بدلے مجھے فاقہ کر کے مر جانا منظور ہے!"

"اچھا یہ بات ہے؟ ——— پھر کیا ہُوا؟"

"پھر وہ مجھے لے کر، میر مُنشی کے پاس آئے اور سفارش کی، انھوں نے کہا صمصام الدّولہ جیسے آدمی کی سفارش پر بھی ملازمت نہیں دے سکا، کوئی جگہ ہی نہیں ہے، جان عالم سے کیا کہوں کہ اسے کس جگہ پر رکھ لیا جائے؟"

یہ سُن کر رستم بیگ نے ایک قہقہہ لگایا، اور کہا:

"کہنے والی بات ہم بتائے دیتے ہیں، !"

میر منشی صاحب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے، رستم بیگ نے وہ دونوں خط جیب سے نکالے، اور ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"انھیں جانِ عالم کی خدمتِ عالی میں پیش کر دیجیے، ساری مشکل چٹکی بجاتے ہیں حل ہو جائے گی، اور یہ بے روزگار، روزگار سے لگ جائے گا، ——— آپ کو بھی ثواب ملے گا، !"

میر منشی صاحب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"کس کے خط ہیں؟"

رستم بیگ نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا:

"بہت معمولی آدمی ہوں گے، ——— ایک تو نواب علی نقی خاں کا ہے اور دوسرا صاحب ریذیڈنٹ بہادر کا ہے!"

صاحب ریذیڈنٹ بہادر کا نام سُن کر میر منشی صاحب اُچھل پڑے، ——— اور پوچھا:

"اس لڑکے کی سفارش صاحب ریذیڈنٹ بہادر نے کی ہے؟"

رستم بیگ نے جواب دیا:

"ہاں، ——— وہ بڑے انسان دوست آدمی ہیں، اب وقت نہ ضائع کیجیے، یہ

"کسی قیمت پر نہیں، ——— بھلا علی نقی خاں، اور ریذیڈنٹ کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ جو شخص ان کے "راز" سے واقف ہو چکا، اور اس سے جان عالم کو باخبر کر چکا ہے، وہ زندہ رہ سکے، !"

"جی ہاں میرا بھی یہی خیال ہے !"

"لیکن تم زندہ رہو گے، اور اپنے بادشاہ کی خدمت کرو گے، تمھاری اس وفاداری کا ہمارے دل پر بھی بہت اثر ہے، اور حضرت جان عالم بھی بہت خوش ہوں گے، کل ٹھیک ۱۲ بجے رات کو یہاں آجاؤ، اور ایک دن کی فہرست بے شک ریذیڈنٹ کو پیش کر دو، تمھارے کام اور ذمّے داری کا فیصلہ کل کیا جائے گا، !"

اب تک نواب صمصام الدولہ کھڑے تھے ، اور کلّن کی یہ باتیں کھڑے کھڑے ہی سُن رہے تھے ، اب وہ بیٹھ گئے ، اور کلّن میاں کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی بٹھا لیا ، ——— اور کہا :

" یہ تو تم نے عجیب سی بات کی ہے ——— ذرا تفصیل تو بتاؤ ! "

کلّن نے وہ ساری گفتگو دُہرا دی ، جو اس کے اور ، علی نقی خاں کے مابین ہوئی تھی ، اس نے کہا :

" یہ قیمت " جو مجھ سے وصُول کی جا رہی ہے ، اتنی زیادہ ہے کہ میں اسے ادا نہیں کر سکتا ؛ "

" کیوں ؟ ——— ؟ "

" سات پشتوں سے اس خاندان کی چاکری کرتا چلا آ رہا ہوں ، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ اپنے بادشاہ کی مخبری کروں ؟ "

" علی نقی خاں سے تم نے کیا کہا ؟ "

" ان سے تو کچھ نہیں کہا ، ——— لیکن استعفا دینے کا فیصلہ اسی وقت کر لیا تھا ، ——— ! "

" پھر اسے کیوں نہیں دیا ؟ "

" آپ میرے محسن ہیں ، اور حضرت جان عالم کے مصاحب ہیں ، میں نے مناسب یہ سمجھا کہ سارا ماجرا آپ کو سناؤں تاکہ آپ انھیں باخبر کر دیں ! "

" جانتے ہو تمھارا حشر کیا ہوگا ؟ "

" جانتا ہُوں ، ——— "

" کیا جانتے ہو ؟ "

" یہ لوگ مجھے زندہ نہیں رہنے دیں گے ! "

"تو آگئے تم؟"

"غلام حاضر ہو گیا،!"

"آج کی فہرست حاضر ریذیڈنٹ کو دے دی!"

"جی ہاں ——"

"کچھ کہا اُس نے؟"

"جی نہیں، —— بعض ناموں پر سُرخ پنسل سے نشانات لگائے، اور علی نقی خاں کے پاس بھجوا دی،!"

"ہوں، —— خراب کام کی بات ہو نی چاہیئے!"

"جی ارشاد؟"

"کیا واقعی تم استعفا دینے کا فیصلہ کر چکے ہو؟"

"جی ہاں یہ میرا اٹل فیصلہ ہے!"

"اور نتائج ——"

"ان کی مجھے پروا نہیں!"

"تم تنہا اتنی بڑی قوت کا مقابلہ کر سکو گے؟"

"نہ کر سکوں گا تو فنا ہو جاؤں گا، یہ بھی میرے فخر کے لیے کافی ہے،!"

"آخر جانِ عالم سے اتنی عقیدت کیوں ہے تمھیں؟"

"وہ میرے خاندان کے مُحسن ہیں، میرے باپ کے مُحسن ہیں، میرے مُحسن ہیں، رعایا کے محبوب ہیں، کسی کا دل دکھانا نہیں جانتے، سب کے کام آتے ہیں، ان کی بارگاہ میں امیر اور غریب ایک ہیں، کوئی مقدمہ اگر رد بکاری کے لیے ہر طرح کی رکاوٹوں کے باوجود ان تک پہنچ جائے تو دودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی کر کے رہتے ہیں، وہ نیک ہیں، خدا ترس ہیں سمجھدار ہیں[1]

---

[1]: تاریخ اجودھیا،

(۳)

رات کے بارہ بج چکے تھے ۔!

صمصام الدولہ اپنے دیوان خانے کے دروازے پر کھڑے تھے ۔ اندر مدھم لو کے ساتھ شمع کافوری جل رہی تھی ۔!

سامنے بالکل اندھیرا تھا !

یکایک اس تاریکی سے ایک سایہ اُبھرا اور ٹھیک صمصام الدولہ کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا ۔

دیوان خانے کی کئی سیڑھیاں نیچے اتر کر صمصام الدولہ نے کہا :

" کون ؟ ـــــــــ کیا تم ہو کلن ؟ "

سایے نے جواب دیا :

" جی ہاں غلام حاضر ہے ! "

صمصام الدولہ نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا :

" تاریکی بہت ہے کہیں ٹھوکر نہ کھا جانا ۔ لو یہ میرا ہاتھ پکڑ لو ! "

کلن نے صمصام الدولہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں ساتھ ساتھ دیوان خانے کے اندر آئے ۔

صمصام الدولہ ـــ اپنی مسند پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے ، سامنے بھرا ہُوا حقہ رکھا تھا ۔ جس سے خمیرے کی مہک اٹھ رہی تھی ، انھوں نے ایک زوردار کش لگایا ، اور تبسم کناں فرمایا :

"ضرور، ایک نہیں دس، ——— ہاں کیا سوال ہے وہ؟"

"مجھے کلکتہ کیوں بھیج رہے ہیں آپ؟ یہیں لکھنؤ میں رہنے دیجئے۔ علی نقی خاں ——— اور ریذیڈنٹ دونوں کا کام تمام کردوں گا، اگر پکڑا گیا تو ہنستا کھیلتا پھانسی چڑھ جاؤں گا!"

"تمہارا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے، ——— لیکن ابھی علی نقی خاں یا ریذیڈنٹ پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ ———"

"کیوں جناب؟"

"پھر بھید کھل جائے گا، اور ساری آئی گئی جان عالم پر ہوگی ——— ہم تو انھیں الگ رکھ کر سارے کام کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ کسی کو پتہ ہی نہ چل سکے یہ قتل کون کر رہا ہے، اور کیوں کر رہا ہے؟ ذاتی انتقام کے طور پر یا سیاسی مقصد کے پیشِ نظر؟"

"ہاں یہ تو ٹھیک فرمایا آپ نے؟"

"تو کلکتہ جا رہے ہو تم؟"

"جی ابھی، ———"

"شاباش، ———"

"لیکن وہاں جا کر مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"جو لوگ تمھارے ساتھ جا رہے ہیں، یہ بڑے منجھے ہوئے اور تجربہ کار لوگ ہیں، تمھیں پتہ بھی نہیں چلے گا، مگر یہ ہر وقت تمھاری نگرانی کرتے رہیں گے، اور اگر کوئی نازک وقت آیا تو یا تمھیں بچا لائیں گے، یا قتل کر دیں گے، تاکہ راز افشا نہ ہو سکے، ——— سوچ لو تمھیں قتل بھی کیا جا سکتا ہے، اور وہ بھی اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں؟"

"مجھے منظور ہے جناب والا!"

"بھئی تم تو بڑے باہمّت ہو!"

"میری کیا حیثیت ہے، اصل میں تو باہمّت آپ ہیں!"

اگر ان سے مجھے عقیدت نہ ہوگی تو کس سے ہوگی ؟"

"تمھارے یہ خیالات بڑے قابلِ قدر ہیں، ——— اگر واقعی جان عالم سے تمھیں اتنی ہی عقیدت ہے تو ان کے راج پاٹ کے تحفظ، اور ان کے وقار کی بقا، اور خود ان کی سلامتی کےلیے کیا کر سکتے ہو ؟"

"سب کچھ ،!"

"اگر ضرورت پڑے تو جان بھی دے سکتے ہو ؟"

"بلا شبہ دے سکتا ہوں ،!"

"تو پھر ہماری جماعت میں شامل ہو جاؤ !"

"آپ کی جماعت میں ؟"

"ہاں میاں کلّن ہاں ،!"

پھر صمصام الدّولہ نے، اپنی پارٹی کا سارا حال کلّن کو بتادیا، اور یہ بھی بتادیا کہ رستم بیگ کو انھوں نے اپنے ایک معتمد آدمی کے ہاتھوں قتل کرایا ہے، پھر پُوچھا :

"بتاؤ کیا کہتے ہو ؟"

"(پیکرِ جوش و خروش بن کر) میں دل و جان سے اس پارٹی میں شریک ہونے کو تیار ہوں !"

"بس تو اب یہ کرو کہ کل سے اپنی ڈیوٹی پر نہ جاؤ، اور یہیں سے آج ہی رات کو ایک خاص قافلے کے ساتھ، جو اپنے ہی آدمیوں پر مشتمل ہے کلکتہ روانہ ہو جاؤ، جو تنخواہ تمھیں شاہی دفتر سے ملتی تھی، وہ برابر تمھارے گھر پہنچتی رہے گی، ایک خط بھی اپنے بھائی اور بیوی کے نام لکھ دو کہ تم ایک ضروری کام سے کانپور جا رہے ہو جہاں سے کئی مہینے کے بعد تمھاری واپسی ہوگی، ———"

"مجھے منظور ہے ،!"

"تمھاری صداقت سے ہمیں توقع بھی یہی تھی !"

"لیکن ایک سوال کرنا چاہتا ہوں ، ؟"

میر منشی چلا گیا، تو صمصام الدولہ نے کلّن سے کہا :

"تم نے پوچھا تھا کلکتہ میں تمھیں کیا کام کرنا پڑے گا ؟"

"جی ہاں پوچھا تو تھا، لیکن جو حکم ہوگا بجا لاؤں گا ۔ !"

"نہیں معلوم کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں !"

"جی تو ارشاد !"

"وہاں ولزلی اسٹریٹ میں مسٹر رابرٹ رہتے ہیں ، یہ گورنر جنرل کے پرائیویٹ سیکرٹری ہیں ، لیکن نہایت بدطینت اور بدخصال ، حالات شاید اتنے نازک نہ ہوتے ، اگر یہ بدبخت بیچ میں نہ ہوتا ۔ تمھارا کام یہ ہے کہ اسے جلد از جلد قتل کر دو ، !"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا ۔ بالکل مطمئن رہیے ، اس کا قتل کرنا میرا سب سے بڑا فریضہ ہے !"

◎

"یہ کیوں بھئی؟"

"میں پکڑا گیا تو جان کے سوا میرے پاس کیا ہے جو جائے گا؛ اور اگر خدانخواستہ آپ پکڑے گئے، تو جان، شہرت، دولت، ثروت، تعلق، سب ہی چیزیں جائیں گی، کیا ان سب کو آپ نے داؤں پر نہیں لگا دیا ہے؟"

"بے شک لگا دیا ہے؟"

"اچھا اب جلدی سے خط لکھ دو، اپنے بھائی اور بیوی کے نام، !"

کلّن نے جلدی جلدی خط گھسیٹے، صمصام الدولہ نے انھیں پڑھا اور کہا:

"بالکل ٹھیک!"

پھر تالی بجائی، داہنی طرف کے پردے سے ایک مسلح آدمی حاضر ہوا، اس سے کہا:

"میر منشی کو حاضر کرو!"

ذرا دیر میں میر منشی حاضر ہو گیا، صمصام الدولہ نے اس سے کہا:

"یاد رکھو، غائبانہ طور پر ہر مہینے کلّن کے گھر اس کی تنخواہ جو شاہی دفتر سے ملتی ہے، پہنچ جایا کرے، !"

اس نے جواب دیا:

"بہت خوب حضورِ والا، !"

پھر صمصام الدولہ نے کہا:

"ہاں ان خطوں کے ساتھ پانچ سو نقد بھی بھیج دو، !"

"بھیج دوں گا سرکار، !"

"لیکن کس کے ہاتھ؟"

"وہ مردان خاں، جو اس طرح کی غائبانہ رقمیں لوگوں کے ہاں پہنچانے میں کمال رکھتا ہے!"

"ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو!"

چھین لیتے ، اور، مرد ہونے کے باوجود امام باڑے کے ایک ایک گوشے میں اپنے حُسنِ انتظام کی دھاک بٹھا دیتے ، ——————— لیکن وہ بے چارے توسّن کے دباؤ سے مجبور ہوکر زیارت کو گئے ہوئے تھے ، اور وہ بھی عارضی طور پر نہیں ، بلکہ ہمیشہ کے لیے ۔ یعنی ہجرت کرکے ، ——

اس وقت تو بس زمرّد ، اور نازو کا طوطی بول رہا تھا ، بے چارے استاد ننھے خاں کو ، کوئی یاد بھی نہیں کر رہا تھا ، اگرچہ ان کا رخصت ہوتے وقت بیان یہ تھا کہ لکھنؤ ننھے خاں کو کبھی نہیں بھُلا سکے گا ، !

شہر کی معزز اور محترم خواتین کی آمد کا سلسلہ کوئی ۹ بجے رات سے شروع ہُوا ، اور گیارہ بجے تک جاری رہا ، نازو ، اور زمرّد پیشوائی کے لیے موجود تھیں ، آنے والی کو پہلے حضرت محل کے سامنے لے جاکر پیش کرتیں ، آداب و تسلیمات ، اور کورنش کے بعد ، پھر وہ اپنی جگہ پر جو پہلے مخصوص ، اور متعین تھی جاکر بیٹھ جاتی ، !

ٹھیک گیارہ بجے ، میر صاحب تشریف لائے ، !

یہ بہت اچھے ذاکر ، مرثیہ گو تھے ، طبعزاد مرثیے کہتے تھے ، اور خُوب کہتے تھے ، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آواز میں خدا نے کچھ ایسا سوز ، درد ، اور اثر دیا تھا کہ سننے والے دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ، !

مشہور یہ تھا ! ——————

جس کی آنکھ سے کبھی آنسو نہ نکلے ہوں ، وہ ایک مرتبہ میر صاحب کی مجلس میں شریک ہوجائے ، عمر بھر کی کسر نکل جائے گی ، !

میر صاحب کے گلے میں طلائی پھولوں کا ہار ، حضرت محل نے خود ڈالا ، اس کی مالیت پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی ۔

یہ ہار بے نیازی سے انھوں نے گلے سے اتارا ، اور اپنے ایک شاگرد کے ہاتھ

(۴)

آصف الدولہ کے امام باڑے کی بہار آج دیکھنے کے قابل تھی !

حضرت محل کی طرف سے نہایت شاندار مجلس کا اہتمام کیا گیا تھا، !

اتنی طویل و عریض اور وسیع عمارت پر ہر ہر جگہ، نہایت اعلیٰ درجے کی رنگ برنگی، موم بتیاں جھلملا رہی تھیں، امام باڑے کے اندر جھاڑ اور فانوس کے اندر کافوری شمعیں جل رہی تھیں، اور انھوں نے ساری عمارت کو بقعۂ نُور بنا دیا تھا، رات پر دن کا دھوکا ہوتا تھا۔

اس مجلس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ صرف خواتین کی مجلس تھی، شہر کے تمام بڑے بڑے تعلقہ داروں، رئیسوں، امیروں، منصب داروں اور سرکاری حکام و عمال کے خاندان کی خواتین موجود تھیں، بیبیاں بھی، لڑکیاں بھی، بہنیں بھی، !

اس مجلس کا سارا انتظام زمرّد، اور نازو کے ہاتھ میں تھا، ———

اور واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں نے جس حُسنِ انتظام کا ثبوت دیا تھا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے،

شہ نشین پر حضرت محل، خاندانِ شاہی کی بعض دُوسری خواتین کے ساتھ رونق افروز تھیں، !

نازو، اور زمرّد سارا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں، !

استاد نتھّے خاں آج موجود ہوتے، تو زبردستی زمرّد اور نازو سے سارا انتظام

مجلس جب برخاست ہوئی تو زمرّد اور نازو پھر دروازے پر جاکر کھڑی ہوگئیں، اور اپنی موجودگی اور نگرانی میں تبرک تقسیم کرایا۔

لکھنؤ کے بہترین حلوائی رحیم نے، اپنے ساتھیوں کی مدد سے ساٹھ من بالوشاہیاں تیار کی تھیں، یہ بالوشاہیاں چاندی کی ایک بڑی سی طشتری میں تمام شرکاء کو تقسیم کی گئیں، ——— فی کس سیر بھر بالوشاہی، اور ایک چاندی کی طشتری، گویا تقریباً ۲۵ — ۳۰ روپے کی مالیت ہر شریکِ مجلس کے حصّے میں آئی ——!

دے دیا، پھر منبر پہ جاکر رونق افروز ہو گئے۔!

حضرت محل کی طرف سے زمرّد، اور نازو نے، آکر درخواست کی کہ اب تکلیف کریں، ذکر اور مرثیہ شروع کردیں۔!

پہلے تو میر صاحب نے نثر میں ذکر شروع کیا!

یہ ذکر کچھ ایسا اثر انگیز تھا، کہ مسلمان خواتین تو کجا، ہندو تعلقہ داروں، اور رئیسوں کے خاندان کی عورتیں اور لڑکیاں بھی اپنے آنسو نہ ضبط کر سکیں۔ بار بار آنکھوں پر رومال رکھتی تھیں۔ مگر آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لیتے تھے۔

ذکر سے فارغ ہوکر میر صاحب نے وہ مرثیہ شروع کیا، جو خاص طور پر اسی موقع کے لیے کہا تھا۔

اس مرثیے نے تہلکہ مچا دیا، ہندو خواتین، اور لڑکیاں تک پھوٹ پھوٹ کر، اور بلک بلک کر رو رہی تھیں، شاید یہ اسی مرثیے کا اثر تھا کہ اس کے بعد، جب ماتم شروع ہوا، تو یہ ہندو خواتین اور لڑکیاں بھی پیش پیش نظر آرہی تھیں۔ اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہی تھیں!

ماتم کے بعد، ———

میر صاحب نے دستِ دعا بلند کیے، اور حضرت جانِ عالم کی سلامتی، درازیٔ عمر، ترقی اقبال، اور عروج و شوکت و حشمت کے لیے گڑگڑا، گڑگڑا کر دعا مانگی، اس دعا میں تمام حاضر الوقت خواتین، عام اس سے کہ ان کا دین مذہب کچھ کیوں نہ ہو، دل سے شریک تھیں۔ اس لیے کہ جان عالم کی ذات، اور صفات سے والہانہ تعلقِ خاطر، ملک کے تمام باشندوں کو بغیر امتیازِ نسل و قوم تھا۔ [1]

---

[1]: واجد علی شاہ اور ان کا عہد۔

" کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں !"

———— ! .

پھر ایک آہ سرد بھری ۔ اور خاموش ہو گئے ۔!
مٹّن خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔!

انھوں نے عرض کیا :

" غلام جانِ عالم کے افکار سے بہت اچھی طرح واقف ہے ، لیکن ،
صبر کرتے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جانِ عالم کی جان ، ہر چیز سے زیادہ گراں بہا ، اور قیمتی ہے ———— اور ہم دونوں بھی حالات کو رو براہ کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے ، وُہ کرتے رہتے ہیں ، لیکن ہم میں سے کوئی یہ گوارا نہیں کر سکتا ، کہ حضرت جانِ عالم آقائے ولی نعمت ملول و حزیں نظر آئیں ———— !

جانِ عالم نے پوچھا :

" پھر اس ملال اور حزن و الم کو دُور کرنے کی کیا تدبیر ہے ؟"

مٹّن خاں نے دست بستہ عرض کیا :

" بہت سی تدبیریں ہیں ، بادشاہوں کے لیے دلچسپیوں ، اور تفریحوں کی کچھ کمی ہے ؟"

جانِ عالم نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا :

" نہیں مٹّن خاں ، اب نہ کسی تفریح کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے ، نہ دلچسپی کی طرف ، وہی بات ہے ،

(۵)

ریذیڈنٹ کے طرزِ عمل، علی نقی خاں کی غدّاری، اور اپنی بے بسی اور بے کسی سے جانِ عالم واجد علی شاہ بُہت دلگیر اور آشفتہ خاطر نظر آرہے تھے۔ ایک روز نواب منّن خاں نے صمصام الدّولہ کے مشورے سے عرض کیا :

" جانِ عالم، جان کی امان پاؤں تو ایک گزارش پیش کروں ؟ "

حضرت جانِ عالم نے شفقت بھری نظروں سے اپنے اس وفادار مصاحب کو دیکھا، اور فرمایا :

" کہتے کیوں نہیں، ؟ ــــــــ بھلا تم پر کوئی پابندی ہے ؟ "

نواب منّن خاں نے عرض کیا :

" غلام، ــــــــ آقائے ولی نعمت کو افسردہ، اور مضمحل دیکھ کر بہت کڑھتا رہتا ہے ! "

جانِ عالم نے ایک آہِ سرد کے ساتھ فرمایا :

" تم نہیں جانتے منّن خاں، کون سی فکریں ہمیں دامن گیر ہیں، تمھاری ہمدردی اور محبّت کا شکریہ، لیکن ان فکروں کا مداوا کسی کے پاس نہیں ! "

پھر کچھ سوچتے ہوئے : ــــــــ

جانِ عالم نے ایک شعر پڑھا :

منّن خاں نے عرض کیا :

" تو پھر غلام ایک شاندار مشاعرے کا انتظام کرتا ہے !"

جانِ عالم کے ہونٹ بہت دنوں کے بعد آج تبسّم سے آشنا ہوئے تھے اسی طرح مسکراتے ہوئے فرمایا :

" ایسا آج تک تو ہُوا نہیں کہ تم نے یا صمصام الدّولہ نے کسی بات پر اصرار کیا ہو اور ہم نے اسے نہ مانا ہو ، !"

منّن خاں اور صمصام الدّولہ نے تقریباً بیک آواز کہا :

" بندہ نوازی ہے جانِ عالم کی ، !"

جانِ عالم نے سوال کیا :

" لیکن اس مشاعرے میں شریک کون کون ہوگا ؟"

" تمام مشہور شاعرانِ شہر !"

" ہاں ٹھیک ہے ، ——— اور کب کر رہے ہو ؟

" پرسوں !"

" کیا کہا پرسوں ؟ ——— ابھی مصرعہ طرح تک کا تعیّن ہُوا نہیں ، اور تم پرسوں مشاعرہ کر رہے ہو ؟ یہ کیسی انہونی بات ہے ، ؟"

صمصام الدّولہ نے عرض کیا :

" جانِ عالم ، یہ مشاعرہ اپنی نوعیت کا جداگانہ مشاعرہ ہوگا ، !"

" یعنی ——— ؟"

" بغیر مصرعہ طرح کے ، !"

" تمھارا مطلب یہ ہے کہ ہر شاعر اپنی جس غزل کے اشعار مناسب سمجھے ، سُنا دے ——— ؟"

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی !

———— ! "

منّن خاں نے یہ سُن کر سرو قد تعظیم بجا لاکر عرض کیا :

" لیکن غلام نے ، اور صمصام الدّولہ نے کئی دن کے غور و فکر کے بعد ، جانِ عالم کا ، جی بہلانے کی ایک تدبیر سوچ لی ہے ! "

یہ سُن کر ، ———— حیرت بھری نظروں سے جانِ عالم نے دونوں مصاحبوں کو دیکھا اور پوچھا :

" کون سی تدبیر ہے وہ ؟ "

" مشاعرہ ! "

" کیا کہا مشاعرہ ؟ "

" سرکار ، ————

واجد علی شاہ کی سب سے بڑی کمزوری شعر و شاعری تھی ، !

وہ خود بھی بہت اچھے اور بہت بڑے شاعر تھے . ———— سخن سنج بھی ، اور سخن فہم بھی ، ———— اور سب سے بڑی بات یہ ہے ، کہ شعر کی پرکھ میں جو ملکہ انھیں حاصل تھا ، اس میں اپنی مثال وہ آپ تھے ، لے اور پھر یہ بات بھی تھی کہ ان افکار کے باعث بُہت دنوں سے قصرِ شاہی میں کوئی مشاعرہ بھی نہیں ہُوا تھا ، منّن خاں نے اسی دُکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی ، بادشاہ اس سے انکار نہ کر سکے ، متبسّم ہو کر فرمایا :

" بھئی تجویز تو بُری نہیں ، ! "

لے : واجد علی شاہ اور ان کا عہد

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر زمرّد، اور نازو حضرت محل سے ——— مصروفِ تکلّم تھیں!

نازو نے بڑے ناز اور افتخار کے ساتھ پوچھا :

"کیسی رہی مجلس ؟"

حضرت محل نے سراپا نشاط و مسرّت بن کر جواب دیا :

"بہت عمدہ، ——— شاید اس سے قبل لکھنؤ میں اس سے اچھی اور اتنی بڑی مجلس نہیں ہوئی ہوگی!"

نازو نے کہا :

"بے شک!"

زمرّد نے طنز کا تیر چھینکا، نازو سے کہنے لگی :

"یہ سب حضور ہی کا کمال ہے شاید ؟"

وہ اٹھلاتی ہوئی بولی :

"اور کیا تمھارا ہے ؟"

زمرّد نے بگڑ کر کہا :

"واہ بھئی، یہ بھی اچھی رہی، ——— دُکھ سہیں بی فاختہ، کوّے

"سرکار، ——————

"(خوش ہوکر) یہ تجویز بھی معقول ہے، —————— منّن خاں تمھیں اجازت ہے، پرسوں مشاعرہ کر سکتے ہو!"

"بہت خوب جانِ عالم!"

"لیکن شہر کے تمام اساتذہ کو مدعو کرنا!"

"جی ضرور، —————— لیکن یہ کام صمصام الدّولہ کریں گے، انکے شاعرانِ شہر سے بہُت اچھے تعلقات ہیں!"

◎

گئی ہو گی!"

حضرت محل نے کہا :

" واقعی بڑا اثر ہے ان کی زبان میں!"

" خدا نے چاہا، تو ہمارے جان عالم تمام پریشانیوں سے نجات پا جائیں گے!"

" تمھارے مُنھ میں گھی شکر، خدا ایسا کرے؟"

" میری تو ایک دعا اور بھی ہے؟"

حضرت محل نے پوچھا :

" وہ کیا؟"

نازو نے کہا :

" یہ کہ ہمارے بادشاہ سلامت تمام فکروں سے نجات پا جائیں، انگریز ہمارا ملک چھوڑ دیں، اور کوئی ایسی صورت ہو کہ بالکل غارت ہو جائیں؟"

" نہیں نازو، ایسا نہ کہو!"

" واہ کیوں نہ کہوں؟"

" بس اتنا کافی ہے کہ ہم ظالموں سے اور خود غرضوں سے نجات پائیں، ان کے غارت ہونے سے ہمیں کیا مل جائے گا،؟"

" بھئی یہ تو ولیوں کی سی باتیں ہیں۔ ہم گناہ گار لوگ، بھلا اتنی دُور تک کہاں جا سکتے ہیں؟"

حضرت محل نے کہا :

" نہیں نازو، ولیوں کی سی نہیں، آدمیوں کی سی،!"

نازو بولی :

" تو خیر سے میں آدمی بھی نہیں رہی،؟"

انڈے کھائیں۔ یہاں زمین کے گز ہو گئے، دن کو دن سمجھا نہ رات کو رات، یہ صرف حکم چلاتی رہیں، اور کیا سب کچھ انھوں نے ہم تو نکھٹو کے نکھٹو رہے!"

حضرت محل کو ہنسی آ گئی۔!

اس نے زمرّد سے کہا:

"بھئی تم دونوں کے جھگڑے بھی خوب ہوتے ہیں ——— وہ تو چھیڑ رہی تھی تمھیں، ورنہ ابھی تمھارے آنے سے پہلے، اتنی تعریف کر رہی تھی تمھاری کہ مجھے رشک آنے لگا۔!"

اس انکشاف پر، زمرّد کچھ جھینپ سی گئی، ——— اس نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا:

"آپ نے رانی پالم پور کو دیکھا تھا، ؟"

"ہاں دیکھا تھا، ——— پھر ؟"

"اتنا روئی ہے بے چاری، ذکر پر، اور مرثیہ سُن کر، کہ مجھے تو اندیشہ ہو گیا تھا، کہیں بے ہوش نہ ہو جائے ———!"

"واقعی ——— ؟"

زمرّد نے کہا:

"جی ہاں، میرے پاس ہی تو بیٹھی تھی!"

"(ایک ٹھنڈی سانس لے کر) اللہ جس کے دل میں نیکی ڈال دے، جس کا دل نیکی کے لیے کھول دے!"

"ہاں بات تو یہی ہے!"

نازو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"میر صاحب کی دعا بھی اتنی اثر انگیز تھی کہ میرا خیال ہے سیدھی عرش تک

صمصام الدّولہ نے جواب دیا :

"اس کے بعد یہی کروں گا !"

"یعنی پہلے مجھے قتل کرو گے، پھر خودکشی کر لوگے ؟"

"ہاں ۔ ———"

"بھئی میں باز آئی قتل ہونے سے، مجھے تو معاف ہی رکھو، ایک نواب منّن خاں ہیں کہ اپنی گردن زمرّد کے لیے کاٹنے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، ایک تم ہو کہ مُرغی نہ ذبح کی میری گردن کاٹ ڈالی —— !"

نواب منّن خاں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا :

"لیکن بادشاہ سلامت کا معاملہ اگر درپیش ہو تو میں بھی زمرّد کے ساتھ وہی کروں گا، ——— آقا ہر چیز پر مقدم ہے، اپنی ذات پر بھی، اور اپنے محبوب پر بھی ۔ !"

◎

" بھئی تم تو لفظ پکڑتی ہو !________ ہمارا یہ مطلب کب تھا ؟ "

نازو نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ نواب مٹّن خاں ، اور نواب صمصام الدّولہ آتے دکھائی دیئے ، ان دونوں کی معقول انداز میں پذیرائی ہوئی ۔ زہرّو نے صمصام الدّولہ کی طرف دیکھتے ہوئے نازو سے پُوچھا :

" آپ انھیں جانتی ہیں ؟ "

" کیوں نہیں جانتی ! "

" ان کے چہرے پر شرافت برستی آپ کو نظر آتی ہے ؟ "

" ہاں ، بہت زیادہ ۔! "

" اور نیک بھی بُہت دکھائی دیتے ہیں ؟ "

" دکھائی کیا دیتے ہیں ؟________ ہیں ۔! "

" لیکن اگر مَیں یہ کہوں کہ یہ شخص قاتل ہے ؟ "

حضرت محل اچھل پڑی ، پوچھا :

" قاتل ،________

" جی ہاں ،________ یہی حضرت ہیں جنھوں نے رستم بیگ کو ، عالمِ آخرت کا سفر اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے ۔! "

حضرت محل ہنسنے لگی :

" لیکن یہ کام انھوں نے اپنے بادشاہ کے لیے کیا ہے ! "

نواب صمصام الدّولہ نے ایک جذبے کے عالم میں کہا :

" اگر ضرورت ہو تو نازو ، تمھاری گردن بھی بے دریغ کاٹ سکتا ہوں اپنے بادشاہ کے لیے ۔! "

وہ خفا ہوتی ہوئی بولی : " میری کیوں ؟ اپنی گردن پر چھُری پھیر لو ! "

میں اپنے یہ شعر سنائے :

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی
جمتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

اس شعر کی بہت داد دی گئی۔ جب غزل ختم ہوئی، تو پھر فرمائش کی گئی۔ خود بادشاہ نے بھی فرمایا :

"فتح الدولہ کچھ اور سناؤ!"

اب مجال دم زدن نہ تھی، چنانچہ انھوں نے پھر ایک غزل شروع کی، جس کا ایک شعر یہ ہے، :

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق، تجھے پکار آیا!

اس غزل پر بھی چھتیں اُڑ گئیں، خوب خوب داد حاصل کی۔

برقؔ کے بعد مہتاب الدولہ درخشاںؔ کے سامنے شمع رکھی گئی۔ سب سے پہلے انھوں نے یہ شعر پڑھا :

اے درخشاں جس کے قلموں سے ہے اک روشن جہاں
شاہ اخترؔ[1] سا نہیں دیکھا سخن ور دوسرا

اس شعر کی خوب داد ملی، پھر انھوں نے ایک غزل شروع کی :

کل وہ جو مجھ کو دیکھ کے بے گانہ بن گیا
میں بھی تو ہوشیار ہوں دیوانہ بن گیا!
غفلت پہ اپنی کیوں نہ ہوں خونِ دل ندیمؔ
جامِ شراب، عمر کا پیمانہ بن گیا!

---

[1] : واجد علی شاہ کا تخلص اخترؔ تھا۔

(۷)

قیصرباغ کی سجاوٹ آج قابلِ دید تھی، منّن خاں اور صمصام الدّولہ نے بڑے وسیع پیمانے پر مشاعرے کا اہتمام کیا تھا، جو شعراء دربار سے وابستہ تھے، وہ بھی خوب تیاریاں کرکے آئے تھے، اور جن شعراء کا دربار سے تعلّق نہیں تھا، ان میں سے بھی کئی مدعو کیے گئے تھے۔ خود واجد علی شاہ بھی اپنی بیاض لیے ہوئے موجود تھے۔ کلام الملوک ملک الکلام' ان کی باری سب سے آخر میں آنے والی تھی، لیکن بیاض کو الٹ پلٹ کر بار بار اس پر نظر ڈال رہے تھے!

واجد علی شاہ کا عہد شعر و شاعری کے اعتبار سے یکتا اور یگانہ تھا۔ اسیرؔ و امیرؔ جیسے یگانۂ فن اس عہد میں موجود تھے۔ آتشؔ اور ناسخؔ جیسے استادانِ فن کا یہی زمانہ تھا۔ انیسؔ اور دبیرؔ جیسے یکتائے روزگار اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک بہت بڑی مسند بچھی تھی، اس پر شعراء متمکّن تھے، ایک شہ نشین تھی، جس پر جانِ عالم رونق افروز تھے۔

سب سے پہلے درباری شاعروں کی باری آئی، اور ان شعراء میں سب سے پہلے فتح الدولہ برقؔ نے اپنا کلام سُنایا۔

یہ اہلِ علم کے خاندان سے تھے۔ ناسخؔ کے شاگرد تھے۔ بادشاہ ان سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔!

جب شمع اُن کے سامنے آئی، ! ——— انھوں نے کڑک دار آواز

اب شمع ، مرزا امداد علی یاؔور کے سامنے آئی ، یہ فتح الدّولہ برؔق کے شاگرد تھے اور خُوب کہتے تھے ۔ کلام میں شوخی تھی ، اور تصنّع کا کہیں نام ونشاں نہیں ۔ انھوں نے صرف ایک غزل سنائی ، لیکن یہ ایک غزل کئی غزلوں پر بھاری رہی ۔

چند شعر یہ ہیں :

رہ گئی بات ، کٹ گئی شبِ ہجر
تم نہ آئے ، تو کیا سحر نہ ہُوئی !
آنکھوں آنکھوں میں لے گئے یُوں وہ دل
کانوں کان ایک کو خبر نہ ہُوئی !

اب مظفر علی اسیؔر کے سامنے شمع رکھی گئی ، انھوں نے بھی ایک غزل پڑھی ، ایک شعر مشاعرہ اڑا لے گیا :

رائیگاں ہوگا نہ ہرگز خاکساروں کا غبار
کچھ زمیں لے جائے گی ، کچھ آسماں لے جائے گا

اسیؔر کے بعد شمع مالک الدّولہ صولؔت کے سامنے رکھی گئی ، یہ فتح الدّولہ برؔق کے بھتیجے تھے ۔ فنِ شاعری کے ماہر تھے ، ناسؔخ کو اپنا استاد بنالیا تھا ۔ ہروقت فکرِ سخن میں مستغرق رہتے تھے ۔ انھوں نے دُو غزلیں سُنائیں ۔

پہلی غزل کے چند شعر یہ ہیں :

اس کے دانتوں کے مقابل جو گہر جاتا ہے
دل سے گر جاتا ہے ، آنکھوں سے اُتر جاتا ہے
ہر حباب لب جو کہتا ہے باچشمِ پُرآب !!!
یہ زمانہ فقط آنکھوں میں گُزر جاتا ہے

اچھی داد ملی ۔ لیکن حاضرین کا دل نہ بھرا ۔ دوسری غزل کی فرمائش ہوئی ، دُوسری غزل

پُوری غزل بہت سے اشعار پر مشتمل تھی۔ ایک ایک شعر بار بار پڑھوایا گیا، اور دل کھول کر داد دی گئی۔

اب شمع مرزا میتا عیش کے سامنے لائی گئی۔ یہ ناسخ کے شاگرد تھے۔ منقبت زیادہ کہتے تھے، غزل کم، لیکن جب غزل کہتے تھے، تو استادوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ انھوں نے ایک خاصی طویل غزل سُنائی۔

یہ شعر بہت مقبول ہُوا :

وہ گلے مل کے دکھانے لگے زلفِ مشکیں
آگئی آئینہ میں تا بہ کمر وصل کی رات!

اس کے بعد شمع آغا حجو شرف کے سامنے لائی گئی۔ عجیب شخص تھے۔ نہ لکھے نہ پڑھے مگر شاعر اتنے اچھے کہ اساتذہ میں شمار ہوتا تھا، آتش کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، ان کے قابلِ فخر شاگردوں میں تھے۔

پہلی غزل جو سنائی، اس کا یہ شعر تو سب کی زبان پر چڑھ گیا :

جھٹ پٹا وقت ہے بہتا ہُوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہُوئی، دل نہ ہمارا ٹھہرا

اس کے بعد دوسری غزل کی بہت اصرار کے ساتھ فرمائش ہُوئی۔ یہ بھی بڑی معرکہ آرا رہی۔ چند شعر یہ ہیں :

منزلِ عشق کا حال آپ ہیں آؤں تو کہوں
دم ذرا لینے دو، مَیں دل کو سنبھالُوں تو کہوں
کون ہے جس سے فسانہ کہوں اے دل تیرا
سُننے والا کوئی پہلو میں بٹھا لُوں تو کہوں!

پُوری غزل بہت مقبول ہُوئی۔

مشاعرہ حد سے زیادہ کامیاب ہُوا۔ حضرت جان عالم بہت محظوظ ہوئے، ایک عرصے سے آئینۂ خاطر پر تکدّر کا جو غبار چھایا ہُوا تھا۔ وہ بڑی حد تک رفع ہوگیا۔ جانِ عالم کی طرف سے ان شعراء کو تحائف اور انعامات اور خلعتِ فاخرہ عطا ہُوئے، لیکایک انھوں نے فرمایا :

" کیا بات ہے، آج کے مشاعرے میں اُستاد [1] تشریف نہیں لائے۔ کیا انھیں دعوت نہیں دی گئی تھی، !؟"

وزیرِ حضوری نے عرض کیا :

" دعوت نامہ تو یہ غلام خود دے کر آیا تھا ؟"

" پھر کیا فرمایا تھا انھوں نے ؟"

" انھوں نے فرمایا تھا، 'دیکھا جائے گا'، !"

" ان الفاظ سے تو انکار جھلکتا ہے۔ کیا تم نے اصرار نہیں کیا ؟ کیا ہماری طرف سے انھیں شریک ہونے کی ترغیب نہیں دی ؟"

" دی تھی سرکارِ والا تبار !"

" پھر، ————"

" پھر وہ اپنے ایک ہندو شاگرد، دیاشنکر نسیمؔ [2] کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان سے فرمایا،" ہاں میاں تم اپنا کلام سناؤ۔ یہ لوگ اسی طرح دماغ چاٹتے رہیں گے، !" پھر انھوں نے

---

[1] : واجد علی شاہ، خواجہ حیدر علی آتشؔ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ ان کی بڑی قدر افزائی کرتے، اور ان کا باقاعدہ ورماہیہ دربار سے مقرر فرما دیا تھا۔

[2] : پنڈت دیاشنکر نسیمؔ کی مثنوی، اردو زبان میں کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے بعض اہلِ نظر تو اسے مثنوی میرحسن پر بھی زبان و بیان، روزمرّہ اور محاورات کے اعتبار سے ترجیح دیتے ہیں،

(باقی اگلے صفحہ پر) ⟵

کچھ ایسے تیور سے سُنائی کہ سارا مشاعرہ جیت لیا۔ کوئی نہ تھا جو سر نہ دھن رہا ہو۔

چند شعر یہ ہیں :

کہیں وہ دیکھیں نہ اس طرف کو، بچا کے ان کی نظر کو چلیے
پڑے نہ آکر خدنگ مژگاں، چھپا کے اُن سے جگر کو چلیے
گزر گئی اب شبِ جوانی، ہے آمدِ مرگِ ناگہانی!
یہ صبحِ پیری کی ہے دُھائی، کمر کو کسیئے سفر کو چلیے

اب شمع شیخ صادق علی مائل کے سامنے رکھی گئی، انھوں نے صرف ایک غزل پر اکتفا کیا لیکن غزل نے بازی جیت لی :

طریق گریہ تجھے چشم تر نہیں آیا
کہ ساتھ اشک کے خُونِ جگر نہیں آیا
خدا دکھائے نہ تاریکیٔ شب فرقت
کہ آسمان و زمیں کچھ نظر نہیں آیا [1]

---

[1] : دربار واجد علی شاہ کے شعرائے کرام کے یہ اشعار نواب سیّد علی حیدر طباطبائی حیدر نواز جنگ کے سلسلۂ مقالات سے ماخوذ ہیں۔ نواب صاحب نے بہت طویل یعنی تقریباً سو برس کی عمر پائی۔ یہ واجد علی شاہ کے خدمت گزاروں میں تھے۔ ان کے شہزادوں کے اتالیق بھی رہے۔ ان کی جلا وطنی کے بعد لکھنؤ چھوڑا، اور مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے۔ جب واجد علی شاہ کا انتقال ہو گیا تو دل شکستہ اور دل گرفتہ حالت میں واپس آ گئے۔ لیکن اپنے دوسرے معاصرین کی طرح انھیں در در کی ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں۔ ہز اگزالٹڈ نظام دکن کی نگاہِ عنایت اُن پر پڑی۔ یہ حیدر آباد (دکن) گئے اور مناصب جلیلہ پر سرفراز رہے، نہ صرف نظام بلکہ حیدر آباد کے اصحاب علم و فضل بھی ان کا ادب و احترام کرتے تھے کہ علم و فضل میں بھی یہ یگانہ تھے۔

"واقعی غلام سے بہت بڑی غلطی ہوئی !"

"لیکن رُو ٹھنے کا کوئی سبب بھی تو ہوگا ؟"

"اب میں کیا عرض کروں سرکار ؟"

"تمھیں بتانا ہوگا ؟" [1]

وزیرِ دربار نے جھجکتے ہوئے کہا :

"دربارِ شاہی سے ان کا سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر تھا ۔!"

"تھا کیوں ؟ ہے کہو ، خیر پھر ؟"

"حضور اپنا کلام بغرضِ اصلاح استاد کے پاس بھجوادیا کرتے تھے ۔ ان کی آنکھیں اب جاتی رہی ہیں ، خود پڑھ نہیں سکتے ۔!"

---

[1] : آتش کا نام خواجہ حیدر علی تھا ۔ خاندانِ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے ۔ صوفی منش تھے ، ذہانت و جودت کی نعمت قدرت نے فیاضی کے ساتھ عطا فرمائی تھی ، استاد ——— مصحفی ——— کے فیضِ صحبت و تربیت نے اس جوہر کو اور نکھارا ۔ دیکھتے ہی دیکھتے آتش شاعرِ یگانہ بن گئے ۔ حریف سنبھل کر بیٹھ گئے کہ عرصۂ سخن میں جو نیا شہسوار آیا ہے یہ کسی سے ہار ماننے والا نہیں ، طبیعت وارفتہ ، مزاج بے پروا ، طہوّر و خود دار ، گوشۂ عزلت میں بیٹھے فکرِ سخن کیا کرتے تھے ، ناسخ ہمعصر تھے ، دونوں میں خوب خوب معرکے رہے ۔ لیکن ان کی سپاہیانہ وضع اور قلندرانہ سج دھج نے معاصرین پر انھیں ہمیشہ بالا رکھا ۔ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں : ؎

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و مال

ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا ؟

زمانہ کئی مرتبہ خلاف ہوا ، لیکن واقعی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا ۔! ———

رُخ ہی نہیں کیا، غلام چلا آیا۔"

"تم نے بہت بڑی غلطی کی!"

"نادم ہوں سرکارِ والا۔!"

"ندامت سے کیا ہوتا ہے تم نے ہمیں ذلیل اور رُسوا کیا ——— کیا تم نہیں جانتے ہماری نظر میں ان کی کیا وقعت ہے؟"

"جانتا ہُوں سرکار!"

"پھر بھی یہ جرأت؟"

"بات یہ ہے کہ وہ دربار سے کچھ رُوٹھے ہُوئے ہیں۔!"

"کیا کہا، رُوٹھے ہوئے ہیں؟"

"جی ———"

"کیسے معلوم ہُوا؟"

"دربار سے ان کا جو درماہہ مقرر ہے، وہ بھی نہیں لیتے۔ آدمی لے کر جاتا ہے، واپس کر دیتے ہیں،!"

"(مضطرب ہوکر) کتنے بڑے حرام خور ہو تم لوگ، ——— استاد رُوٹھے ہُوئے ہیں، اور ہمیں خبر بھی نہیں کہ انھیں جا کر مناتے،!"

"غلام کا خیال تھا حضور کو خبر ہو گئی ہو گی،!"

"کس طرح؟ کیا فرشتے آ کر خبر دیتے؟"

بقیۂ حاشیہ، صفحہ ۴۴۳:
اور کوئی شبہ نہیں، کہ یہ مثنوی، میرحسؔن کی مثنوی پر ترجیح رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو، لیکن اپنے اسلوب، بیان، اور زبان کے اعتبار سے اردو زبان کا لافانی شاہکار ہے۔ جب تک اردو زبان موجود ہے یہ مثنوی بھی زندہ رہے گی!

ذرا دیر میں علی نقی خاں حاضر ہوئے، اگرچہ ریذیڈنٹ کی شہ پر، اب وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگے تھے، پھر بھی بادشاہ، بادشاہ تھا، کیونکہ ممکن تھا کہ دربارِ شاہی سے طلبی ہوتی اور وہ سر کے بل حاضرِ دربار نہ ہوتے!"

واجد علی شاہ نے، کہ دل میں علی نقی خاں کے خلاف تکدّر رکھتا، ان سے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا، وہ آئے اور سر جھکا کر کھڑے رہے، !

بادشاہ نے کہا :

"استاد آتش ہم سے کچھ خفا ہو گئے ہیں، ——————— نہ آج کے مشاعرے میں تشریف لائے، ———————"

"غلام کو بھی آج کے مشاعرے میں شرکت کا حکم نہیں ملا، !"

"(بے رُخی سے) ہر موقع پر تمھاری موجُودگی ضروری نہیں، ——————— ان باتوں کو چھوڑو، یہاں سے سیدھے اُستاد کے پاس اب تک کی تنخواہ لے کر جاؤ، ہماری طرف سے معذرت کرو، اور انھیں رضامند کر کے واپس آؤ، !"

"ایسا ہی ہو گا خداوند!"

"بس تو فوراً جاؤ، اور ابھی آکر ہمیں اطلاع دو!"

علی نقی خاں سیدھے استاد آتش کے "غریب خانے" پر حاضر ہوئے، اپنی طرف سے، اور بادشاہ کی طرف سے معذرت کر کے تنخواہ پیش کی، اور کہا :

"خداوند کو آپ کی خفگی کا بہت ملال ہے، !"

آتش نے روپوں کو ہاتھ نہیں لگایا، اور کہا :

"یہ اپنے روپے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ ہمیں جو فاقے میں آتی ہے خوانِ نعمت میں نہیں آتی، رہی خفگی تو تمھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ فقیر کسی سے نہ خورسند ہوتا ہے نہ ناخوش اسے تو بس ایک ہی فکر رہتی ہے کہ راضی بہ رضائے الٰہی رہے، جاؤ میاں جاؤ، نہ اپنا

"ہاں، لیکن ان کا علم اور فن تو نہیں جاتا رہا کمبخت، ! خیر پُورا قصّہ سناؤ !"

"اب ان کا معمول یہ ہو گیا تھا کہ سرکار کی غزل اپنے کسی شاگرد سے سُنتے اور اصلاح لکھوا دیا کرتے !"

"ایک ہی بات ہے، !"

"جی، ——— ایک مرتبہ کسی اصلاح پر سرکار کو کچھ شک سا ہُوا، !"

"ہمیں شک ہُوا استاد کی اصلاح پر ؟"

"جی، ——— مصاحبوں میں سے استاد گلشن نے عرض کیا: خداوند، آپ کا شعر بے مثال ہے، اصلاح بالکل لغو ہے، آتش اب نابینا ہو چکے ہیں شاگرد جو شعر چاہتا ہے کاٹ دیتا ہے، اور اصلاح بنا دیتا ہے !"

"ہاں ہمیں کچھ کچھ یاد آیا، گلشن نے کچھ اس طرح کی بات کی تھی !"

"یہ بات استاد تک بھی پہنچ گئی، دوبارہ جب سرکار نے غزل بھیجی، تو استاد نے کوئی اصلاح نہیں دی، کسی پر ماشاء اللہ لکھ دیا، کسی پر سُبحان اللہ، اور واپس کر دی!

——— اس سہ ماہی میں جتنی غزلیں گئیں سب کے ساتھ یہی ہُوا، ——— چنانچہ سہ ماہی پوری ہونے کے بعد، جب تنخواہ گئی، کہ وہ سہ ماہی ملا کرتی ہے، تو لینے سے انکار کر دیا، !"

"انکار کر دیا ؟"

"جی، ——— فرمایا، مَیں حرام کی تنخواہ نہیں لیتا، جب غزل بناتا تھا، تنخواہ لیتا تھا، اب اصلاح نہیں ہوتی تنخواہ کس بات کی لُوں ؟"

"ہائے کمبخت یہ واقعہ تُو نے اب بتایا ہے ؟"

"جی خداوند، !"

"چُپ رہ، ——— وزیر اعظم علی نقی خاں کو حاضر کرو، !"

جانِ عالم نے فرمایا :
"اس وقت استاد کے کچھ اشعار سننے کا جی چاہ رہا ہے ۔ ——— کیا تمھیں
کوئی شعر یاد ہے ؟"
"یاد ہے خداوند ۔"
"سناؤ ۔ ———"
"استاد فرماتے ہیں :

امانت کی طرح رکھا تھا میں نے روزِ محشر تک
نہ اک مُو کم ہُوا اپنا ، نہ اک تارِ کفن بگڑا ، !
لگے مُنھ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجیے دہن بگڑا

جانِ عالم : "واہ ، بہت خوب ، اسے کہتے ہیں استادانہ رنگ ! ——— کیوں منّن خاں
تمھیں بھی کوئی شعر استاد کا یاد ہے ——— ؟"
منّن خاں : "صرف دو شعر خداوند !"
جانِ عالم : بہت ہیں ، سناؤ :
منّن خاں : فرمایا ہے استاد نے :

پیام بر نہ میسّر ہُوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

جانِ عالم : "واہ ، سُبحان اللہ ، اور ہاں وہ دوسرا شعر ؟"
منّن خاں : خداوند وہ یہ ہے :

باغِ جہاں میں گل کی قناعت سے ہے جائے اشک
عُمرِ دو روزہ ایک قبا میں تمام کی ، !

وقت ضائع کرو، نہ ہمارا، یہاں فکرِ سخن کر رہے تھے۔ تم آکر حارج ہو گئے،
آتشؔ کے یہ الفاظ سُن کر علی نقی خاں کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ جی چاہا، ایک ایک کی دس دس سُنائے، لیکن بادشاہ کے استاد کے ساتھ گستاخی ممکن بھی نہ تھی، ——————
سیدھے قصرِ شاہی میں واپس آئے،!
جانِ عالم نے دیکھتے ہی سوال کیا :
"کیا کر آئے ؟"
علی نقی خاں نے ناخوشگوار لہجے میں جواب دیا :
"خداوند وہ نہیں مانتے !"
"خفا ہیں اب تک ؟"
"جی، ——————
"اچھا اب تم جا سکتے ہو،!"
علی نقی خاں کے جانے کے بعد، جانِ عالم نے وزیرِ حضوری کو حکم دیا کہ سواری تیار کی جائے،!
"ہم بہ نفسِ نفیس آستانۂ استاد تک جائیں گے اور انھیں منا کر آئیں گے!"
یہ کہہ کر خلعتِ فاخرہ، تحائفِ گراں بہا، اور تین گنی تنخواہ لے کر، استاد کے پاس خود تشریف لے گئے، معذرت کی، بہت دیر تک بیٹھے اور انھیں منا کر واپس آ گئے۔[1]
واپس تشریف لائے تو بہت خوش تھے، حاضرینِ دربار سے فرمانے لگے :
"آخر استاد من گئے!"
وزیرِ حضوری نے جواب دیا :
"یہ خداوند ہی کا کام تھا،!"

---

[1] : تذکرۂ آبِ بقا، از خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی۔

جانِ عالم : ہاں، سُنو :

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اِک قطرۂ خوں نہ نکلا !

یہ شعر سُن کر واقعی سب لوگ بے قابو ہو گئے۔

جانِ عالم نے مزید فرمایا :

" اور سُنو، دیکھو شاعری یہ ہے۔ فرماتے ہیں" :

اس بلائے جاں سے آتشؔ دیکھیے کیونکر نبھے ، !
دل سوا شیشہ سے نازک ، دل سے نازک خوئے دوست

منّن خاں :

" سُبحان اللہ !"

صمصام الدّولہ :

" یہ ہے استادانہ رنگ ، !"

جانِ عالم :

" ایک شعر اور یاد آگیا ، !"

منّن خاں :

" ارشاد خداوند!"

صمصام الدّولہ :

" خداوند اب تابِ انتظار نہیں !"

پر کترتا ہے مرے صیّاد تو گر اس طرح !
حسرتِ پرواز بھی اُڑ جائے بال و پر کے ساتھ

——— !"

جانِ عالم : "یہ ہے استادی، ——— صمصام الدولہ تم ؟"

صمصام الدولہ :

"دو تین شعر خانہ زاد کو بھی یاد ہیں خداوند!"

جانِ عالم : "تمھارے ذوقِ شعر کے ہم قائل ہیں ضرور سناؤ!"

صمصام الدولہ : "استاد نے فرمایا ہے، اور واقعی خوب فرمایا ہے" :

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شانہ، آئینہ کو یاد کرتے ہیں

جانِ عالم : "لطف آگیا۔"

صمصام الدولہ : "دوسرا شعر عرض ہے" :

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

جانِ عالم : (پھڑک کر) بھئی واہ، کیا زبان ہے، کیا روزمرّہ ہے، کیا محاورہ ہے اسے کہتے ہیں استادی!"

صمصام الدولہ : "بے شک خداوند، روزمرّہ کا ایک شعر اور یاد آگیا۔"

جانِ عالم : "ضرور ضرور ——— ہاں۔"

صمصام الدولہ : "فرمایا ہے" :

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے
مَیں جا ہی ڈھونڈتا، تری محفل میں رہ گیا!

جانِ عالم : "واہ۔ ——— ایک آدھ شعر ہمیں بھی یاد ہے۔"

منّن خاں : "ضرور ارشاد ہو خداوند!"

صمصام الدولہ : "خداوند کو جو شعر یاد ہوگا واقعی وہ لاکھوں میں ایک ہوگا۔"

کشمکشِ مرگ و زیست

"سنا بھئی تم نے، یہ ہے وہ شاعری، جس پر ہم جان دیتے ہیں۔ لکھنؤ اساتذۂ سخن کا گہوارہ ہے، لیکن جو بات استاد میں ہے وہ کسی اور میں کہاں!"

ہم جس پہ مرتے ہیں وہ کوئی بات ہی ہے اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی، تم مگر کہاں،؟

پھر اپنے اشعارِ آبدار سُنا کر مجلس ختم کر دی!

۱

رستم بیگ کا حادثۂ قتل ایسا جاں گداز تھا، جس سے ریذیڈنٹ، اور علی نقی خاں، دونوں بہت زیادہ متاثر تھے، !

وہ نہ صرف، مخبر اور جاسوس تھا، بلکہ بعض مرتبہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ایسے کام کر گزرتا تھا، جو سرکارِ برطانیہ کے مفاد کے اعتبار سے بڑی قیمت رکھتے تھے، اور علی نقی خاں کو ان سے غیر معمولی فائدہ پہنچا کرتا تھا۔

علی نقی خاں نے سر توڑ کوشش کر لی، ——— لیکن رستم بیگ کا نعم البدل نہ ملا، پر نہ ملا، !

جو کام رستم بیگ سے لیا جاتا تھا وہ ایسا تو نہ تھا کہ ہر کسی سے لیا جا سکے۔ اعتماد قائم ہونے ہیں بھی دیر لگتی ہے، اگر ایسا آدمی مل جائے تو بھی، اسے معتمد علیہ بننے کے لیے ایک وقفہ چاہیئے، !

البتہ ایک آس ضرور تھی !

کلّن سے، !

علی نقی خاں کو یقین تھا کہ رفتہ رفتہ وہ کلّن کو، رستم بیگ کا قائم مقام اور جانشین بنا لیں گے، مالی حالات حد درجہ سقیم تھے، اس کے مرحوم باپ سے یارانہ بھی تھا، اور جب اس کی کہیں پرسش نہ ہوئی، اور نواب صمصام الدّولہ تک کی سفارش میر منشی نے رد کر کے ملازمت دینے سے انکار کر دیا، تو انھوں نے، اور ریذیڈنٹ نے، صرف ایک مختصر ساخط

علی نقی خاں ملازم کو حکم دینے ہی والے تھے کہ جا کر کلن کو ابھی بلا لائے کہ ریذیڈنٹ کا چوب دار آتا ہُوا نظر آیا،

اسے دیکھ کر وہ چونکتے ہو گئے، دریافت کیا :

"کیوں بھئی خیریت؟ کیسے آ گئے؟ ہمارے صاحب بہادر کا مزاج تو بخیر و عافیت ہے؟"

یہ کہہ کر حسبِ معمول دس روپے جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھائے،!

چوب دار نے وہ دس روپے جیب میں رکھ کر، اور سر جھکا کر شکریہ ادا کرتے ہُوئے جواب دیا :

"اللہ کا شکر ہے، سب طرح خیریت ہے، صاحب بہادر بھی اچھی طرح ہیں، لیکن انھوں نے ابھی اور اسی وقت آپ کو یاد فرمایا ہے۔"

بے وقت کی اس طلبی نے علی نقی خاں کو کچھ پریشان سا کر دیا، فوراً چلنے پر آمادہ ہو گئے، کہا :

"چلو بھئی ابھی چلتا ہُوں، بھلا صاحب بہادر طلب فرمائیں، اور میں سر کے بل نہ جاؤں، لیکن، کوئی خاص بات ہے؟"

چوب دار نے بصد ادب جواب دیا :

"یہ تو میں نہیں جانتا سرکار، ———— ہاں، اتنا جانتا ہُوں، کہ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں!"

علی نقی خاں نے پیکرِ اضطراب بن کر پُوچھا :

"پریشان سے نظر آ رہے ہیں ہمارے صاحب بہادر؟"

وہ بولا : "جی سرکار!"

"لیکن کیوں؟"

"یہ تو غلام کو نہیں معلوم؟"

لکھ کر اسے اچھی خاصی ملازمت دلا دی، !

یہ ہمیشہ ممنون احسان رہے گا، !

یہ سرتابی کی کبھی جرأت نہیں کر سکے گا۔

یہ ہر حکم بجا لائے گا۔ !

یہ بہترین آلۂ کار ثابت ہو گا،

اور ہو سکتا ہے کہ رستم بیگ سے زیادہ کار آمد اور مفید آدمی ثابت ہو، لیکن اسے تربیت دینے میں، ہمراز بنانے میں، راہ پر لانے میں کچھ دیر ضرور لگے گی۔

بات یہ ہے کہ اس کا خاندان پشت ہا پشت سے بادشاہ کی وفاداری کا دم بھرتا چلا آ رہا ہے۔

اس خاندان کے ہر فرد کو، خصوصاً اس کے مرحوم باپ کو اس بات پر فخر اور ناز تھا، کہ اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے، وہ صرف شاہی بذل و عطا کا مرہون منت ہے۔

ایسے باپ کا بیٹا بھی، ضرور وفاداریِ شاہ کا داعیہ رکھتا ہو گا، اور اس پر ناز بھی کرتا ہو گا، ایسے شخص کو راہ پر لانا کوئی آسان کام نہیں ہے، !

اس آہوئے وحشی کو رام کرنے میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے،

لیکن ایک بات بہرحال قطعی اور یقینی ہے، !

یہ اگر راہ پر آگیا، تو رستم بیگ سے زیادہ اہم اور عظیم کارنامے انجام دے گا، !

ایسے لوگ جب راہ پر آتے ہیں تو اسی طرح آتے ہیں۔

پھر علی نقی نے سوچا، پہلا لقمہ آج ہی دے دینا چاہیئے۔

ابھی اسے طلب کرتا ہوں، اور دو ہزار روپے نقد دیتا ہوں، کہوں گا، بیٹے، ایک ہزار میری طرف سے قبول کرو، اور ایک ہزار صاحب ریذیڈنٹ بہادر کی طرف سے !

ہم دونوں تمھاری کارگزاری اور مستعدی سے بہت خوش ہیں، !

"غلام تو سرکار کا پُرانا نمک خوار ہے اسے کچھ معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتا؟"

"ہاں، ——— ہم جانتے ہیں!"

"سرکار جلدی چلیے!"

"جلدی کیوں؟"

"صاحب بہادر بے تابی سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں!"

"چل رہا ہوں بھئی، ——— کوئی ہے؟"

فوراً ایک خدمت گار حاضر ہُوا۔ نواب صاحب نے اُسے حکم دیا:

"فوراً جوڑی کسواؤ،! ہمیں باہر جانا ہے ابھی اسی وقت!"

وہ سر جھکا کر چلا گیا، اور ذرا دیر میں آ کر اطلاع دی،

"جوڑی تیار ہے سرکار!"

نواب صاحب نے چوب دار کو اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے وہ ان کے پاس آیا ہی نہیں تھا، لباس فاخرہ سے آراستہ ہُوئے اور جوڑی میں بیٹھ کر کوچوان سے کہا:

"ریذیڈنسی، ———"

اس نے اشارے سے گھوڑوں کو چابک لگائی، اور وہ اشارہ پاتے ہی ہوا ہو گئے!

"میم صاحب سے تو کچھ کھٹ پٹ نہیں ہوگئی ؟"

"بالکل نہیں ——— وہ تو خود ان کی پریشانی سے پریشان نظر آرہی ہیں، انھوں نے بھی تاکید کی تھی کہ آپ کو لے کر جلد آؤں !"

"ہاں بھئی چلتا ہوں، ——— لیکن تم نے ہمیں خود پریشان کر دیا !"

"جانے کیا راز ہے اس پریشانی میں ؟"

"راز ——— ؟"

"جی ہاں، ——— راز ہی ہوگا، جب ہی تو منھ سے نہ کچھ بولتے ہیں، نہ سر سے کھیلتے ہیں، لیکن چہرہ ہے کہ لٹکا ہُوا ہے !"

"چہرہ لٹکا ہُوا ہے ؟"

"جی سرکار !"

"خدا خیر کرے !"

"خدا خیر ہی کرے گا !"

"لیکن میاں تم نے تو کچھ پتہ چلانے کی کوشش کی ہوتی ؟"

"وہ میم صاحب سے تو کچھ کہہ نہیں رہے ہیں، مجھے کیا بتاتے ؟"

"کیا میم صاحب نے پوچھا تھا ؟"

"جی ہاں، بار بار !"

"پھر کیا جواب دیا ؟"

"فرمایا، تم ان باتوں کو نہیں جانتیں، نواب صاحب کو آلینے دو، تب ہی بات ہوگی !"

"کیا وہ بات مجھ سے کچھ تعلق رکھتی ہے ؟"

"رکھتی ہی ہوگی سرکار !"

"عجیب کشمکش و پیچ میں مُبتلا کر دیا ہے تُم نے ؟"

"وہ تو بندہ سُن لے گا، لیکن خدا کے فضل و کرم سے سب خیریت تو ہے؟"

"(زہر خند کے ساتھ) الم انگیز خبر بھی، اور خیریت بھی، کیا یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں؟"

علی نقی خاں نے جواب نہیں دیا، سوالیہ نظروں سے ریذیڈنٹ بہادر کی طرف دیکھنے لگے، اس نے کچھ تامّل کے بعد کہا:

"ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل [1] کے پرائیویٹ سیکرٹری، مسٹر رابرٹ کو قتل کر دیا گیا۔"

یہ سُن کر علی نقی خاں پر بجلی سی گر پڑی، اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا، بڑی مشکل سے اپنے جسم اور حواس پر انھوں نے قابو پایا، اور پوچھا:

"ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر رابرٹ کا قتل؟"

"ہاں، ————"

"اُف ————"

"کتنے اچھے آدمی تھے وہ؟ شگفتہ طبع، بذلہ سنج، یار باش، ———— آپ کے لیے تو متعدد بار انھوں نے ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل سے بڑے شاندار الفاظ میں سفارش کی، !"

"مَیں جانتا ہُوں، مجھے معلوم ہے، ———— لیکن آہ، یہ کیا ہو گیا؟"

"یقین نہیں آتا اس خبر پر!"

"اگر یہ خبر، جناب والا نے نہ پہنچائی ہوتی، تو مَیں خود یقین نہ کرتا، ———— لیکن سرکاری طور پر تصدیق ہو چکی ہے؟"

"ہاں نواب صاحب!"

---

[1]: "کمپنی بہادر" جب تک ہندوستان پر حکمران تھی "گورنر جنرل" ہی کا منصب سب سے بڑا تھا، پھر غدر کے بعد "وائسرائے" کا منصب قائم کیا گیا۔

(۲۱)

نواب علی نقی خاں ریذیڈنسی پہنچے تو آج نقشہ ہی بدلہ ہُوا پایا، یاتو وہ یہاں چہچوں اور قہقہوں کی صدائیں بلند ہُوا کرتی تھیں یا ساری عمارت پر اور سارے عملے پر سنّاٹا چھایا ہُوا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ریذیڈنسی کا برطانوی جھنڈا جو ہمیشہ لہرایا کرتا تھا، آج کسی کے سوگ میں، آدھا اُترا ہُوا تھا،!

ریذیڈنٹ صاحب اضطراب کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔

اوران کی میم صاحبہ بھی ان کے قدم بہ قدم، حیران و پریشان بےحمل قدمی کر رہی تھیں،!

علی نقی خاں کو دیکھتے ہی ریذیڈنٹ نے کہا :

"آگئے آپ؟"

"بھلا حضور بُلاتے اور بندہ نہ آتا؟"

"نوازش!"

"مگر یہ ناوقت کی طلبی سمجھ میں نہیں آئی؟"

"ہم آپ کو، ایک بہت دردناک خبر سنانا چاہتے ہیں!"

"دردناک خبر؟"

"ہاں، ——— حد درجہ الم انگیز!"

کی ہو سکتی ہے !"

"بے شک، ——————

"پھر یہ کیسے ہو گیا ؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا، لیکن یکسانیت اتنی زیادہ، اور دونوں میں باہمی تعلّق، بہ ظاہر نا ممکن، !"

"بندے کی رائے میں ان دونوں میں سے کوئی قتل بھی، "سیاسی" تو ہرگز نہیں ہوسکتا ——— !"

"ہمیں آپ کی رائے سے اتفاق ہے نواب صاحب !"

"پورے ملک اودھ میں کسی طرح کی شورش نہیں، ——————— اور اگر ہوتی تو قتل حضور کیسے جاتے، مَیں کیا جاتا، رستم بیگ بے چارہ کیوں مارا جاتا ؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں !"

"اسی طرح، پورے بنگال میں کسی طرح کی شورش نہیں، فرنگی راج کے سامنے کسی میں یارا نہیں کہ سر اٹھا کر سامنے آسکے، اور اگر ہوتی تو ظاہر ہے، مسٹر رابرٹ کو ضرور نشانہ بنایا جاسکتا تھا !"

"آپ کے خیال میں وہاں کسی طرح کی سیاسی شورش اور بے اطمینانی ہے ؟"

"ضرور ہے، ورنہ مسٹر رابرٹ کے قتل کے کیا معنی ؟"

"خیال تو ہمارا بھی یہی ہے، لیکن واقعات کی چُول ٹھیک نہیں بیٹھتی !"

"وہ کیوں کر جناب والا ؟"

"اگر وہاں کسی طرح کی شورش، اور بے اطمینانی ہے، تو قتل سے پہلے اس کے کچھ مظاہرے بھی تو ہونے چاہییں تھے، ؟"

"یہ بھی صحیح فرمایا، ——————— مظاہرے ذرا بھی نہیں ہوئے، !"

"ایسے نیک طبع اور نرم خُو شخص کا دشمن کون ہو سکتا تھا؟"

"یہی تو حیرت ہے،!"

"قاتل گرفتار ہو گیا؟"

"نہیں، ——————

"کیا فرمایا نہیں؟ یعنی قاتل بچ گیا؟"

"ہاں، ——————

"لیکن قاتل ہے کون؟"

"یہ بھی اب تک نہیں معلوم ہو سکا؟"

"یعنی قاتل کی شناخت بھی نہیں ہو سکی؟"

"نہیں، ——————

"یہ تو بالکل رستم بیگ کا سا معاملہ معلوم ہوتا ہے،؟"

"ہم بھی اسی لائن پر سوچ رہے ہیں،!"

"کیا ان دونوں قتلوں میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟"

"ہم ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے، —————— لیکن یکسانیت شبہ پیدا کرتی ہے!"

"لیکن جنابِ والا، ——————

"ہاں نواب صاحب فرمائیے؟"

"فرض کیجئے، رستم بیگ کو اس کے کسی ذاتی، یا قدرتی، یا سر پھرے شخص نے قتل کر دیا، مگر وہ یہاں سے بچ کر کلکتہ کس طرح پہنچ گیا؟ اور کسی معمولی شخص کو نہیں گورنر جنرل کے پرائیویٹ سیکرٹری کو قتل کر دیا اس نے؟ —————— یہاں کی پولیس، اور انتظامیہ کی کارگزاری بہر حال اتنی اعلیٰ نہیں، جتنی "کمپنی بہادر" کے مرکزِ حکومت کلکتہ

اس نے اردو میں جواب دیا :

" کافر، تیری جان !"

" یہ میں کیا سُن رہا ہُوں ؟"

" امرِ واقعہ !"

" اس نے اردو میں جواب دیا ؟"

" جی ہاں !"

" اچھا خیر، پھر ——— ؟"

" اس کے بعد قاتل نے جیب سے طمنچہ نکالا، اور تابڑ توڑ دو گولیاں چلا کر انھیں ڈھیر کر دیا، گھوڑے کی راس ہاتھ میں لی، سائیس کو چند ٹھوکریں لگائیں، اور اسی فٹن پر اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہو گیا، !"

" حد ہے جرأت کی !"

" یہ سارا واقعہ سائیس نے سُنایا !"

" سائیس ہندو ہے یا مُسلمان ؟"

" ہندو، ———"

" کہیں وہ خود تو اس سازش میں شریک نہیں ؟"

" نہیں نواب صاحب !"

" جناب والا، ہمیں ہر پہلو پر غور کر لینا چاہیئے !"

" غور کیا جا چکا ہے، وہ حددرجہ بُزدل اور ڈرپوک آدمی ہے، مسٹر رابرٹ کے گھر والوں کا بیان ہے، اگر کبھی مسٹر رابرٹ کسی بات پر خفا ہو کر اسے ڈانٹتے تھے، تو اس کی گِھگھی بندھ جاتی تھی اور پیشاب خطا ——— ہو جاتا تھا، ایسا شخص، اپنے آقا پر نہ قاتلانہ حملہ کر سکتا ہے، نہ ایسی کسی واردات میں شریک ہو سکتا ہے، !"

" بالکل نہیں ! "

" قتل کی کچھ تفصیل بھی معلوم ہُوئی ؟ "

" جی ہاں، ———— مسٹر رابرٹ " انگلش کلب " کے ممبر تھے، وہاں وہ بارہ ایک بجے تک رہتے تھے۔ اپنی فٹن پر جاتے تھے، اور اسی پر آتے تھے، فٹن چلانے کا شوق تھا۔ اس لیے، سائیس پُشت پر کھڑا رہتا تھا، وہ لگام ہاتھ میں لے کر گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے آیا جایا کرتے تھے ! "

" جی، ———— "

" قتل کے دن بھی ایسا ہی ہُوا ، ! "

" مگر وہ کس طرح قتل ہو گئے ؟ "

" ولز لی اسٹریٹ میں ان کا بنگلہ ہے ، ———— "

" جی، معلوم ہے، ! "

" اس اسٹریٹ سے ذرا پہلے ایک ویران اور سنسان مقام آتا ہے، ! کوئی دو فرلانگ کا ہو گا ! "

" ٹھیک، ———— دیکھا ہے مَیں نے ! "

" جب وہ اس ویران اور سنسان مقام پر پہنچے، تو داھنے بائیں سے دس آدمی نمودار ہوئے۔ ایک نے لپک کر گھوڑا پکڑ لیا، دوسرے نے سائیس کی مُشکیں باندھ دیں، اور اس کے مُنھ میں کپڑا ٹھونس دیا، ———— "

" ارے، ———— "

" اور تیسرے نے مسٹر رابرٹ کو کھینچ کر، فٹن سے باہر نکالا، نہ ان کے پاس پستول تھا نہ وہ مسلح تھے، انھوں نے قاتل سے پُوچھا :

" وِیل ٹُم کیا مانگٹا ؟ "

انگریز قوم کو زندہ رہنا چاہیئے، اور وہ زندہ رہے گی، اس طرح کے حوادث اُس پر موت طاری نہیں کر سکتے !"

"بجا ارشاد ہُوا، !"

"ایک تو آپ کو یہ غم انگیز خبر سنانی تھی، دوسری یہ بات آپ کے علم میں لانی تھی کہ پہلے دن کے بعد، آج تک کلّن دربار شاہی کے حاضر باشوں کی فہرست لے کر حاضر نہیں ہُوا۔ دس بارہ دن کی مدت تو گزر چکی ہے، اگر وہ اس مستعدی سے کام کرے گا، تو کام چل چکا، !"

نواب صاحب چونک پڑے، ————

"کلّن نہیں آیا ؟"

پھر بولے :

"شاید بیمار ہو گیا ہو گا، مَیں ابھی اس کی خبر لیتا ہُوں !"

◎

"بجا ارشاد ہُوا! ـــــــ کیا فتّن کا پتہ چلا؟"

"جی ہاں، !"

"کہاں آخر؟"

"چند میل کے فاصلے پر وہ خالی مل گئی!"

"قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش تو جاری ہوگی؟"

"نہایت سرگرمی سے!"

"مگر نتیجہ؟"

"صفر، ـــــــ"

"حضور یہ تو بہت بُرا ہُوا!"

"آپ نے درست کہا، !"

"قاتلوں کو اس طرح چھوٹ مل گئی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"انجام؟ ـــــ انجام یہ ہوگا کہ نہ آپ کی جان کی خیر ہے، نہ ہماری!"

اپنے بارے میں بدفالی کے یہ الفاظ سُن کر نواب صاحب کانپ گئے، ان پر جھرجھری سی، طاری ہوگئی، بادشاہ، ملک اور قوم سے غدّاری، وہ مرنے کے لیے نہیں جینے کے لیے کر رہے تھے، اگر زندگی ہی چلی گئی تو فائدہ کیا؟

ریذیڈنٹ بہادر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"لیکن ایسے مسائل میں انفرادی اور شخصی معاملات پر غور نہیں کرنا چاہیئے!"

ہُنت مری ہُوئی آواز میں نواب صاحب نے کہا:

"جی حضور، ـــــــ"

ریذیڈنٹ نے مردانہ تیور سے جواب دیا:

"ہم میں سے کون مرتا ہے، کون جیتا ہے، یہ ایک معمولی سا مسئلہ ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ

"سرکار وہ کئی روز سے لاپتہ ہیں؟"

"ایں؟ کلّن لاپتہ ہے؟"

"جی، ——— گھر والوں کا بیان ہے ہم نے کنوؤں میں بانس ڈال دیئے، مگر کچھ پتہ نہیں چلتا، انھیں زمین کھا گئی یا آسمان؟"

"(کرسی پر بیٹھ کر، سر دونوں ہاتھوں پر رکھتے ہوئے) یا اللہ!"

"سارا گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے،!"

"لیکن یہ ماجرا کیا ہے، رستم بیگ قتل، مسٹر رابرٹ مقتول، اور، ——— اور کلّن لاپتہ! کہیں اسے بھی تو قتل نہیں کر ڈالا کسی بدنفس نے؟"

"غلام کیا عرض کر سکتا ہے؟"

"جاؤ میر منشی کو لے کر فوراً حاضر ہو،!"

"جی اب تو وہ گھر پر سو رہے ہوں گے، اتنی رات گئے،!"

"جگاؤ، اور کان پکڑ کر لاؤ اسی وقت،!"

◎

(۳)

گھر پہنچتے ہی علی نقی خاں نے آدمی بھیج کر کلّن کو فوراً طلب کیا ، !

اس وقت اپنے دیوان خانے میں تنہا وہ ٹہل رہے تھے ، اور مسٹر رابرٹ کی تصویر دل پذیر ان کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی ، وہ مسٹر رابرٹ سے کئی دفعہ لکھنؤ میں مُلاقات کر چکے تھے اور ان کی قدر دانی کے دل سے مداح تھے ،

سمجھ میں نہیں آرہا تھا ، کس ستم گر نے اس مردِ شریف کو اس بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا ۔

یکایک آہٹ سی ہوئی ، ٹہلنا روک دیا اور کھڑے ہوگئے کہ دیکھیں کون آیا ہے ؟

یہ وہی آدمی تھا جسے انھوں نے کلّن کو لینے کے لیے بھیجا تھا اسے تنہا دیکھ کر پُوچھا :

" اور کلّن ؟ ——— وہ کہاں ہے ؟ "

" جی وہ تو نہیں آئے ؟ "

" یہ ہمّت ؟ ——— کیوں ؟ "

" گھر پر نہیں ہیں ! "

" تو کہہ دیا ہوتا جیسے ہی اور جس وقت بھی آئے ہمارے پاس فوراً بھیجا جاتے ۔ ہم رات بھر انتظار کرنے کو تیار ہیں ۔ ! "

" مگر ، ———

" مگر کیا ، ——— جاؤ یہ ہدایت دے کر آؤ ، ! "

"نہیں ذرا سوچو تو؟"

"جی ارشاد، ــــــــــ"

"ابھی چند دن ہوئے، رستم بیگ دن دہاڑے قتل کر دیا گیا، اور اب یہ کام کا آدمی کلن یک بیک غائب ہو گیا، !"

"جی کام کا آدمی؟ ـــــ وہ تو محض ازراہِ نوازش آپ کی اور ریذیڈنٹ صاحب کی سفارش پر رکھ لیا گیا تھا، ورنہ کام ہی کیا تھا اس کا؟"

"(اپنی غلطی پر متنبہ ہو کر) ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا، لیکن ہمیں فکر بہت ہے؟"

"یہ حضور کی بندہ پروری ہے، ورنہ ایسے سیلانی نوجوانوں کا کچھ ٹھیک ہے؟ نہ نوکری کی پروا، نہ بے روزگاری کا غم، !"

"آپ کا خیال صحیح ہے، اب آپ جا سکتے ہیں!"

میر منشی صاحب سات سلام بجا لائے اور رخصت ہوئے، ان کے جانے کے بعد علی نقی خاں نے حکم دیا:

"کوتوال شہر کو حاضر کرو، !"

O

(۴)

میر منشی صاحب نواب علی نقی خاں کے سامنے دست بستہ حاضر تھے۔ نواب صاحب نے خشمگیں نظروں سے انھیں دیکھا اور پوچھا :

"تو کلّن اتنے دنوں سے غائب ہے ؟"

"جی، ـــــــــــــــ"

"ہمیں اطلاع کیوں نہیں دی ؟"

"اکثر ملازمینِ سُلطانی ایسے ہی نوکری چھوڑ کر بیٹھ رہتے ہیں، غلام کس کس کی حضور کو اطلاع دے، اور جو کام اس کے سپرد تھا وہ بھی کوئی اہمیّت نہیں رکھتا تھا، اس لیے اور اطلاع دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔!"

"(نرم پڑ کر) وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جب وہ ہماری سفارش سے نوکر ہُوا تھا، تو اُس کی اطلاع دینی ہی چاہیئے !"

"غلام پروری کے لیے آپ نہ جانے کتنوں کی سفارش کر چکے ہیں اور ان سفارش یافتہ ملازموں میں نہ جانے کتنے نوکری چھوڑ چکے ہیں، فہرست تیار کروں تو بڑی لمبی ہو جائے گی،!"

"بھئی تم نے تو دماغ چاٹ لیا ؟"

"غلطی ہوئی، معافی کا طلب گار ہُوں،!"

"سوال یہ ہے کہ اصل میں معاملہ کیا ہے ؟"

"میں تو یہی سمجھا تھا تنخواہ ناکافی سمجھ کر گھر بیٹھ رہا،!"

"اس کارگزاری کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ تمھیں برخاست کر دیا جائے!"

"(کانپ کر) حضور!"

"ہم نکمے ملازموں کو پسند نہیں کرتے!"

"جتنی کوشش ایک انسان کر سکتا ہے وہ سب میں نے کر ڈالی، مگر قاتل کا سراغ نہیں لگا. میرے خیال میں وہ ملک چھوڑ کر بھاگ گیا ہے؟"

"اچھا فی الحال رستم بیگ کو چھوڑ دو۔ ایک اور کام پر اپنی پوری توجہ مبذول کر دو، اس کامیابی یا ناکامی پر تمھاری ترقی یا برطرفی کا انحصار ہے!"

"(ہمہ تن گوش بر آواز ہو کر) جی، ——— کیا پھر کسی کا قتل ہو گیا ہے؟"

"نہیں، ——— لیکن ہو سکتا ہے کہ ہو بھی گیا ہو! ——— بہرحال تمھیں قاتل یا مجرم کا پتہ چلانا ہے، اگر پتہ چلا لیا تو اتنا انعام ملے گا کہ مالا مال ہو جاؤ گے، اگر ناکام رہے تو پھر تمھیں کم سے کم جو سزا دی جا سکتی ہے وہ حبس دوام ہے!"

◎

(۵)

کوتوال شہر اس وقت دادِ عیش دے رہے تھے، یعنی ایک مغنّیہ زہرہ بائی کے ہاں رونق افروز تھے اور بڑی محویت کے عالم میں اس کا گانا سن رہے تھے، علی نقی خاں کا آدمی تلاش کرتا ہُوا یہاں آیا، اور کہنے لگا:

"وزیرِ اعظم صاحب نے ابھی اور اسی وقت طلب کیا ہے!"

سارا مزا کرکرا ہو گیا کوتوال صاحب کا، کہنے لگے:

"مجھے طلب فرمایا ہے؟"

"جی ہاں آپ کو!"

"اس وقت؟"

"جی اسی وقت!"

"اچھا بھئی چلو، —— حکمِ حاکم مرگِ مفاجات،!"

کوتوال صاحب وزیرِ اعظم صاحب کے دربار میں پہنچے جو اس وقت تک اپنے دیوان خانے میں پیکرِ اضطراب بنے ٹہل رہے تھے،!

کوتوال صاحب کو دیکھ کر وہ پھر اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھ گئے، ایک عتاب آمیز نگاہ ان پر ڈالی، اور سوال کیا:

"رستم بیگ کے قاتل کا پتہ چلا؟"

"جی نہیں سرکار!"

"(قدموں پر سر رکھ کر) ضرور اس ارشاد کی تعمیل ہوگی، لیکن ۲۴ گھنٹے کے بجائے، ایک ہفتے کی مہلت مرحمت ہو؟"

"(کچھ سوچتے ہوئے) ایک ہفتہ بہت ہے، لیکن تمھاری خاطر سے ہم منظور کیے لیتے ہیں!"

"اس بندہ نوازی کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں؟"

"شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن ایک بات یاد رکھو، ایک ہفتے کی مدت میں، ایک منٹ کی بھی توسیع نہیں کی جا سکتی، اس مدت کے گزرنے کے بعد، یا تو تم لکھ پتی بن جاؤ گے، ورنہ زندگی بھر جیل سے قدم باہر نہیں نکال سکو گے!"

"غلام کو منظور ہے!"

"خوب سوچ لو۔!"

"بہت اچھی طرح سوچ لیا ہے سرکار۔!"

"بس تو اب جاؤ، رات نصف سے زیادہ گزر چکی ہے ہمیں آرام کرنا ہے، ——— کل کے متعلق کچھ اور معلومات درکار ہوں تو میر منشی صاحب سے جو چاہو پوچھ سکتے ہو، وہ تمھارے ہر سوال کا شافی جواب دیں گے!"

(۶)

کوتوال صاحب حبس دوام کے لیے تیار نہیں تھے، مالا مال ہونے کے آرزومند تھے۔ انھوں نے بڑے عزم کے ساتھ، سینہ ٹھونک کر کہا :

"اگر وہ پاتال میں ہوگا تو بھی اس کو تلاش کر کے لاؤں گا، اور حضور کے سامنے پیش کردوں گا!"

"ہم یہی چاہتے ہیں!"

"یہی ہوگا میرے حضور!"

"تو سنو پھر، ——————

"جی ارشاد، —— غلام گوش ہوش سے سُن رہا ہے،!"

"عملۂ شاہی میں کچھ روز ہوئے ایک شخص کلّن شامل ہوا تھا، —— نوجوان، خوب رو، قدآور، بڑی بڑی آنکھیں، تبسم دل فریب، تکلّم سحر انگیز، ——

یہ سراپا سُن کر کوتوال صاحب سنبھل بیٹھے، اور فرمایا :

"جی، —— تو کیا ہُوا اسے؟"

"وہ دفعتہً لاپتہ ہوگیا ہے!"

"لاپتہ ہوگیا ہے سرکار؟"

"ہاں، —— اور اسے زندہ یا مُردہ، اور اس کے قاتل کو بھی اگر وہ قتل ہُوا ہے زندہ یا مردہ ہمارے حضور میں زیادہ سے زیادہ ۲۴ گھنٹے کے اندر پیش کردینا ہے،!"

"یقیناً، ——— میں ابھی بھجواتی ہُوں!"

"لیکن تم بھی آؤ ۔۔!"

"مگر نواب صاحب تخلیے میں باتیں کرنا مانگتا ۔۔!"

"(ہنستے ہُوئے) تمھاری موجودگی میں بھی تخلیہ قائم رہے گا، کیوں نواب صاحب؟"

"یقیناً، بھلا میم صاحبہ سے کیا پردہ ہو سکتا ہے؟"

میم صاحبہ چلی گئیں، اور ریذیڈنٹ نواب صاحب کو لے کر، اپنے خاص ڈرائنگ رُوم میں آیا، جس صوفے پر خود بیٹھا، اسی پر نواب صاحب کو بھی بٹھا لیا، پھر بڑی اپنائیت کے ساتھ کہا:

"ہاں کیا کہہ رہے تھے آپ؟"

نواب صاحب نے ابھی جواب نہیں دیا تھا کہ میم صاحبہ ناشتہ کے خوان ملازمہ کے سر پر رکھوا کر تشریف لائیں، وہ چلی گئی، تو کہا:

"مسٹر رابرٹ کے غم میں صاحب نے رات کو ایک لقمہ بھی نہیں کھایا، لہٰذا پہلے ناشتہ بعد میں باتیں ۔۔!"

نواب صاحب نے بڑے جوش کے ساتھ کہا:

"بہت خوب، بہت خوب، بالکل بجا اور درست ۔۔!"

(۷)

دوسرے دن صبح صبح نواب صاحب، ریذیڈنٹ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت اپنے بنگلے کے لان میں میم صاحبہ کے ساتھ ٹہل رہا تھا، چہرے تفکّر اور اضطراب کے آثار طرب بھی موجود تھے اتنے نا وقت نواب صاحب کو دیکھ کر وہ کچھ چونک سا گیا، ہاتھ ملاتے ہوئے کہا :

"اس وقت ؟"

نواب صاحب نے عرض کیا :

"جی ہاں کچھ ضروری باتیں سمع مبارک تک پہنچانی تھیں، !"

"کوئی بہت خاص بات ہے ؟"

"بہت ہی خاص !"

"تو کہو، ـــــــــ ہم سُن رہے ہیں !"

"حضور والا یہ باتیں تخلیے میں ہوں گی !"

"اتنی اہم باتیں ہیں ؟"

"جی، ـــــــــ دیوار ہم گوش دارد، !"

ریذیڈنٹ نواب صاحب کا ہاتھ پکڑے پکڑے اپنے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا، اور میم صاحبہ سے کہا :

"ڈارلنگ ہم ناشتہ وہیں کریں گے، تیار تو ہو گیا ہوگا ؟"

میم صاحبہ نے کوٹھی کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا :

"لیکن نواب صاحب مطمئن کیسے کر دُوں، جب کہ صورتِ احوال یہ ہے کہ لشکرِ مجاہدین کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اور وہ دیوانہ مُلّا (مولانا سیّد امیر علی) جہاد پر تُلا بیٹھا ہے۔!"

"امیر علی کے ساتھ جو لوگ ہیں، بہت معمولی قسم کے ہیں۔ یہ کسی سختی کی تاب نہیں لا سکتے —، فوراً بھاگ کھڑے ہوں گے۔!"

"اور امیر علی؟"

"وہ اگر باز نہ آیا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔!"

"لیکن، خود آپ کی ہمّت کا یہ عالم ہے، کہ اسے اب تک گرفتار تک نہیں کر سکے!"

"گرفتار جب چاہوں کر سکتا ہُوں، لیکن ——— اس مرحلے پر اسے گرفتار کرنا خطرناک ہے!"

"یہ کیوں؟"

نواب صاحب نے کہا:

"وہ لکھنؤ کے قریب پہنچ چکا ہے، اور بعض لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ جانِ عالم کے قدموں پر اسے گرا کر، اعلانِ جہاد منسوخ کرا دیں، چنانچہ ان سے ملاقات کا بندوبست ہو چکا ہے، اور مَیں خود بھی سوچ رہا ہوں کہ اتمامِ حجّت کے لیے ایک مرتبہ اس سے مل لُوں۔!"

"لیکن اس کی گرفتاری خطرناک کیوں ہو گی؟"

"لکھنؤ کی حدود میں وہ داخل ہو چکا ہے، اس موقع پہ اگر ہاتھ ڈالا گیا، تو عوام بھڑک اٹھیں گے، اور صورتِ حالات اتنی نازک ہو جائے گی کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ——— لیکن اگر یہاں بات نہ بنی، اپنی ضد پر وہ اڑا رہا، تو ظاہر ہے جہاد اسے اجودھیا میں کرنا ہے، لکھنؤ

(۸)

ناشتہ اگرچہ انگریزی طرز کا تھا، لیکن تھا بہت پُرتکلف، بعض چیزیں نواب صاحب کو بہت پسند آئیں، !

ناشتے کے بعد ریذیڈنٹ نے کہا :

" نواب صاحب، یقیناً آپ کوئی اہم خبر لائے ہیں، یا کوئی خاص بات کہیں گے لیکن قبل اس کے کہ آپ سلسلۂ گفتگو شروع کریں، ایک بات میں آپ کے گوش گزار کر دینا چاہتا ہوں !"

یہ الفاظ سُن کر نواب صاحب کچھ چکرائے تو سہی لیکن " اپنے " آدمی تھے، اس لیے کوئی خطرہ نہیں محسوس کیا، بلکہ بڑی آمادگی کے ساتھ کہا :

" ارشاد، ارشاد !"

ریذیڈنٹ نے جیب سے ایک خط نکالا، اسے پڑھا، اور پھر جیب میں رکھ لیا، اس کے بعد، ملائم الفاظ، لیکن سخت لہجے میں کہا :

" بابری مسجد کا فتنہ اب تک ختم نہیں ہُوا، !"

" ہو جائے گا جناب والا، !"

" لیکن گورنر جنرل صاحب اس بارے میں بہت فکر مند ہیں !"

" انھیں بہ طور خاص میری طرف سے مطمئن کر دیجیے، !"

اپنی بات نواب صاحب کے ذہن نشین کرنے کے بعد، ——— ریذیڈنٹ صاحب نے فرمایا :

" اب کہیئے، کیا ہے وہ خاص بات جس کے لیے اس وقت آپ نے تکلیف فرمائی ؟ "

نواب صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے کہا :

" جناب والا وہ بات یہ ہے کہ کلّن لا پتہ ہے ! "

ریذیڈنٹ صاحب اپنی کرسی سے ایک بالشت اُچھل پڑے، انھوں نے فرمایا :

" اس کا مطلب ؟ "

" وہ نہایت وفادار آدمی تھا۔ ہم دونوں نے اسے روزگار سے لگایا تھا، ہمارے پسینے پر خون بہانے کو تیار تھا ! "

" یقیناً ایسا ہو گا، مگر بات کیا ہے وہ تو کہیئے ؟ "

" باتیں دو ہی ہو سکتی ہیں۔ ——— یا تو اسے قتل کر دیا گیا ہے یا، ——— "

" آپ کا خیال ہے رستم بیگ کی طرح اس کی بھی جان لے لی گئی ہے ؟ "

" مجھے تو یہی یقین ہے ! "

" لیکن اس کی لاش ؟ "

سے نکلنے کے بعد اسے اگر ضرورت ہو تو قتل بھی کیا جا سکتا ہے ،!"

" آپ کی باتیں بظاہر وزنی نظر آتی ہیں ،!"

" یقین فرمائیے ، ـــــــــ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اب اس معاملے کو ہر قیمت پر ختم کر کے رہوں !"

" گورنر جنرل صاحب کی خواہش بھی یہی ہے !"

" وہ پوری ہوگی ،!"

" تو میں انھیں مطمئن کر دوں ؟"

" ضرور ، اور فوراً ،!"

"رستم بیگ میرا دستِ راست تھا۔ کلن سے میرا کوئی خاص تعلق نہیں، ——— لیکن مجھے یقین ہے کہ کلن اگر زندہ یا مُردہ مل گیا، یا اس کے قاتل کا سراغ لگ گیا، تو رستم بیگ کا معاملہ بھی واضح ہو جائے گا، ——— یقیناً یہ دونوں قتل ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں،!"

"(عالمِ محویت سے چونک کر) نواب صاحب آپ بالکل سچ کہتے ہیں!"

"بس تو ایک ہفتے کے اندر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا؟"

"خدا کرے ایسا ہو؟"

"ضرور ایسا ہو گا، بالکل مطمئن رہیئے،!"

"مقتول کی لاش کا نہ ملنا، اس کے مقتول نہ ہونے کا ثبوت نہیں ہے!"

"اصولاً تو یہ صحیح ہے! ——— لیکن اسے کون قتل کر سکتا ہے؟"

"جو رستم بیگ کو دن دہاڑے قتل کر سکتا ہے!"

"لیکن مقصد؟"

"یہی سوچنا ہے!"

"میری سمجھ میں تو کوئی خاص مقصد نہیں آتا، !"

"میری سمجھ میں بھی نہیں آتا جناب والا، !"

"پھر زحمت فرمائی کا سبب؟"

"میرے خیال میں یہ معاملہ حد درجہ پُراسرار، اور حد درجہ سنگین ہے؟"

"خیال تو میرا بھی یہی ہے!"

"آخر وہ کون لوگ ہیں جو یہ حرکتیں کر رہے ہیں؟"

"پتہ چلاتے، ——— آپ اس مُلک کے وزیرِاعظم ہیں، سارے اختیارات آپ کے پاس ہیں، جانِ عالم آپ کے کسی فیصلے میں رکاوٹ بننے کی جرأت نہیں کر سکتے ——، اپنی پولیس سے کام لیجیے۔ آخر پولیس کا فرض کیا ہے؟ وہ اتنی نکمی کیوں ہے کہ قاتلوں کا سراغ تک نہیں لگا سکتی؟"

"اپنے طور پر تو میں پُوری کوشش کر رہا ہُوں، ——— مَیں نے کوتوالِ شہر کو بُلا کر کہہ دیا ہے کہ اگر ایک ہفتے کے اندر کلّن خاں یا اُس کے قاتل کو زندہ یا مُردہ ہمارے سامنے نہ پیش کیا گیا تو حبسِ دوام سے کم کی سزا نہیں ملے گی، اور اگر سُراغ لگ گیا، تو اتنا انعام دُوں گا کہ مالا مال ہو جاؤ گے!"

"بہت صحیح قدم اٹھایا ہے آپ نے، اگر رستم بیگ غریب کے لیے بھی آپ اتنے ہی چوکس ہوتے تو اس کا قاتل بھی گرفتار ہو چکا ہوتا!"

نے کپتان پارلو کو حکم دے دیا ہے، وہ اپنی سربراہی میں اس جھگڑے کو ہمیشہ کےلیے چکا دیں گے!"

علی نقی خاں کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت پیدا ہوئی، اس نے کہا:

"بہت معقول تجویز ہے، گلابی پلٹن کپتان پارلو کی سرکردگی میں ہر خدمت بجا لائے گی، اور اس مہم کے لیے کپتان پارلو سے زیادہ موزوں آدمی کوئی نہیں ہو سکتا!"

"بہرحال ہماری خواہش ہے کہ اس مسئلے کا تصفیہ فوراً ہو جائے۔ جتنی دیر لگے گی، حالات نازک ہوتے جائیں گے۔!"

"جناب والا نے حالات کی نزاکت کا ذکر کیا ہے، تو میرے ذہن میں ایک نئی بات آئی ہے؟"

"کہیئے، ـــــــ ہم سُن رہے ہیں!"

"بات یہ ہے کہ مسلمان قوم مذہب کے معاملے میں بڑی حساس ہے، مولوی امیر علی کا قتل اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا اسے قابو میں رکھنا، جہاد کا چرچا اب عام ہوتا جا رہا ہے!"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میرا مدعا یہ ہے کہ اگر گُڑ سے مرے تو زہر کیوں دیں؟"

"وضاحت کیجیے!"

"مَیں مولویوں کی ایک جماعت تیار کر رہا ہُوں [1] جو مولوی کے لشکرِ مجاہدین میں پروپیگنڈا کرے گی کہ اولی الامر کے حکم کے بغیر جہاد جائز نہیں، ـــــــ"

"اچھا پھر، ـــــــ"

بقیہ حاشیہ، صفحہ نمبر ۴۸۶ :

اور کپتان پارلو کا دستہ سپاہ ریذیڈنسی سے!

[1] : تاریخ اودھ۔

(۱۰)

جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ صاحب نے، نواب علی نقی خاں کو ایک روز طلب کیا اور فرمایا :

"رستم بیگ کے قتل، ـــــــــ کلّن کی گم شدگی، اور کوتوالِ شہر کی تادیب، ان سب مسائل کو فی الحال چھوڑیے۔ "محمدی جھنڈا" بلند ہو چکا ہے۔ امیر علی کے ساتھ اگرچہ اب بہت زیادہ ساتھی نہیں ہیں، پھر بھی خاصے ہیں۔ اور یہ بابری مسجد کی واگزاری کے لیے اجودھیا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر قیمت پر انھیں روکیے، ورنہ شاید ہماری آئندہ ملاقات کسی دوسری نوعیت کی ہوگی!"

یہ الفاظ سُن کر علی نقی خاں کانپ گیا، کیوں کہ ان کا مفہوم اور مطلب بُہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا، اسے نہ بادشاہت کے قیام و بقاء کی فکر تھی، نہ ملک کے تحفظ و دوام کی، اسے صرف اپنی وزارت کی فکر تھی اور یہی ناؤ اب ڈولتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

علی نقی خاں نے نہایت سراسیمگی کے ساتھ جواب دیا :

"کچھ سپاہی آپ مرحمت فرمائیں، کچھ ہمارے سپاہی ہیں، یہ سب مل کر بڑھیں، اور مولوی کو روک دیں، نہ مانے تو قتل کر دیں۔"

ریذیڈنٹ نے کہا : "آپ اپنی گلابی پلٹن [1] کو تیار رہنے کا حکم دیجیے۔ ہم

---

[1] : "گلابی پلٹن" اودھ کی حکومت سے متعلق تھی (باقی اگلے صفحے پر)

علی نقی خاں کے لوگوں نے، لشکرِ مجاہدین میں پروپیگنڈا شروع کردیا۔——— اور خاصے لوگوں کو راہِ جہاد سے منحرف کردیا۔ اور بعض علمار سے قتل کا فتوے بھی حاصل کرلیا۔ لہ

اس نے اپنا ایک خاص قاصد بھیج کر مولوی سیّد امیر علی کو ملاقات کے لیے طلب کیا، بعض ساتھیوں نے ملاقات نہ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن مولانا سیّد امیر علی نے یہ مشورہ نہ مانا۔!

انھوں نے فرمایا :

"اگر بہتری کی کوئی صورت نکل سکتی ہے، تو اس کا تجربہ ضرور کرلینا چاہیئے!"

علی نقی خاں کی حویلی میں مولانا تشریف لائے، علی نقی خاں نے بہت آؤ بھگت کی، اس کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لایا!

اُس نے کہا :

"آپ جیسے مجاہدین کی خاکِ پا کو سُرمۂ نظر بنانا میرے لیے موجبِ فخر و سعادت ہے۔———!"

لہ : نواب علی نقی خاں کی کوشش تو یہ تھی کہ تمام سُنّی، شیعہ علماء یہ فتویٰ دیں، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہُوئی۔ (تاریخ اودھ)

"بعض علماء سے مولوی، اور اس کے باغی ساتھیوں کا فتوائے قتل [1] بھی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہُوں،"

"ہم نے اس سے منع تو نہیں کیا ہے ؟"

"مَیں مولوی امیر علی کو بھی اپنے پاس گفتگو کے لیے بُلاتا ہُوں، ——— ان سب تدبیروں میں ہمیں کافی وقت مل جائے گا، مولوی مان گیا تو ٹھیک، نہ مانا تو پھر اپنے قتل کا وہ خود ذمّے دار ہوگا !"

"کوئی حرج نہیں، یہ بھی کر دیکھیے، ——— لیکن ان کاموں میں زیادہ وقت صرف نہ ہونا چاہیئے !"

◎

---

[1] : تاریخ اودھ،

چلیے، اور دیکھ لیجیے، مسجد موجود ہے یا نہیں، پھر اگر مسجد کی بے حرمتی ہوئی، اسے منہدم کرنے کی کوشش ہوئی، اسے بچانے والے مسلمانوں کا قتل ہُوا، تو ان سب باتوں کے ذمّے دار آپ ہیں، اور آپ کو بے حد ذہین ماننے کے باوجُود میں یہ سمجھنے سے قاصر ہُوں کہ خدا کو آپ کیا جواب دیں گے ؟"

"مولانا ہم جیسے گنہگار بھی ایمان کی چنگاری دل میں ابھی رکھتے ہیں !"

"ضرور رکھتے ہوں گے، اور اس کا ثبوت مسجد بابری کا حادثہ ہے کہ اسے وزیرِاعظم ہونے کے باوجود نہیں بچا سکتے !"

"مَیں وعدہ کرتا ہُوں کہ بچاؤں گا ؟"

"مجھے تو اب شہید ہو لینے دیجیے، اس کے بعد بچا لیجیے گا !"

◎

مولانا نے فرمایا :

" میں ایک گناہ گار آدمی ہوں ، خانۂ خدا کی بے حرمتی نہیں برداشت کر سکتا ، جانتا ہوں ، ــــــــــ میرا ، اور حکومت کا مقابلہ کیا ، لیکن ، جان دینے نکلا ہوں ، جان دے کر اپنے فرض سے ادا ہو جاؤں گا ، اس کے بعد خدا جانے اور خانۂ خدا ، میری ذمّے داری ختم ہو جائے گی ، !"

بظاہر علی نقی خاں ان الفاظ سے بہت متاثر ہوا ، !

اس نے کہا :

" مگر بندے کی ایک گزارش ہے ؟"

" ضرور ارشاد ہو ، !"

" کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ فی الحال آپ عزم جہاد ملتوی کر دیں ؟"

" کیوں ملتوی کر دوں ؟"

" میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کچھ مہلت دیجیے ، !"

" معاف کیجیے ، اب مہلت کا سوال نہیں پیدا ہوتا ، اس مسجد کی حرمت پر سینکڑوں مسلمان شہید ہو چکے ہیں ، ان کا خون صحنِ مسجد میں بہ چکا ہے [1] ، آپ اگر چاہتے ، تو پہلے ہی دن اس مسئلے کا تصفیہ کر سکتے تھے ، !"

" کیوں کر مولانا ؟"

" اس مسئلے سے ایک جاہل مسلمان بھی واقف ہے کہ مسجد ، بہر حال مسجد ہے ، اور قیامت تک مسجد ہی رہے گی . مسجد کا وجود شک و شبہ سے بالا ہے ، میرے ساتھ

---

[1] : مولانا سید امیر علی سے پہلے ، مولانا غلام حسین نے " محمدی جھنڈا " بلند کر کے جہاد کیا تھا - وہ اور ان کے ساتھی ، عین حالتِ نماز میں مسجد کے اندر ہندوؤں کے ہاتھوں شہید ہوئے . (تاریخ اودھ)

"مگر یہ کام صرف اپنی ذمّہ داری پر کرنا نہیں چاہتا، ورنہ میری حویلی کھنڈر بنا دی جائے گی، اور میں قتل کر ڈالا جاؤں گا، اور لکھنؤ میں اتنا بڑا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوگا کہ اپنی مستحکم قوت اور طاقت، اور معلوم و معروف وسائل و ذرائع کی اکثریت کے باوجود آپ بھی اسے نہیں دبا سکیں گے!"

"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے ہر اقدام و عمل کی تائید، جان عالم بھی کریں، بلکہ میں جو کچھ کروں ان کے حکم سے کروں!"

"اس میں کیا مصلحت ہے؟"

"پھر اس اقدام کو میری شرارت پر محمول نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے بادشاہ سلامت کی مصلحت اور پالیسی قرار دیا جائے گا۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا؟"

"اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اس حادثے کا ردِ عمل پھر بھی برا ہوگا عوام پر، لیکن بادشاہ کی محبوبیت عوام پر اس کے اثرات اگر زائل نہیں تو کم ضرور کر دے گی!"

"ٹھیک ہے، تو جائیے، انھیں صورتِ احوال سے مطلع کیجیے، ———— اور ان کی تائید حاصل کر لیجیے!"

"یہ ناممکن ہے جناب والا!"

"ناممکن کیوں ہے؟"

"وہ خود بڑے مذہبی آدمی ہیں، اور مسجد کے تقدس کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں، وہ میری بات ماننے سے انکار کر دیں گے!"

"پھر کیا کرنا چاہیئے؟"

"آپ کو زحمت کرنی ہوگی!"

(۱۲)

علی نقی خاں مولانا سیّد امیر علی سے ملاقات کے بعد سیدھا جنرل اونٹرم ریذیڈنٹ کے پاس پہنچا، اس نے پوچھا:

"کہئے، کوئی تازہ خبر؟"

علی نقی نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا:

"جی ہاں، ——— آج میری ملاقات، مولوی امیر علی سے ہوئی تھی!"

"پھر نتیجہ کیا نکلا؟"

"وہی ڈھاک کے تین پات!"

"یعنی وہ اپنی ضد پر قائم ہے؟"

"جی ہاں جناب والا!"

"اپنا لشکر لے کر بہ عزمِ جہاد جو رہا ہے؟"

"جناب، ——— مگر مجھے ایک بات خاص طور پر عرض کرنی ہے!"

"ضرور کہئے!"

"میں نے امیر علی کے قتل کا فتویٰ بھی حاصل کر لیا ہے، اور اس کے لشکر کے بہت سے لوگوں کو ورغلا کر، منتشر بھی کر دیا ہے، اور میں اسے قتل کر دینے، اور اس کے ساتھیوں کا قلع قمع کرنے کا فیصلہ بھی قطعی طور پر کر چکا ہوں!"

"یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں!"

جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ کی سواری شاہی دبدبے کے ساتھ بارگاہ سلطانی تک پہنچی، وزیر اعظم بھی اس موقع پر موجود تھا، اسی نے جنرل صاحب کا استقبال کیا، اور انھیں شاہی کمرے میں لے گیا، بادشاہ نے سروقد کھڑے ہو کر استقبال کیا، معانقہ کیا، اور اپنے پاس بٹھا لیا۔!

کچھ دیر تک ادھر ادھر کی رسمی باتیں ہوتی رہیں، پھر جنرل اوٹرم حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ انھوں نے کہا:

"بابری مسجد کا قضیہ زیادہ سے زیادہ نازک صورت اختیار کرتا جارہا ہے!"

وزیر اعظم نے اس موقع پر لقمہ دیا:

"اور مولوی سید امیر علی نے اسے نازک ترین بنا دیا ہے اپنی ناسمجھی سے۔!"

جنرل اوٹرم گویا ہوئے:

"ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل بہت زیادہ پریشان اور مضطرب ہیں۔ بار بار مجھے تاکید کر رہے ہیں کہ اس مسئلے کو سلجھاؤ؟"

بادشاہ نے کہا:

"اگر آپ اس مسئلے کو کسی طرح سلجھا سکتے ہیں، تو ضرور جو کچھ ممکن ہو سکے کیجیے، ہمارا ہر طرح کا تعاون حاصل ہوگا، آپ کو۔!"

"اپنا مطلب صاف صاف کہیئے؟"

"آپ، جانِ عالم کے پاس تشریف لے جائیں اور انھیں اس کام پر آمادہ کریں!"

"کیا ہماری بات مان لیں گے؟"

"ماننی ہی پڑے گی،!"

"اچھی بات، آپ وقت مقرر کیجیے، کل ہم ان کی خدمت میں باریاب ہونا چاہتے ہیں،!"

"بہت خوب، ——— یہ کام میں کر لوں گا۔ آپ صبح آٹھ بجے کل وہاں تشریف لے آیئے،!"

"ہم ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے،!"

◎

"ہم کمپنی بہادر سے خائف ہیں۔ ہمارے پاس اب اتنی طاقت نہیں کہ کمپنی بہادر کا مقابلہ کر سکیں، حالات سے مجبور ہو کر اپنے اقتدار و اختیار کا بڑا حصّہ کمپنی بہادر کو تفویض کر دیا ہے۔!"

"کمپنی بہادر اعلیٰ حضرت کے اس تدبّر کی قائل ہے۔!"

"لیکن کمپنی بہادر کے سامنے ہماری بے بسی صرف دنیادی معاملات تک ہے!"

"میں حضور کا مطلب سمجھ نہیں سکا؟"

"دنیاوی معاملات میں ہم کمپنی بہادر کا ہر حکم مانیں گے، لیکن اگر اس نے ہمارے مذہبی معاملات میں مداخلت کی تو ہم کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں کر سکیں گے، زندگی میں بعض مرحلے ایسے آتے ہیں کہ انسان زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے، ہمارے خیال میں یہ مرحلہ ایسا ہی ہے!"

"تو آخر میں حضور نواب گورنر جنرل بہادر کو کیا لکھوں؟"

"وہی جو ہم نے کہا ہے!"

"لیکن اسے فراموش نہ کیجیے کہ اس کا نتیجہ سقوطِ مملکت، اور انتزاعِ سلطنت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے!" [1]

"ہم جانتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہم تیار ہیں!"

یہ سُن کر جنرل اوٹرم پیچ و تاب کھا کر رہ گیا!

علی نقی خاں نے بادشاہ کو مخاطب کر کے کہا:

"لیکن عالی جاہ! جس عمارت کے لیے یہ جھگڑا ہو رہا ہے، آیا واقعی وہ مسجد ہے، اس کا ثبوت بھی تو فراہم ہونا چاہیئے؟" [2]

---

[1]: قیصر التواریخ،

[2]: تاریخ اودھ،

اس جواب سے جنرل اوٹرم خوش ہو گیا۔ اس نے کہا :

"تو عالی جاہ، اس کی صورت یہی ہے کہ مولوی امیر علی اور اس کے ساتھیوں کو، اگر ضرورت ہو تو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا جائے!"

"لیکن مولوی کا جرم!"

"فتنہ انگیزی، بادشاہ سلامت کی رعایا میں تفرقہ آرائی۔ ملک کے دو بڑے فرقوں میں — مخاصمت اور عداوت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش۔!"

"لیکن وہ تو مسجد کی واگزاری کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔!"

"اور یہی کوشش فتنہ و فساد کا سبب بن رہی ہے۔!"

"لیکن مسجد کی حرمت اور دفاع کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کرنا، ایک فرض ہے۔ جس سے کوئی مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں۔ اور یاد رکھیے، میں بھی مسلمان ہوں!"

"یعنی عالی جاہ اس معاملے میں مولوی کے ساتھ ہیں؟"

"بے شک۔!"

"حالانکہ اس کے قتل کا فتویٰ بعض علماء دے چکے ہیں۔!"

"وہ عالم نہیں، اسلام کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اولی الامر کی اجازت کے بغیر جہاد نہیں کیا جا سکتا!"

"جی ہاں یہی بات ہے!"

"لیکن میری طرف سے اس کی اجازت ہے!"

"کیا اعلیٰ حضرت جہاد کی اجازت دیتے ہیں؟"

"یقیناً، ———— بشرطیکہ، ہم سرکاری طور پر مسجد واگزار نہ کرا سکے۔!"

"لیکن کمپنی بہادر کو یہ بات ہرگز پسند نہیں۔!"

بادشاہ کے ہاں سے رخصت ہونے کے بعد، جنرل اوٹرم اور نواب علی نقی خاں، ساتھ ساتھ ریذیڈنسی پہنچے۔!

جنرل صاحب نے علی نقی خاں سے کہا :

"تم نے بڑا اچھا داؤ کھیلا ہے، لیکن اسے نباہ سکو گے ؟"

سینہ ٹھونک کر نواب علی نقی خاں نے جواب دیا :

"دیکھ لیجیے گا۔!"

جنرل اوٹرم مسکراتا ہُوا گویا ہُوا :

"ہمیں یقین ہے۔!"

"شکریہ اس کرم گُستری کا !"

"لیکن یہ معاملہ کافی طول کھینچ گیا ہے، اب اسے جلد ختم ہونا چاہیئے !"

"توقع سے بہت پہلے ختم ہو جائے گا، ——————— درحقیقت معاملہ اب ہمارے ہاتھ میں آیا ہے !"

"ہاں یہ تو ہے۔!"

"اگر بادشاہ سلامت مولوی امیر علی سے ہمدردی کا اظہار فرما دیتے، مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے، اور اپنے مذہبی جوش سے متاثر ہو کر خود نفیرِ جہاد بلند کر دیتے تو حالات کا سنبھالنا، خون کی ندیاں بہانے کے باوجود آپ کے لیے ناممکن ہو جاتا۔!"

جنرل اوٹرم علی نقی خاں کا مطلب سمجھ گیا، اس نے کہا :

" تو کیوں نہ ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کردی جائے ؟ اس کی رپورٹ کے بعد، آپ جو فیصلہ مناسب سمجھیں صادر فرمادیں ؟" [1]

علی نقی خاں نے کہا :

" بے شک ایسا ہی ہونا چاہیئے، اور اس اثنار میں مولوی سیّد امیر علی سے اعلیٰ حضرت کو مل لینا چاہیئے، اور انھیں اطمینان دلانا چاہیئے کہ اگر مسجد ثابت ہوگئی تو ہر قیمت پر واگزار کردی جائے گی، اور جب تک کمیٹی کی رپورٹ نہ آئے، مولانا انتظار فرمائیں، اور کوئی اقدام نہ کریں۔" [2]

بادشاہ نے یہ بات مان لی، !

---

[1] : تاریخ اودھ ،

[2] : قیصر التواریخ ،

"بالکل سراغ نہ لگا سکے، آخر ان کا تبادلہ کرنا پڑا، !"

"دیکھنا چاہیئے، اب کس کی باری آتی ہے ؟"

"یہی فکر بندے کو بھی ہے، !"

"یہ قتل دشمنی، لڑائی، مخالفت کی وجہ سے ہوتے تو پریشانی کی کوئی بات نہ تھی !"

"بے شک، ـــــــــ نہ دشمنی، نہ لڑائی، نہ مخالفت، مگر قتل، اور وہ بھی ایسے آدمی کا، جو شاہی عملے سے متعلق تھا، !"

"ماننا پڑے گا یہ کوئی زبردست سازش ہے !"

"میں بھی یہ سوچتا ہوں لیکن اس سازش کا مقصد اور سبب سمجھ میں نہیں آتا، !"

"مقصد اور سبب سمجھ میں آئے یا نہ آئے، یہ بات تو بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ صادق، رستم بیگ اور مسٹر رابرٹ کا قتل قطعاً سیاسی ہے، !"

"بے شک، ـــــــــ لیکن کیا مسٹر رابرٹ کا بھی ؟"

"ہاں، !"

"اس کا ثبوت ؟"

"ثبوت یہ کہ کلکتہ میں پھر ایک نہایت اہم شخصیت قتل کر دی گئی ہے، !"

"(مضطرب ہو کر) کیا فرمایا کلکتہ میں ؟"

"ہاں بھئی، اور کہاں ؟"

"کسے قتل کیا گیا ؟"

"مسٹر فریزر کو ؟"

"مسٹر فریزر ؟ ـــــــــ گورنر جنرل کے پولٹیکل مشیر ؟"

"ہاں، ـــــــــ"

"کب ـــــــــ ؟"

"ٹھیک کہتے ہو!"

"اب تحقیقاتی کمیٹی کا فیصلہ وہ ہوگا جو میں چاہوں گا اور مولوی امیر علی سے ملاقات کے بعد، بادشاہ سلامت یقیناً اس سے برہم ہو جائیں گے، !"

"پہلی بات تو ہم مانے لیتے ہیں، لیکن دوسری بات ایسی ہے، جسے تسلیم کرنے میں ہمیں تامّل ہے، !"

"یہ کیوں؟"

"بادشاہ خود مذہبی آدمی ہیں [1]، وہ اتنے بڑے مجاہد سے مل کر اُس سے خوش ہوں گے یا خفا؟"

"خفا ——— !"

"یہ کیوں کر؟"

"یہ اس لیے کہ بادشاہ سلامت زور دیں گے کہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ تک مولوی خاموش رہے اور وہ مانے گا نہیں، !"

"(مسکرا کر) بھئی بہت خوب، واقعی خوب سوچا تم نے؟"

"تسلیمات، آداب!"

"لیکن اندرونی خلفشار بڑھتا جا رہا ہے، جس نے ہمیں حد درجہ پریشان کر رکھا ہے!"

"بے شک درست فرمایا جناب والا نے، !"

"پرسوں تم نے اطلاع دی تھی کہ تمھارا ایک اور پُرانا مخبر، اور جاسوس صادق رات کو سوتے میں قتل کر دیا گیا؟"

"جی ہاں، ——— کیا کہوں؟ کتنا صدمہ ہے اس کے قتل کا، !"

"تمھارے کوتوال صاحب کچھ بھی نہ کر سکے؟"

---

[1] : یادِ ایّام (مولانا عبدالرزاق مصنف البرامکہ)

"کیا دنیا میں کسی مگرمچھ نے آج تک کسی آدمی کو ڈبوتے وقت اس کا منہ کپڑے سے باندھا ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے!"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ اب تک چار سیاسی قتل ہو چکے ہیں، ——— دو لکھنؤ میں، دو کلکتہ میں!"

"ہاں آپ کا خیال صحیح ہے، !"

"لیکن سوال یہ ہے کہ آیا لکھنؤ اور کلکتہ کے یہ سیاسی قتل، کوئی باہمی رابطہ بھی رکھتے ہیں؟"

"اب تو ماننا پڑے گا کہ ضرور رکھتے ہیں!"

"سوال پھر دہی مقصد اور سبب کا آن پڑتا ہے، ؟"

"یہ گتھی بھی ایک روز حل ہو جائے گی، ——— ہماری انٹیلی جنس پوری مستعدی کے ساتھ اسی کام میں لگی ہوئی ہے، !"

"چند آدمی لکھنؤ میں بھی بلوائیے!"

"وہ آ چکے ہیں اور کام کر رہے ہیں، !"

"پھر یقیناً یہ گتھی حل ہو جائے گی!"

"بلاشبہ، ——— ہم دونوں اس امید میں برابر کے شریک ہیں!"

"چند روز ہوتے، ——— سرکاری طور پر مجھے کل رات اطلاع ملی ہے!"

"بڑی حیرت انگیز بات ہے،!"

"حد درجہ!"

"قاتل پکڑا گیا؟"

"سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہی ہے کہ نہیں!"

"قاتل نہیں گرفتار ہو سکا؟"

"نہیں، ——— اور اُمید بھی نہیں ہے!"

"اُمید بھی نہیں ہے ——— یہ کیوں بھلا؟"

"مسٹر فریزر انگلش گارڈن کے تالاب میں ہر روز پیرا کرتے تھے، ان کی عادت یہ تھی، کہ سورج غروب ہونے کے بعد پیرنا شروع کرتے تھے، اور دو گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رکھتے تھے۔"

"اچھا پھر؟"

"اس روز بھی ایسا ہی ہُوا!"

"جی، ———"

"جب رات زیادہ تاریک ہوگئی تو کسی شخص نے تالاب کے اندر سے ان کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا اور ڈبو دیا،!"

"کمال ہے ——— وہ چیخے بھی نہیں؟"

"چیخ ہی نہیں سکے، قاتل نے انھیں پانی کے اندر گھسیٹتے ہی تیزی کے ساتھ ان کا منھ کسی کپڑے سے باندھ دیا اور خود دوسری طرف سے صحیح سلامت نکل گیا،!"

"ممکن ہے مگرمچھ ہو؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی نواب صاحب؟"

"کیوں ایسا نہیں ہو سکتا؟"

گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

(۱)

ریذیڈنسی اور ایوانِ وزارت میں اندر ہی اندر کیا کچھ سوچا جا رہا تھا، اور کیا کچھ ہو رہا تھا، اس سے جانِ عالم تک ناواقف تھے، تو پھر حضرت محل کا کیا ذکر، ادھر کافی دنوں سے نہ نازو آئی تھی، نہ زمرد، اور متن خاں اور صمصام الدولہ کی بھی کوئی خبر نہیں تھی۔

حضرت محل اس وقت برجیس قدر سے کھیل رہی تھی۔ اب وہ ماشاء اللہ ۸-۹ سال کا ہو چکا تھا،!

حضرت محل نے کہا :

"کیوں شہزادے کیا کر رہے ہو ؟"

وہ چھوٹے چھوٹے کھلونوں کی ایک لمبی سی صف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا :

"امی حضرت کیا آپ ان لوگوں کو دیکھ رہی ہیں ؟"

حضرت محل نے جواب دیا :

"ہاں میری آنکھوں کے نور، دیکھ رہی ہوں، ــــــــــــ لیکن یہ کون لوگ ہیں ؟"

وہ اکڑ کر بولا :

"ان کا رنگ نہیں دیکھا آپ نے ؟

"دیکھ لیا میرے بچے،!"

تلے مسل دیں تب بھی، خوش ہی رہوں گا!"

"(قریب لپٹا کر، اور کلیجے سے لگا کر) لے میں قربان میرے بچے، میں خود اپنی ہزار جانیں قربان کر دوں تجھ پر۔!"

"نہیں امی حضرت، یہ نہ کہئے، ورنہ میں رو دوں گا۔!"

"رو کیوں دو گے؟"

"میں آپ کو بہت چاہتا ہوں، آپ کے بارے میں یہ لفظ نہیں سن سکتا۔!"

یہ کہتے کہتے برجیس قدر کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے، حضرت محل نے اسے گلے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

"میں تو یوں ہی مذاق کر رہی تھی؟"

"مجھے یہ مذاق پسند نہیں ہے!"

"اچھا بھئی غلطی ہوئی، معاف کر دو اپنی ماں کو!"

برجیس قدر مسکرانے لگا!

حضرت محل نے پوچھا:

"لیکن بیٹے انگریزوں کے خلاف یہ باتیں تم نے کس سے سنیں؟"

"بتادوں امی حضرت؟"

"ہاں بیٹے بتاؤ!"

"ایک روز صمصام خالو، اور رمنّن خالو آئے تھے، ———"

"ہاں پھر ———"

"میں کھیل رہا تھا، اور وہ آپس میں یہی باتیں کر رہے تھے۔!"

"اچھا ———"

"جی ہاں، ——— اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ایک پارٹی بنائی ہے

"کیسا ہے؟"

"سفید، جیسے دودھ،!"

"یہ انگریز ہیں، اور میں ان سب کو ابھی گولی مار دوں گا،!"

"لیکن ان بے چاروں نے کیا خطا کی ہے تمھاری؟"

"ارے، آپ یہ بھی نہیں جانتیں؟"

"بالکل نہیں جانتی میرے لختِ جگر!"

"یہ ہمارے دشمن ہیں؟"

"تمھارے دُشمن؟"

"جی، ——— یہ ہماری سلطنت چھین لینا چاہتے ہیں؟"

"(سہم کر) یہ کیا کہا تم نے بیٹے؟ ——— بھلا ہماری اتنی بڑی، مضبوط اور آبائی سلطنت کون چھین سکتا ہے؟"

"یہ بڑے چالاک لوگ ہیں، سب کچھ کر سکتے ہیں،!"

یہ کہہ کر اس نے اپنی مصنوعی بندوق اٹھائی اور نشانہ باندھ کر، سب کو، ایک ایک کرکے مار ڈالا،! پھر بڑے فخر کے ساتھ پوچھا:

"ان میں سے کوئی زندہ تو نہیں ہے؟"

"(مسکرا کر) نہیں، ——— سب مر گئے بے چارے،!"

"امّی حضرت، انھیں بے چارے نہ کہیئے، مجھے بُرا لگتا ہے، غصّہ آتا ہے،!"

"غصّہ آتا ہے تمھیں؟"

"جی ہاں!"

"کس پر؟ ——— اپنی ماں پر غصّہ کرتے ہو بیٹے،!"

"توبہ توبہ، میری یہ مجال کہ آپ پر غصّہ کروں؟ آپ تو میری گردن کاٹ کر اپنے قدموں

"ورنہ ان دونوں کی جو ہمارے لیے سر ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہیں، خیر نہیں، مار ڈالے جائیں گے!"

"انگریز مار ڈالیں گے؟"

"ہاں شہزادے وہی اور کون؟ —————— کیا تم، اپنے خالو کو نہیں چاہتے؟"

"بہت چاہتا ہوں، خاص طور پر صمصام خالو تو مجھے اتنے اچھے لگتے ہیں، کہ کیا کہوں؟"

"ہاں وہ بڑے اچھے آدمی ہیں؟"

"اور متن خالو؟"

"وہ بھی اچھے ہیں!"

"زیادہ اچھا کون ہے امی حضرت؟"

"(مسکرا کر) صمصام خالو!"

"(خوش ہوکر) آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی!"

"کیا ماں بھی اپنے بیٹے کے دل کی بات نہیں جانے گی؟"

"جی ہاں ضرور جانے گی!! —————— امی حضرت؟"

"ہاں بیٹے؟ میرے شہزادے؟"

"کیا صمصام خالو کے ہاں آپ مجھے جانے کی اجازت دیں گی؟"

"نہیں بیٹے!!"

"(افسردہ ہوکر) کیوں نہیں؟"

"جان عالم تمھیں بہت چاہتے ہیں، ایک لمحے کے لیے محل سے تمھیں باہر بھیجنے کو کسی طرح تیار نہیں!"

جو انگریزوں کا اور اُن کے جاسوسوں کا خاتمہ کر دے گی ۔! بس یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی ۔ ۔!"

" تم نے اس کا تذکرہ تو کسی سے نہیں کیا ؟"

" نہیں امی حضرت کسی سے نہیں !"

" اور کرنا بھی نہیں بیٹے ؟"

" بہت اچھا ۔ ـــــــــــــــ لیکن جب بادشاہ ہم ہیں تو اپنے غلاموں سے ڈریں کیوں ؟"

" ڈرنے کی بات نہیں بیٹے ۔ بعض دفعہ غلام سازش اور جاسوسی کے ذریعے بڑی طاقت حاصل کر لیتے ہیں ، اس طاقت کو توڑنے کے لیے دھیرج سے کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور وہ تمھارے دونوں خالو کر رہے ہیں !"

" میرے خیال میں کلکتہ میں جو دو بڑے انگریز مارے گئے ہیں ، انھیں بھی قتل کرنے والے خالو ہی کے آدمی ہوں گے ؟"

" (سہم کر) شہزادے خدا کے لیے چپ رہو !"

" کیوں امی حضرت ؟"

" دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں ۔ اس وقت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے !"

" ہُت اچھا ـــــــــــــــ"

" مجھ سے ایک وعدہ کرو ؟"

" جی فرمایئے ـــــــــــــــ"

" اس مسئلے پر نہ کبھی کسی کے سامنے اظہارِ خیال کرو گے ، نہ منّن اور صمصام الدّولہ کی باتیں کسی کے سامنے دوہراؤ گے ؟"

" وعدہ کرتا ہُوں ، ہرگز ایسا نہیں کروں گا ۔!"

برجیس قدر تو نازو کو دیکھتے ہی جاکر اس سے لپٹ گئے، زمرد نے اسے گود میں اٹھایا، گلے سے لگایا، اور خوب پیار کیا، !

برجیس قدر نے زمرد سے سوال کیا :

" ہماری بندوق ؟ "

پھر نازو سے پوچھا :

" ہماری توپ ؟ "

پھر صمصام الدّولہ سے دریافت کیا :

" ہمارا خنجر ؟ "

پھر متّن خاں سے سوال کیا :

" ہماری تلوار ؟ "

سب نے ہنستے ہوئے جواب دیا :

" جی سب کچھ لائے ہیں، ابھی لے لینا، ! "

صمصام الدّولہ نے، ـــــــــــ شہزادہ برجیس قدر کو پیار کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا :

" معلوم ہوتا ہے، شہزادے کا ارادہ محل میں ایک بہت بڑا اسلحہ خانہ قائم

"ہاں چاہتے تو بہت ہیں!"

"بس تو ان کی مرضی پر ہے، ———— اے لو بڑی عمر!"

"کیا ہُوا امیّ حضرت؟"

"سامنے دیکھو کون آرہا ہے؟"

برجیس قدر نے نظر اٹھائی تو ممّن خاں، صمصام الدولہ، نازو، اور زمرد ہنستے مُسکراتے اس طرف چلے آرہے تھے،!

"جاؤ معاف کیا !"

وہ خوش ہوگیا ۔ مزید اطمینان دلاتے ہوئے اُس نے کہا :

"اب کبھی دشمن کا نام نہیں لوں گا !"

حضرت محل کو ہنسی آگئی ۔

"اچھا بھئی اچھا ، ——— اب یہ باتیں چھوڑو ، کھیلو جاکر ، !"

برجیس قدر ماں کی اجازت پاکر کھیلنے چلاگیا ، محل کے دُوسرے حصّے میں !

کرنے کا ہے ؟"

برجیس قدر نے بغیر کسی جھجک کے کہا :

"جی ہاں ہے تو !"

صمصام الدولہ نے پیار بھرے لہجے میں پُوچھا :

"لیکن کیوں ؟ ـــــــــ کیا چڑھائی کرنا ہے کسی پر ؟"

برجیس قدر نے بڑے ولولے کے ساتھ جواب دیا :

"جی ہاں چڑھائی کروں گا ۔ !"

صمصام الدولہ نے اُسی لہجے میں پُوچھا :

"لیکن کس پر ؟"

شہزادہ بولا :

"دشمن پر ؛"

صمصام الدولہ نے حیرت سے پُوچھا :

"دشمن کون ہے ؟"

شہزادے نے جواب دیا :

"انگریز !"

صمصام الدولہ اور ممّن خاں تو ہنسنے لگے ، مگر برجیس قدر کی نظر ماں پر گئی تو کچھ خفیف سا ہو گیا ، کہنے لگا :

"مَیں کسی پر چڑھائی نہیں کروں گا ۔ !"

پھر ماں سے لپٹ گیا ۔ !

"غلطی ہو گئی امّی حضور ! معاف کر دیجیے !"

حضرت محل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا :

———— !"

زمرّد کہنے لگی :

" لیکن کچھ خطا بھی تو معلوم ہو ، ؟ ———— الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے ، وہ خطا کیا ہے ؟"

نازو نے گدگدانے کے لیے ہاتھ بڑھایا ، حضرت محل نے اُس کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے کہا :

" نا بھئی ہمیں یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں ، !"

نازو نے چھیڑا ،

" اچھا تو وہ بات بتاؤ جو اچھی لگتی ہو ؟"

" خاموشی ، !"

" یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگتی ، !"

" ہر ایک کی پسند جدا جدا ہوتی ہے ، !"

" لیکن ہماری پسند تو سدا سے ایک رہی ہے ؟"

" اب نہیں ہے ، !"

" وہی تو پوچھتی ہوں کیوں ؟"

" تمھیں ہم سے کوئی تعلق نہیں ، ———— ہمیں تُم سے کوئی تعلق نہیں ، !"

" یہ کیا کہہ دیا ؟ ———— زمرّد سُن رہی ہو ؟"

" زمرّد کیا سُنے گی ، اور کیا بولے گی ؟ ———— تُم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہو ، !"

" دونوں نہیں تینوں ، ———— ہم تینوں ، !"

(۳)

یہاں یہ سب باتیں ہوتی رہیں ، !
مگر حضرت محل نے نہ اپنے مہمانوں کی پیشوائی کی ، نہ حسب معمول پُر تپاک استقبال کیا
نہ ان کی باتوں میں کچھ حصّہ لیا ، !
نازو نے ، حضرت محل کی ٹھوڑی اٹھا کر سامنے کی ، اور پُوچھا :
" خفا ہو کچھ ؟ "
زمرد نے ہاں میں ہاں ملائی ،
" آج کچھ رنگ بگڑا ہُوا تو ہے ، ؟ ——————— نہ جانے کیا خطا
ہو گئی ہے ہم سے ، ، ؟ "
نازو بولی :
" یہ تو کچھ عجیب پُر اسرار سا معاملہ نظر آ رہا ہے ، ! "
زمرد نے پوچھا :
" یعنی کیا —— ؟ "
وہ بولی : " بھئی بات یہ ہے کہ ،
بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں
لیکن اب کے سرگرانی اور ہے !

بھی یہاں حاضر ہو گئے ۔!"

زمرّد نے کہا :

"یہ منّن خاں ! کہہ گئے تھے ، ——— جب تک کلکتہ سے نہ آئیں ، ہم لوگ محل میں نہ جائیں ۔!"

صمصام الدولہ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا :

"اس میں مصلحت یہ تھی کہ اگر ہم دونوں ، یا ہم میں سے کوئی پکڑا جاتا ، بات طول کھینچتی ، تحقیق ، تفتیش کا سلسلہ شروع ہوتا تو یہ بات کہیں سے بھی ثابت نہ ہو سکتی کہ اس عرصے میں ہماری بیویاں یہاں آئی تھیں اور ہمارے اقدام کا تعلق کسی درجہ میں بھی محل سے تھا ۔!"

حضرت محل نے کہا :

"وہ زمانہ گیا ؟"

نازو بولی :

"جا چکا، ——— ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لوں گی، ——— ذرا جائے تو سہی۔ ؟ ——— لیکن خدا کے لیے بتادو کیا بات ہے، کیوں خفا ہو ؟"

حضرت محل کہنے لگی :

"بھئی ہمارا تمھارا تعلق کیا ؟ ——— اب تو مہانوں والی بات بھی نہیں رہی کہ چوتھے پانچویں گھڑی بھر کو آگئیں، اب تو خیر سے مہینہ مہینہ گزر جاتا ہے، مگر ادھر جھانکنے کی توفیق نہیں ہوتی۔!"

نازو نے شکایت آمیز نظروں سے نواب صمصام الدولہ کی طرف دیکھا، اور کہا :

"دیکھا، وُہی بات ہُوئی، میں نہ کہتی تھی، اب دو جواب ، ؟"

صمصام الدّولہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا :

"حضرتِ عالیہ، ——— ویسے تو نازو بڑی خطا کار ہے، لیکن اس معاملے میں بے قصور ہے !"

حضرت محل نے چڑھی ہوئی تیوریوں کے ساتھ پوچھا :

"کس لیے ؟ ——— کیوں ؟"

صمصام الدّولہ نے جواب میں عرض کیا :

"میں اور منّن خاں، دونوں ——— کام تو آپ جانتی ہی ہیں، ——— کلکتہ گئے ہوئے تھے، کل رات کو واپس آئے، اور آتے

ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا :

"تو چپ رہ دیوانی ، !"

زمرّد بولی :

"مَیں تو دیوانی نہیں ہُوں ، لیکن میرا قول بھی یہی ہے !"

"پھر تم دونوں دیوانی ہو ، !"

صمصام الدّولہ نے کہا :

"حضرتِ عالیہ ، آپ سلطنت کا نشان ہیں ، آپ سلامت ہیں تو سلطنت کو زوال نہیں آسکتا ، وہ مٹ نہیں سکتی ، !"

"اور آپ لوگ ، ——————— سلطنت کے ستُون ہیں ، جب تک ستُون قائم ہیں ، سلطنت بھی قائم ہیں ، خدانخواستہ یہ ستون ہل گئے ، یا ڈھے گئے تو سلطنت کہاں ؟ سُلطان اور سلطانہ کہاں ؟"

پھر گفتگو کا موضوع بدلتے ہُوئے اس نے پُوچھا :

"کلکتہ میں اتنے دن رہے ، کہئے کیا کر آئے ؟"

نواب متّن خاں نے جواب دیا :

"دو سانپ مارے ، !"

صمصام الدّولہ نے دانت پیستے ہوئے کہا :

"اور ان کا سر بھی کُچل ڈالا ، اب دو اور نظر میں ہیں ، !"

حضرت محل نے قدر اور احترام کی نگاہ سے نواب صمصام الدّولہ ، اور نواب متّن خاں کو دیکھا ، پھر کہا :

"لیکن ، ——————— میری مانیئے ، تو کچھ روز کے لیے اپنی سرگرمیاں معطّل کر دیجیے ؟"

(۴)

نواب صمصام الدولہ کی اس وضاحت سے، حضرت محل کو اطمینان ہوگیا، لیکن اس نے کہا :

" اتنی احتیاط کی کیا ضرورت ہے ؛ "

" کیوں نہیں ہے حضرتِ عالیہ ؟ "

" ہم سب ایک ہی کشتی کے مُسافر ہیں، ——— ڈوبیں گے تو ساتھ، تیریں گے تو ساتھ، ! "

" نہیں میرے جیتے جی یہ نہیں ہوسکتا ؛ "

" کیا نہیں ہوسکتا نواب صاحب ؛ "

" اگر ڈوبنے کا وقت آیا تو صرف ہم نمک خوار ڈوبیں گے، ملکۂ عالیہ پر آنچ بھی نہیں آسکتی، ——— کیوں منّن خاں ؟ "

" (بڑے تہور کے ساتھ) بے شک، کیا اس میں بھی کوئی شُبہ ہوسکتا ہے ؟ "

" لیکن مَیں اس تفرقے کی قائل نہیں ہُوں، ! "

نازو بول پڑی :

" ہم تو ہیں، ——— "

حضرت محل نے پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہُوئے اور اُس کے گال پر

ہو جائیں ، تب یک بیک ، ایک ہی وقت میں ، پے در پے لکھنؤ ، اور کلکتہ کے اندر کئی سر دشمنوں کے اڑا دیئے جائیں ، !"

متن خاں نے صمصام الدّولہ سے کہا :

" ہماری ملکۂ عالیہ پر تدبیر ختم ہے ، بے شک یہی مناسب ہے ، !"

صمصام الدّولہ نے بھی متن خاں کی تائید کی :

" مَیں آج ہی ہدایات جاری کیے دیتا ہُوں ۔ ——— واقعی حضرتِ عالیہ کی رائے بڑی مناسب ہے ، !"

صمصام الدولہ نے پوچھا :

"یہ کیوں حضرتِ عالیہ ؟"

"مصلحت ہے اس میں ، !"

"لیکن میں نہیں سمجھ سکا ، ؟"

"لکھنؤ اور کلکتہ میں جو لوگ قتل ہوئے ہیں ، بڑے چوٹی کے لوگ ہیں ، لکھنؤ والے ریذیڈنٹ ، اور علی نقی خاں کے جاسوس تھے ، اور کلکتہ والے گورنر جنرل کے معتمد ؟"

"ہاں بے شک یہی بات تھی !"

"ان قتلوں نے ریذیڈنسی ، اور گورنر جنرل ہاؤس میں تہلکہ مچا دیا ہے ، قیامت برپا کر دی ہے ، !"

"بے شک یہی کیفیت ہے ، !"

"ہمارے وزیر اعظم صاحب ، اور صاحب ریذیڈنٹ بہادر ، اور نواب گورنر جنرل ، سب ہی پیچ و تاب کھا رہے ہیں ، !"

"بالکل درست فرمایا ، !"

"لیکن معاملہ پیچ و تاب ہی پر ختم نہیں ہو جائے گا ، !"

"ہاں ، وہ کوشش کریں گے کہ سراغ لگائیں ، یہ سب کچھ کون کر رہا ہے ؟ کس کے اشارے سے ہو رہا ہے ؟ کارکن کون کون لوگ ہیں ؟"

"مجھے رات کو آتے ہی اطلاع مل چکی ہے ، ریذیڈنسی میں ہر روز کانفرنسیں ہو رہی ہیں ، جن میں وزیر اعظم صاحب بہادر بھی پابندی سے شرکت کرتے ہیں ، !"

"میں جانتی ہوں ، ——— لہٰذا ان سب کو مغالطہ دینے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ ، اور کلکتہ ہر جگہ ، اس طرح کا کوئی اقدام نہ ہو ، پھر جب انھیں یقین ہو جائے کہ طوفانِ قتل و غارت ختم ہو چکا ہے ، اور رفتہ رفتہ یہ غافل ہو کر ، دوسرے کاموں میں مشغول

دیکھ رہی ہُوں!"

"کیوں ———— ؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا ؟"

"بظاہر کیا وجہ ہو سکتی ہے ؟"

"وجہ ایک ہی ہو سکتی ہے، اور وہی ہے،؟"

"کون سی وجہ ؟ بتاؤ۔؟"

"جانِ عالم زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ بظاہر بالکل انجان بنے ہوئے ہیں، لیکن جانتے سب کچھ ہیں، سمجھتے ہر بات ہیں۔ وہ اپنی بے بسی، اور انگریزوں کے غلبے سے حد درجہ ذہنی کوفت میں مبتلا ہیں! ———— اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس کا اثر ان کی صحت پر بُرا پڑے گا،!"

یہ کہتے کہتے حضرت محل کی بڑی بڑی اور خوب صورت آنکھوں سے موتی کی طرح آنسو ٹپکنے لگے، نازو بھی اس کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ———— اور زمرّد بھی،!

نواب منّن خاں نے دل دہی کے لہجے میں کہا :

"ملکۂ عالیہ، اتنی دل گیر نہ ہوں۔ ہم بادشاہ سلامت کے پاس جائیں گے، اور انھیں دلچسپ مشاغل کی طرف راغب کریں گے،!"

"یعنی رقص و نغمہ ؟"

"جی ہاں اور کیا!"

"لیکن ایک بات آپ بھول گئے،؟"

"وہ کون سی بات ہے ملکۂ عالم ؟"

"یہ محرم کا مہینہ ہے،!"

(۵)

نازو حضرت محل سے لپٹ گئی ، کہنے لگی :

" ماں تو لی تھاری بات ہم سب نے ، پھر بھی افسردہ سی نظر آ رہی ہو ، ! "

حضرت محل نے جواب دیا :

" ہاں نازو ، واقعی میرا دل غمگین ہے ! "

منّن اور صمصام اور زمرد سب کی نظریں حضرت محل کے چہرے پر اور کان اس کی باتوں پر لگے ہوئے تھے ، !

زمرد نے سوال کیا :

" لیکن خدا نہ کرے بات کیا ہے ؟ ——— ہم لوگ ہیں کس لیے ؟ ہمیں نہ بتاؤ گی ، تو کسے بتاؤ گی ؟ "

حضرت محل نے ایک آہِ سرد کے ساتھ کہا :

" تم سے بڑھ کر میرا رازدار ، ہمدرد ، رفیق ، اور غم گسار کون ہے ، ؟ ضرور بتاؤں گی ، ! "

نازو نے اضطراب کے ساتھ کہا :

" لیکن خدا کے لیے جلد کہو ، ! "

حضرت محل نے سنجیدگی کے ساتھ کہا : " کچھ دنوں سے جان عالم کو بہت افسردہ

"(خوش ہوکر) واقعی، یہ تو آپ نے بہت خوب سوچا، ——— کاش، ایسا ہو سکے، !"

"کیوں کیا آپ کو اس میں شبہ ہے کچھ، ؟"

"صرف ایک، !"

"وہ کیا حضرت عالیہ ؟"

"میرانیسؔ کا آنا مشکل ہے، اور وہ نہ آئے، تو وہ بات پیدا نہیں ہو سکے گی، جو آپ نے کی ہے، !"

"میرانیسؔ کا آنا مشکل کیوں ہے ؟"

"وہ شاہی دربار میں آج تک تشریف نہیں لائے، ——— اب کیسے چلے آئیں گے ؟"

"یہ میرا ذمہ رہا، میں لے آؤں گا انھیں، !"

نازو بولی :

"بڑے آئے حاتم طائی، یہ لے آئیں گے جاکر، !"

منّن خاں ہنس پڑے، کہنے لگے :

"بھئی، تم میاں، بیوی کی نوک جھونک بڑی مزے کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ اس وقت حاتم طائی کیسے یاد آ گیا ؟"

صمصام الدولہ نے کہا :

"یہ در اصل رُستم یا سُہراب کہنا چاہتی تھیں، ——— لیکن یاد آگیا حاتم طائی، !"

نواب منّن خاں، زمرّد اور حضرت محل ہنس پڑے،

نازو رُوٹھتی ہوئی بولی :

"محرم کا مہینہ ؟"

"ہاں ، ------- اس مہینے میں ویسے بھی جب وہ ذہنی کوفت میں مُبتلا نہیں تھے ، اس طرح کی دلچسپیوں سے بالکل تائب ہو جایا کرتے تھے ، لہ اور اب تو معاملہ یہ ہے کہ ایک تو محرم ، دوسرے ذہنی صدمہ ، نواب صاحب آپ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے ، !"

صمصام الدّولہ نے گفتگو میں حصّہ لیتے ہوئے کہا :

"لیکن مَیں نے ایک ترکیب سوچ لی ہے ، ملکۂ عالیہ ، !"

حضرت محل سوالیہ نظروں سے صمصام الدّولہ کی طرف دیکھنے لگی :

صمصام الدّولہ نے عرض کیا :

"آج کل شہر کے ہر گلی کوچے میں مجلسیں ہو رہی ہیں ۔ ذاکر ، ذکر کر رہے ہیں اور مرثیہ خواں مرثیے پڑھ رہے ہیں ، !"

"ہاں تو -------"

"کیوں نہ قصرِ شاہی میں ایک مجلس کا انتظام کیا جائے ، ؟"

"اس سے کیا ہوگا ؟"

"آج تک قصرِ شاہی کی کسی مجلس میں ، ------- میر انیسؔ نہیں آئے ہیں ، ------- مرزا دبیرؔ بے شک کبھی کبھی آتے ہیں ۔ مَیں ان دونوں کو جمع کر دُوں گا ، دونوں اپنے مرثیے پڑھیں گے ، ------- کیا آپ کا خیال ہے ، میر انیسؔ کی زبان ، اور مرزا دبیرؔ کا بیان سُن کر حضرت جانِ عالم کی یہ کیفیت ختم نہیں ہو جائے گی ، ------- ان کی طبیعت کا رُخ ایک دوسری طرف مُڑ نہیں جائے گا ؟"

لہ : جان عالم (عبد الحلیم شرر)

(۶)

بادشاہ کی مجلس میں اس وقت وزیرِاعظم علی نقی خاں کے علاوہ نواب منّن خاں اور نواب صمصام الدّولہ بھی حاضر تھے، علی نقی نے پُوچھا :

"سُنا ہے، آپ لوگ کلکتہ تشریف لے گئے تھے ، ؟"

صمصام الدّولہ نے جواب دیا :

"ہم لوگ کانپور، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کئی جگہ گئے تھے !"

علی نقی خاں نے کہا :

"پھر تو بڑے جہاں گشت ہوتے جا رہے ہیں آپ لوگ ۔ !"

بادشاہ (واجد علی شاہ) نے دریافت کیا :

"لیکن اتنے طویل سفر کی ضرورت کیا تھی آخر ؟"

نواب منّن خاں نے جواب دیا :

"سرکار عالم پناہ، ہم دونوں نے تجارت اور کاروبار کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ایک جگہ سے مال خریدتے ہیں، دُوسری جگہ بیچ دیتے ہیں ۔ اور خود لکھنؤ کی مصنوعات کی کلکتہ میں بڑی مانگ ہے !"

"اچھا، ــــــ مثلاً کلکتہ میں لکھنؤ کی کون سی چیزیں زیادہ بکتی ہیں ؟"

"مٹی کے کھلونے، جو بالکل اصل سے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہاں چار آنے سینکڑہ مل جاتے ہیں، اور وہاں دس دس بیس بیس روپیہ کا ایک ایک بک جاتا ہے !"

"پھر مجھے غصّہ آجائے گا، !"

صمصام الدولہ نے کہا :

"بھئی غصّہ جس پر چاہو کرو، میری کوئی خطا نہیں ہے، ——— اور اگر ہے تو معافی چاہتا ہُوں، !"

پھر حضرت محل سے کہا :

"والد مرحوم کے، اور میر صاحب کے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے، وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح مانتے ہیں، میری درخواست ضرور قبول کر لیں گے، !"

◎

(۷)

علی نقی خاں کے جانے کے بعد صمصام الدّولہ نے کہا :

"سرکارِ عالم پناہ، محرم کا مہینہ شروع ہو چکا ہے!"

"ہاں تو ——————"

"اب تک مجلس نہیں ہُوئی کوئی؟"

"ہم نے فتح الدّولہ برق سے کہا تو ہے غالباً، ایک آدھ روز میں انتظام ہو جائے گا!"

"بہت خوب، —————— لیکن مرثیہ خوانی کون لوگ کریں گے؟"

"وہی شعراء جو محل سے تعلق رکھتے ہیں!"

"باہر کا کوئی نہیں ہوگا؟"

"محل سے باہر کے لوگوں میں صرف انیسؔ و دبیرؔ ہی رہ جاتے ہیں، سو دبیرؔ کے مرثیے تو کئی بار سُنے جا چکے ہیں!"

"اور انیسؔ؟"

"وہ آتے نہیں!"

"سرکارِ عالم پناہ کی طرف سے دعوت نامہ جائے تو سر کے بل آئیں گے!"

"ہاں ہم نے دعوت نامہ تو بطورِ خاص انھیں کبھی نہیں بھیجا!"

"تو اس مرتبہ سہی!"

"لیکن اگر وہ نہ آئے؟"

"ارے یہ کیسے؟"

"انگریز افسروں کی میمیں ان چیزوں کی بڑی قدر دان ہیں!"

"ہاں ضرور رہوں گی، ——— اور لکھنؤ کا عطر؟"

"وہ بھی خوب بکتا ہے، یہاں کے عطر پر تو کلکتہ کی میمیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ کہتی ہیں، لندن اور پیرس کی خوشبویات میں بھی وہ بات نہیں جو لکھنؤ کے عطریات میں ہے!"

علی نقی خاں نے اعتماد کے ساتھ کہا:

"بات بھی کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی ہے، ریذیڈنٹ صاحب اکثر ان چیزوں کی فرمائشیں کیا کرتے ہیں!"

"کیا وہ بھی سوداگری کرتے ہیں؟"

"(مسکرا کر) جی نہیں وہ تو بطور تحائف صاحبانِ عالی شان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں،!"

بادشاہ سے اجازت پاکر صمصام الدّولہ نہال ہو گئے اور انہیں کی آمد کی توقع سے خود بادشاہ بھی بہت مسرور نظر آرہے تھے، انھوں نے مُسکراتے ہُوئے ارشاد فرمایا :-

" دونوں کو ایک مجلس میں جمع کرنے کی ترکیب تم نے سوچی خوب ہے !"

پھر خفیف سے تامّل کے بعد ارشاد فرمایا :

" اگر تم اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئے تو ہم تمھیں انعام دیں گے، خلعت دیں گے، ایسی اَن ہونی بات پر ہمیں بے انتہا مسرّت ہوگی !"

" سرکار عالم پناہ، اَن ہونی کیوں ؟"

" جو بات آج تک نہ ہوسکی، تم اگر اسے کر دکھاؤ تو وہ اَن ہونی ہی ہوگی ۔!"

" سارا ملک، اور خاص طور پر ملک کا دانشور طبقہ اپنے بادشاہ سے کتنی بے پناہ محبّت کرتا ہے، کتنا والہانہ تعلّق ہے اسے اپنے ظل اللہ سے، معلوم ہوتا ہے آقائے نامدار نے اس حقیقت کی طرف اب تک توجہ نہیں مبذول فرمائی !"

" ہم جانتے ہیں، ہمیں بھی اپنی رعایا سے بے حد محبّت ہے، اور اس بات کا ہمیں از حد دکھ ہے، اور شاید یہی دکھ ہماری موت کا سبب بنے گا کہ ہم اپنی محبُوب، اور محبّت کرنے والی رعایا کی اتنی خدمت نہیں کر سکتے، جتنی چاہتے ہیں ——— حوصلے بلند ہیں، لیکن حالات ناسازگار ہیں ۔!"

بادشاہ کے ان الفاظ سے منّن خاں، اور صمصام الدّولہ بہت متاثر ہوئے،

"ضرور آئیں گے، غلام لائے گا، اور غلام ہی شاہی دعوت نامہ لے کر جائے گا!"

"اگر تمھیں یقین ہے، تو ضرور بُلاؤ!"

"غلام کا تو اس مرتبہ ایک اور ارادہ ہے؟"

"وہ کیا؟"

"انیس و دبیر دونوں اس مجلس میں اپنے اپنے مرثیے پڑھیں۔!"

"یہ نہیں ہو سکتا۔؟"

"سرکار والا کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"کیا تم نہیں جانتے، ایک مجلس میں پڑھنا تو بڑی چیز ہے۔ ——— یہ دونوں شریک بھی نہیں ہوتے!"

"لیکن شاہی دعوت کے جواب میں کوئی بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔!"

"ہماری طرف سے تمھیں اجازت ہے!"

"غلام یہی چاہتا تھا۔!"

صمصام الدولہ کی بات میر انیسؔ نے مان لی، اور مجلس میں شرکت کا وعدہ کر لیا، مرزا دبیرؔ بھی راضی ہو گئے اور آنے کا اقرار کر لیا۔

شاہی محل میں، مجلس کا اہتمام بڑے زور شور کے ساتھ کیا گیا۔

مرزا دبیرؔ وقتِ معینہ سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے، حضورِ شاہ میں باریاب ہوئے، اور ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔

انیسؔ کو دربارِ شاہی، یا وزیرِ سلطان کی تعریف و توصیف سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ اپنے کنجِ عافیت میں مگن تھے، اور اہلِ بیتِ اطہار کی مدح و توصیف کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔

مرزا دبیرؔ تو آ گئے، لیکن میر انیسؔ اب تک نہیں پہنچے۔ حالانکہ انھیں خبر مل چکی تھی کہ دبیرؔ مجلس میں پہنچ چکے ہیں اور بادشاہ کی خدمت میں باریاب بھی ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی، اور مجلس شروع ہونے کا جو وقت تھا، اس سے کچھ زیادہ آ گیا، آخر شاہی چوب دار میرؔ صاحب کی حویلی میں حاضر ہُوا، اور عرض گزار ہُوا :

"مجلس تیار ہے، صرف آپ کا انتظار ہے۔" تام جھام[۱] پہلے سے تیار تھی، میر صاحب اس پر بیٹھے، اور قصرِ شاہی کی طرف روانہ ہوئے، مجلس میں جیسے ہی انھوں نے فرش پر پاؤں رکھا، تمام حاضرینِ مجلس تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے، میر صاحب نہایت تمکنت اور وقار سے

---

[۱] : یہ ایک ڈولی کی طرح کی سواری ہوتی تھی، جسے کہار اٹھا کر چلتے تھے۔

صمصام الدولہ نے گلوگیر آواز میں کہا :

" آقائے نامدار ، حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے ، وہ بدلتے رہتے ہیں ، اور بدلیں گے ، ! "

بادشاہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خاموش ہو گئے !

متّن خاں ، اور صمصام الدّولہ نے بھی اس نازک موضُوع پر اب کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا ، انھوں نے بھی مناسب یہی سمجھا کہ سکُوت اختیار کریں ، اور کسی دُوسرے موضُوع پر گفتگو کریں ، تاکہ بادشاہ کا یہ تاثر ختم ہو کسی طرح ، !

◎

اترنے والے نہیں ، میر صاحب کے ارشادات کو بادشاہ بھی سمجھ گئے ، جو منبر کے عقب میں شہ نشین پر تشریف فرما تھے ، آخر میں میر صاحب نے اپنا مرثیہ شروع کیا ، جس کا ایک شعر یہ ہے :

زُلفِ اکبر کو جو دیکھا سرِ نیزہ پُر خوں
مُوئے سر کھول دیئے ماں نے پریشاں ہو کر

یہ شعر سُن کر بادشاہ نے فتح الدّولہ برؔق سے جو پاس ہی بیٹھے تھے فرمایا :

" ہم نہ کہتے تھے انیسؔ لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں ، یہ زبان انھی کے لیے ہے [1]

انیسؔ جب مرثیہ ختم کر چکے تو بادشاہ نے انھیں سامنے طلب فرمایا ، اور ان کے کلام کی بہُت تعریف کی ۔ انیسؔ آداب بجا لا کر رخصت ہو گئے [2] ۔

مجلس کے برخاست ہونے کے بعد جب سب لوگ چلے گئے ، اور صرف نواب منّن اور صمصام الدّولہ رہ گئے ، تو بادشاہ نے ، نواب صمصام الدّولہ سے مخاطب ہو کر فرمایا :

" بہُت دنوں کے بعد آج ہمارا دل خوش ہُوا ہے ! "

صمصام الدّولہ نے آداب بجالاتے ہُوئے کہا :

" ذرہ نوازی ہے سلطانِ والاشان کی ، ! "

بادشاہ نے فرمایا :

" تم نے میر و مرزا کو ایک مجلس میں جمع کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے ، انیسؔ کا کلام سُن کر ہم پر جو کیفیت طاری ہُوئی اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں ، ! "

صمصام الدّولہ نے دست بستہ عرض کیا :

" بے شک وہ ایسے ہی شاعر ہیں ، وُہ لکھنؤ کی رونق ہیں ، لکھنؤ کی آبرُو ہیں ، لکھنؤ کا وقار ہیں ! "

---

[1] : تذکرۂ آبِ بقا (خواجہ عبدالرؤف عشرؔت)
[2] : حیاتِ انیسؔ (امجد علی اشہری)

سیدھے منبر کے پاس بیٹھ گئے، نواب مفتاح الدولہ بادشاہ کے وزیر بکار خاص سامنے آئے تو ان سے کہا :

" آپ حضرت جان عالم سے عرض کردیں انیسؔ حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے ! "

مفتاح الدولہ نے یہ الفاظ بادشاہ تک پہنچائے۔ انھوں نے خوشنودیٔ مزاج —— کا اظہار فرمایا ، !

آخرکار مجلس شروع ہُوئی ، پہلے مرزا دبیرؔ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ، انھوں نے سب سے پہلے بادشاہ کی تعریف میں ایک رُباعی پڑھی ، سامعین نے یہ رباعی بڑی دلچسپی سے سُنی ، اور سُبحان اللہ کی آواز سے وسیع و عریض ہال گونجنے لگا ، پھر انھوں نے مرثیہ پڑھا ، اس کی بھی خُوب داد ملی ، !

دبیرؔ کے بعد انیسؔ سے فرمائش کی گئی کہ اب وہ اپنی مدحیہ رباعی اور مرثیہ پڑھیں۔ میر صاحب کچھ کہہ کر نہیں لے گئے تھے ، مدحیہ رُباعی کی فرمائش سُن کر فی البدیہہ ایک مطلع نظم کیا اور منبر پر تشریف لے گئے ، منبر پر جاکر اپنی عادت کے مطابق کچھ دیر چُپ بیٹھے رہے ، جب تمام مجلس ان کی طرف متوجہ ہوگئی ، تو انھوں نے جنابِ امیرؑ[۱] کی مدح میں ایک رباعی پڑھی چاروں طرف سے آفریں اور مرحبا کا شور بلند ہُوا ، پھر انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں سلام شروع کیا ، جس کا فی البدیہہ مطلع یہ ہے :

غیر کی مدح کروں شہ[۲] کا ثنا خواں ہوکر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہوکر ، !

اس مطلع کا سُننا تھا کہ معنی فہم طبائع ادا سے کلام کا مزا لینے لگے ، میر انیسؔ کے اندازِ بیاں نے تمام اہلِ دربار پر یہ بات واضح کردی کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجۂ کمال سے نیچے

---

۱ : جنابِ امیرؓ سے مراد حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ ہیں۔

۲ : شہ ، یعنی شاہ ، مراد حضرت امام حُسین علیہ السلام۔

حضرت محل کے حکم سے ویسا ہی خلعت اور وہی انعام نواب مٹّن خاں کو بھی اسی وقت عطا کیا گیا، حضرت محل نے زمرّد سے پوچھا :

"اب تو خوش ہوئی ،!"

وہ مسکرا کر بولی :

"خوش تو خیر بہت ہُوں ، لیکن جلن اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک بھائی صمصام الدّولہ ہیں جو ایسے ایسے کارنامے انجام دیتے ہیں کہ بادشاہ سلامت کے دربار سے ،اور تمھارے ہاں سے ان کی برابر قدر افزائی ہوتی رہتی ہے، ————————

نازو بولی :

"واہ ری جل ککڑی ،!"

وہ کہنے لگی :

"قسم لے لو ، بھائی صمصام کو اپنا سگا بھائی خیال کرتی ہُوں ، ان کی ہر سرافرازی پر میرا دل خوش ہوتا ہے اور اس خوشی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا ، ————————

صمصام الدّولہ نے کہا :

"مجھے یقین ہے ، واقعی مَیں نے تم سے وہی محبّت پائی ہے جو ایک بہن سے مل سکتی ہے !"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے وہ بولی :

"لیکن ایک یہ (مٹّن خاں) ہیں ، جو ہر مشورے میں شریک ، ہر بات میں شریک ، ہر تدبیر میں شریک ،

بادشاہ نے تائید فرماتے ہوئے کہا :

"تم نے ہمارے دل کی بات کہی ہے !"

پھر نواب مفتاح الدولہ کو حکم دیا کہ صمصام کو، بیش قرار انعام اور بیش بہا خلعت عطا کیا جائے، !

صمصام الدولہ بیش قرار انعام اور بیش بہا خلعت لے کر، جب حضرت محل کے ایوان میں واپس آئے، اور ساری کیفیت سنائی تو زمرد نے جل کر منّن سے کہا :

"تم تو خیر سے، جیسے گئے ویسے ہی آ گئے، ؟"

سب ہنسنے لگے !

حضرت محل نے اسے گلے سے لگا لیا، اور کہا :

"نواب منّن خاں کو بھی یہی چیزیں ہم دیں گے، تو دل تھوڑا کیوں کرتی ہے ؟"

زمرّد نے نازو کی طرف ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھا، اور بولی :

"جل گئی، ــــــــــــــ"

وہ اکڑتی ہوئی کہنے لگی :

"ہاں جل گئی، ہٹ جاؤ پاس سے، ورنہ بھسم ہو جاؤ گی !"

حضرت محل نے نازو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، اور کہنے لگی :

"بڑی چنچل ہے تُو، ــــــــــــــ زمرّد جیسی نیک، اور پیاری سہیلی کو بھی معاف نہیں کرتی ․؟"

زمرّد نے شکایت آمیز انداز میں کہا :

"دیکھ لو تُمھیں، ! ــــــــــــــ ارے ہاں نازو، !"

نازو اس کی طرف دیکھنے لگی ․!

وہ بولی :

"پگلی، ــــــــــــــ ہم لوگ آئے کس لیے تھے، اور کرنے کیا لگے ــــــــــــــ کچھ یاد ہے ؟"

وہ بولی :

"بالکل نہیں یاد، ــــــــــــــ لیکن کوئی بات تھی تو، جس کا پروگرام

لیکن، کوئی ایسا کام نہیں کر پائیں گے کہ سرفراز ہوں، اور بھائی صمصام کی طرح گردن اکڑا کر چلیں، !"

صمصام نے کہا :

" یہ بدعادت تو مجھ میں نہیں ہے، ——— لیکن تم خفا بیکار ہوتی ہو، اصل بات یہ ہے کہ دماغ متّن ہیں اور زبان مَیں، زبان چلتی رہتی ہے، لوہا منوا لیتی ہے، دماغ کیا کام کرتا ہے اسے نہ کوئی دیکھتا ہے، نہ جانتا ہے، !"

متّن نے صمصام کی پیٹھ ٹھونکتے ہُوئے کہا :

" یہ ہے سب سے بڑا انعام جو مجھے ملا، !"

صمصام نے زمرّد سے کہا :

" اور پھر ہم دونوں، الگ الگ کب ہیں، ایک ہیں، ——— بالکل ایک !"

نازو نے سر پہ دوھتڑ مارتے ہوئے کہا :

" خدا کے لیے یہ سلسلہ اب بند کرو، میرے سر میں تو درد ہونے لگا، !"

جو تم منوانا چاہو، اور میں انکار کر دوں ؟ بر جبیں قدر کا بھی یہ حال ہے، کبھی ایک خالہ کو یاد کرتا ہے کبھی دُوسری کو، !"

نازو نے پُوچھا :

"مجھے زیادہ یاد کرتا ہوگا ؟"

زمرّد بولی :

"بڑے ان میں سرخاب کے پَر لگے ہیں، ! ——— مجھے زیادہ یاد کرتا ہے، !"

حضرت محل ہنس پڑی !

"پھر لڑنا شروع کر دیا تم لوگوں نے ؟"

بناکر ہم آئے تھے، !"

زمرّد نے یاد دلایا :

" ارے پگلی شاہزادے کی سالگرہ ، !"

نازو کھل گئی ، !

" ہاں خوب یاد دلایا (حضرت محل سے مخاطب ہوکر) بھئی اب شاہزادے (برجیس قدر) کی سالگرہ کے دن آرہے ہیں !"

حضرت محل نے بے پروائی سے کہا :

" ہاں ، ——————

وہ بولی :

" اس مرتبہ سالگرہ اس کی دونوں خالائیں ، ——————یعنی ، مَیں اور نازو منائیں گی ، !"

حضرت محل مُسکراتی ہوئی بولی :

" پہلے تم لوگ لڑ تو لو جی بھر کے ، پھر یہ معاملہ بھی طے کر لینا ، ؟"

نازو چیخی :

" زمرّد معاف کردے مجھے ، ——————کردیا ؟"

وہ ہنستی ہوئی بولی :

" ہاں پگلی کردیا ، !"

نازو نے حضرت محل سے کہا :

" لیجئے ، ہم دونوں کی صلح ہوگئی ، —————— یادرہے یہ تقریب ، صرف ہم دونوں کے ذمّے رہے ، !"

وہ اکتاتی ہُوئی بولی : " اچھا بھئی اچھا ، ——————کون سی بات ہے

صمصام الدّولہ کہنے لگے :

" حضرتِ عالیہ ، ——————— بات بھی ایسی ہی ہے کہ انھیں دل گرفتہ ہونا چاہیئے ، ! "

حضرت محل نے پوچھا :

" کسی خاص بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں آپ ؟ "

صمصام الدّولہ نے کہا :

" جی ہاں ، ——————— ایک طرف تو نواب علی نقی خاں ، جو حضرت جانِ عالم کا خُسر بھی ہے ، بغلی گھونسا بنا ہُوا ہے ، ——————— دُوسری طرف ریذیڈنٹ کی مداخلت بڑھتی جا رہی ہے ، اور چوتھی طرف ، گورنر جنرل اب مذہبی امُور میں بھی ٹانگ اڑانے لگا ہے ، ! "

" ہاں ، یہ سب باتیں میں جانتی ہوں ، ——————— لیکن ، ان کا تدارک بھی ہے کچھ ؟ "

" کیوں نہیں ہے ؟ "

" تو وہ کرتے کیوں نہیں آپ لوگ ؟ "

" ہم لوگ تو اپنی سی کر رہے ہیں ، جان ہتھیلی پر لیے پھر رہے ہیں ، لیکن حالات اتنے بگڑ چکے ہیں کہ ان کا سنبھالنا آسان نہیں ، ! "

" یہ نہ کہیئے ، حالات بڑی آسانی سے سنبھالے جا سکتے ہیں ! "

" مثلاً کس طرح ؟ "

" فوج میں اضافہ کر کے ، زیادہ سے زیادہ مقدار میں اسلحہ خرید کے ، فوج کو اعلیٰ تربیّت دے کے ، ! "

" حضرتِ عالیہ آپ یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ یہ باتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہیں ؟ "

(۱۲)

تھوڑی دیر تک ان سہیلیوں میں اس طرح کی چُہلیں ہوتی رہیں، پھر نواب منّن خاں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا :

" اس مرتبہ کی مجلس بہت کامیاب رہی ،!"

حضرت محل نے کچھ اشتیاق کے ساتھ پُوچھا :

" سُنا تو مَیں نے بھی ہے، ———— لیکن کیا واقعی ؟"

صمصام الدّولہ کہنے لگے :

" میرانیس کی آمد سے جان عالم بہُت خوش ہوئے ،!"

حضرت محل نے کہا :

" واقعی ، اُن کا آنا بڑی بات ہے ، ———— لیکن کیا جان عالم کا تکدّر رفع ہُوا کچھ ؟"

صمصام الدّولہ بولے :

" ہاں کسی حد تک ، ———— واقعہ یہ ہے کہ جان عالم بہُت دل گرفتہ ہیں ،!"

حضرت محل نے کہا :

" یہی مَیں بھی محسوس کرتی ہُوں !"

اس گفتگو کے دوران میں برجیس قدر دوڑتا ہُوا آیا، ماں کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ پیار کیا، اور پیار کرایا۔ پھر اس سے اپنی مصنوعی بندوق لے کر کھیلنے چلا گیا، اس کے جانے کے بعد حضرت محل نے آج کا سارا واقعہ سنایا، اور کہنے لگی:

"صاحبزادے کے جذبے اور جوش کا یہ عالم ہے، خدا خیر کرے۔!"

مٹّن خاں نے کہا:

"یہ تو بڑی اچھی علامت ہے!"

صمصام الدّولہ نے تائید کی۔!

"ہمارے مستقبل کے بادشاہ میں یہی جذبات ہونے چاہئیں۔!"

"لیکن اگر مستقبل کے بادشاہ نے قبل از وقت لڑکپن سے مجبور ہو کر راز افشا کر دیا، تو سب کھیل دھرا رہ جائے گا، مَیں نے تو اس سے عہد لے لیا ہے کہ اس طرح کی باتیں کبھی زبان پر نہیں لائے گا۔!"

"اور ہو تو یہ معافی اس وقت اسی کی مانگی جا رہی تھی؟"

"(مسکرا کر) ہاں۔ ——————"

"خدا نظرِ بد سے بچائے، یہ فہم اور یہ ذہانت اس عُمر کے لڑکوں میں کہاں؟"

"وہ تو مَیں بھی جانتی ہُوں، لیکن کہیں یہ فہم اور ذہانت کسی وقت بلائے جاں نہ بن جائے ہم سب کے لیے۔؟"

"پھر اس سلسلے میں کوئی قدم اب تک کیوں نہیں بڑھایا گیا؟"

"معاہدات، ———"

"یعنی از رُوئے معاہدات ہم ایسا نہیں کر سکتے؟"

"جی ہاں، ——— اور اگر جانِ عالم کی طرف سے عہد شکنی ہوتی تو انگریزوں کو موقع مل جائے گا، اور وہ چڑھ دوڑیں گے!"

"اس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ کچھ نہیں ہو سکتا؟"

"بس وہی ہو سکتا ہے جو ہم لوگ کر رہے ہیں، صرف اسی طرح لاٹھی ٹوٹے بغیر سانپ مر سکتا ہے، ——— ہماری خفیہ تحریک انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگی،!"

○

کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے حضرت محل نے کہا :

"اچھا میری ایک تجویز پر تو آپ لوگ غور کریں ؟"

صمصام الدولہ نے ادب کے ساتھ عرض کیا :

"ارشاد ——————"

حضرت محل نے اسی عالم تفکّر میں کہا :

"یہ تو ٹھیک ہے موجودہ حالات میں ہم انگریزوں سے سربر نہیں ہو سکتے۔ !"

"بجا ارشاد ہُوا۔ !"

"اور یہ بھی درست ہے کہ موجودہ حالات میں، جو خفیہ تحریک آپ دونوں نے جاری کی ہے، وہی بہترین راہِ عمل ہے۔ !"

"درست، بجا۔ !"

"لیکن ایک کام تو ہو سکتا ہے ؟"

"کیا ؟ کون سا کام ؟"

"جو تھوڑی بہت فوج ہماری ہے اس میں انقلابی جذبات پیدا کیے جائیں، اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کیے جائیں، اس میں ولولہ پیدا کیا جائے کہ وقت آنے پہ بادشاہ کے لیے کٹ مرنے کو تیار ہو جائیں، ملک کے دفاع میں جان لڑا دیں اور اگر دشمن کو کو خود نہ قتل کر سکیں تو اپنی گردنیں کٹوا دیں ——————— نواب صاحب، کچھ بھی ہو، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، یہ

"انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا، اور اگر ہُوا تو ہم سنبھال لیں گے،!"

اتنے میں کسی کام سے پھر برجیس قدر آگیا، صمصام الدّولہ نے اُسے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا:

"بیٹے آج تم نے کتنے دشمن ہلاک کیے؟"

برجیس قدر نے ماں کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا، پھر کہنے لگا:

"ہمارا کوئی دشمن نہیں ہے،!"

مَمّن خاں نے کہا:

"یہ تو نہ کہو بیٹے، دشمن تو بُہت ہیں،!"

بے ساختہ برجیس قدر کے منھ سے نکلا:

"وہ دشمن غیر نہیں ہیں،؟"

"پھر؟ —— پھر کون ہیں؟"

"ہم خود اپنے دشمن ہیں، ہمارے نمک خوار ہمارے دشمن ہیں!"

صمصام الدّولہ نے کلیجے سے لگایا، اور کہا:

ماشاء اللہ، چشم بد دُور، کتنی سچّی بات کی ہے،!"

حضرت محل نے فخر کی نظر سے بیٹے کو دیکھا، اور مسکرانے لگی،!

حضرت محل کی آنکھوں سے آنسوؤں کی تراوش دیکھ کر نازو اُس سے لپٹ کر رونے لگی، ——— زمرّد بھی گریۂ بے اختیار پر مجبور ہوگئی، ——— اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شہزادہ برجیس قدر بھی ماں کی گردن میں بانہیں ڈال کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔!

ممّن خاں اور صمصام الدّولہ پر بھی تاثر کی عجیب کیفیت طاری تھی۔

نازو نے برجیس قدر کو گود میں لے لیا، اور کہنے لگی:

"میرے لال روتے نہیں!"

وُہ روتے روتے بولا:

"امّی حضور جو رو رہی ہیں، مَیں ان کا رونا نہیں دیکھ سکتا،!"

وہ اسے تھپکتی ہوئی بولی:

"وہ رو کب رہی ہیں، اُن کی آنکھوں میں کچھ پڑ گیا تھا، اس لیے آنسُو نکل آئے، بھلا کوئی ملکہ بھی روتی ہے؟"

برجیس قدر نے جرح کرتے ہوئے کہا:

"آپ بھی تو رو رہی تھیں؟ (زمرّد کی طرف اشارہ کرکے) ——— یہ خالہ بھی رو رہی تھیں،؟"

وقت آنے والا ہے اور شاید ہم سب کی توقع سے پہلے ہی آجائے گا۔؟"

صمصام الدولہ نے بڑے غور سے حضرت محل کی باتیں سُنیں، پھر کہنے لگا :

"حضرتِ عالیہ کا ایک ایک لفظ حقیقت کی تصویر ہے، اور موتیوں میں تولنے کے قابل ہے لیکن شاید آپ کو نہیں معلوم، ہماری مختصر سی فوج پُورے طور پر انگریزوں کی نگرانی اور ماتحتی میں ہے، معاہدے کی پہلی دفعہ یہی ہے، اور وہاں پرندہ پَر نہیں مار سکتا، ورنہ ہم نے اپنا لٹریچر خفیہ ذرائع سے وہاں پہنچانے کی کئی مرتبہ کوشش کی تھی!"

مٹّن خاں نے مزید تصریح کی :

"اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔!"

بے بسی کے ساتھ حضرت محل نے کہا :

"ہم اپنی فوج سے بھی کام نہیں لے سکتے؟"

"فی الحال، بے شک نہیں لے سکتے!"

حضرت محل نے کوئی جواب نہیں دیا، ——————— لیکن اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا ہونے لگی۔!

حالاں کہ بیوگی کی زندگی، اور شوہر پرستی کی زندگی گزارنے کے فضائل و مناقب پر، بڑی لمبی چوڑی تقریریں کیا کرتے تھے، مگر زمرّد نے کبھی توجہ سے یہ غیر ضروری باتیں نہیں سُنیں، اس کان سُنتی، اس کان اڑا دیتی، ——— پھر بھی نواب صاحب جہاں تک شاہ ذی جاہ، اور سلطنت کے تحفظ و دفاع کا تعلق تھا، صدقِ دل سے جان، ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے۔!

زمرّد کی ان باتوں سے، ——— پہلے تو اُن پر سکتہ سا طاری ہو گیا، پھر کہنے لگے:

"کہو تو ابھی، اپنے ہاتھ سے گردن کاٹ کر رکھ دُوں، حضرتِ عالیہ کے قدموں پر،!"

نازو نے دزدیدہ نظروں سے صمصام الدّولہ کی طرف دیکھ کر،

"حضرت عالیہ کو بھیڑ بکری کی گردن نہیں چاہیئے، ان کے قدموں پر تو شیروں کی گردن چاہیئے،!"

صمصام الدّولہ نے اُلجھتے ہوئے سوال کیا:

"خواہ مخواہ حضرتِ عالیہ کے قلبِ نازک کو اور صدمہ پہنچا رہی ہو، آخر ان احمقانہ باتوں سے حاصل کیا؟"

وہ تُنتلاتی ہُوئی بولی:

"احمقانہ باتوں سے حاصل کیا؟ ——— آقا پر جان دے دینا، حماقت ہے؟"

نواب صمصام الدّولہ نے کہا:

"تو اس سے کیسے انکار ہے؟"

"تمھیں، ——— بس زیادہ میری زبان نہ کُھلواؤ،!"

نازو نے پھر پیار سے اُس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا :

" بیٹے ، قاعدہ ہے ، کہ آنسُو دیکھ کر، آنسُو نکل ہی آتے ہیں ، ورنہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں رو رہا ، ! "

پھر اس نے بڑی خشمگیں نظروں سے صمصام الدولہ کی طرف دیکھا ، اور کہا :

" تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو ؟ "

وہ بے چارہ اس بے تُکے سوال پر چکرا گیا ، !

کہنے لگا :

" مَیں بیٹھا کیا کر رہا ہُوں ؟ "

زمرّد نے بھی طنز کا تیر پھینکا ، اور گویا ہوئی :

" یہ (صمصام الدّولہ) ہوں ، یا وہ (متّن خاں) سب باتوں کے شیر ہیں ، کسی سے کچھ نہیں ہو سکتا ، ! "

متّن خاں جھینپ سے گئے ، !

سوال کیا :

" آخر کیا کریں ہم ؟ "

صمصام الدّولہ نے متّن خاں کی ہم نوائی کرتے ہُوئے کہا :

" عجب مبہم مطالبہ ہے ، آخر ہم کیا کر سکتے ہیں ؟ "

زمرّد بگڑ کر متّن خاں سے بولی :

" مر بھی نہیں سکتے ، ؟ "

متّن خاں نے جب سے زمرّد سے شادی کی تھی ، ــــــــــــــ موت سے بہت ڈرنے لگے تھے ۔ یہ فکر دامن گیر رہتی تھی ، ہم تو گوشۂ قبر میں جا سوئیں گے ، اور یہ محبوبۂ طنّاز ، بیوگی کی زندگی تو بسر کرنے سے رہی ، ضرور کسی نہ کسی کا گھر آباد کرے گی ،

"خفیہ تحریک کی۔ —— یہ تحریک دم توڑ دے گی۔!"

حضرت محل نے نازو کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا :

"نواب صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ لوگ جس طرح کام کر رہے ہیں، وہی ٹھیک ہے، ہمیں اس میں مداخلت نہ کرنی چاہیئے، —— خدا کو منظور ہے، تو اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا، !"

صمصام الدّولہ نے نازو کو چھیڑتے ہوئے کہا :

"اب فرمائیے کیا ارشاد ہے ؟"

وہ بے پروائی سے بولی :

"میں نہیں جانتی، !"

پھر برجیس قدر کے لیے جو تحفے لائی تھی وہ ڈھیر کر دیئے اُس کے سامنے !"

◎

"آخر کیا کروں میں ؟"

"ان انگریزوں کو مارو، جو ہماری فوج پر چھائے ہوئے ہیں ——— اور ہماری فوج کے لوگ نہ آسمان سے اُترے ہیں، نہ آسمان پر رہتے ہیں، اِسی خاک سے پیدا ہوئے ہیں، یہیں ان کے گھر ہیں، بال بچّے ہیں۔ ان سب کو اُنھوں نے چھوڑ نہیں دیا ہے، ——— کیا چھاؤنی کے علاوہ کہیں اور اُن سے رابطہ نہیں پیدا کیا جاسکتا ؟ چلے ہیں بڑے وہاں سے افلاطون بن کر۔!"

متّن خاں نے صمصام الدّولہ سے کہا :

"یار، ——— بات تو ٹھیک ہے، واقعی ہم لوگ احمق ہیں کہ اس طرف دھیان ہی نہیں گیا، ؟"

صمصام الدّولہ نے جل کر کہا :

"تمھاری حماقت شک وشبہ سے بالاتر ہے !"

"جی بے شک، !"

"ان فوجیوں سے اگر نجی طور پر رابطہ پیدا کیا جائے، اور ان میں سے کوئی ایک بھی انعام کے لالچ میں، یا خوف ودہشت کے باعث راز افشا کر دے، تو کیا ہوگا، ؟"

نازو جل کر بولی :

"جان جائے گی، پکڑے جاؤ گے، اور سُولی دے دی جائے گی، اس کے لیے تم بہادروں میں سے کوئی تیار نہیں ؟"

صمصام الدّولہ نے سمجھاتے ہوئے کہا :

"ہمیں اپنی جان کی پروا نہیں ———"

"پھر کس کی جان کی پروا ہے ؟"

گیا دورِ سُلطان و خاقاں گیا، !

(ا)

علی نقی خاں نے جو "تحقیقاتی کمیٹی" صاحب ریذیڈنٹ بہادر کے ایماء پر بنائی تھی، اس میں چُن چُن کر اپنے آدمی رکھے۔ اور ان میں ہندو بھی تھے،[1] اور مسلمان بھی۔

یہ کمیٹی کئی ہفتے تک چھان بین کرتی رہی، اسی اثناء میں، بادشاہ سلامت نے، مولوی سیّد امیر علی کو اپنے حضور میں طلب کیا، وہ تشریف لائے، اس مُلاقات کا ذکر سیّد صاحب کے ایک رفیق طریق مرزا جان نے اپنی کتاب میں کیا ہے،!

وہ لکھتے ہیں:

سیّد صاحب جب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے:

"انھوں نے پہلے کشتیِ خلعت منگائی، پان سو روپے کی تھیلی ساتھ آئی، در گفتگو باز ہوا، نواب صاحب (شاہ واجد علی شاہ) نے فرمایا:

"خلعت پہنیے، روپیہ لیجیے، چندے بسر کیجیے، عنقریب بہ شرط ثبوت تعمیرِ خانۂ خدا ہو جائے گی،!"

امیر المجاہدین نے جواب دیا:

"ہم لوگ خدا کی راہ میں جان پر کھیلے ہُوئے ہیں۔ ہمیں خلعت اور انعام سے کیا کام؟ اس خلعت کا بیہ کا انعام ہے۔ ہم کہیں کے عامل نہیں، چکلے دار نہیں، مصاحب نہیں، سپہ سالار

---

[1]: افضل التواریخ (رام سہائے)

سمجھتے ہیں ، مَیں ایک ہفتہ انتظار کر لیتا ہُوں !"

" (خوش ہو کر) یہ مدّت بہُت کافی ہے۔ ہم علی نقی خاں کے نام آج ہی فرمان صادر کرتے ہیں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر رپورٹ ہم تک پہنچ جائے ، !"

امیر المجاہدین وہاں سے اپنے کیمپ میں آئے ، ———— حاجی بشیر الدّولہ جو کہ مذہب اثنا عشری رکھتے تھے ، عام شیعوں کی طرح وہ بھی اس معاملے میں سیّد صاحب کے ساتھ تھے ، دن بھر میں دس گیارہ مرتبہ خیر مزاج منگواتے تھے ۔

اکثر فرمایا کرتے تھے :

" خدا اسلام کی آبرو رکھے ، دین کی دھوم چار سُو رکھے ، !"

اس حادثے کا ایسا ملال تھا کہ نہ کچُھ کھاتے تھے ، نہ پیتے تھے ؎ !

بادشاہ سے ملاقات کے لیے جب سے امیر المجاہدین تشریف لے گئے تھے ، حاجی بشیر الدولہ کیمپ ہی میں رونق افروز تھے ، جب وہ تشریف لائے تو پُوچھا :

" کیا بندہ حضور سے یہ دریافت کرنے کی جسارت کر سکتا ہے کہ بادشاہ سلامت سے کیا گفتگو ہُوئی ؟"

امیر المجاہدین نے ساری گفتگو بیان کر دی ، !

حاجی بشیر الدّولہ نے کہا :

" امّید ہے کہ اب انشاء اللہ کام بن جائے گا ، !"

امیر المجاہدین نے فرمایا :

" لیکن میرے دل میں ، اگرچہ مَیں نے بادشاہ کی بات مان لی ہے ، کھٹک سی ہو رہی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ ہونے والا ہے ، !"

حاجی صاحب نے فرمایا : " غیب کا علم تو صرف خدا کو ہے ، لیکن بندہ اتنا عرض کر سکتا

؎ : حدیقۂ شہداء

نہیں، خلعت لے کر کیا کریں؟ کیوں آپ کو رُسوا کریں؟ یہ خلعت اور انعام نہیں، دُنیا کے لیے دین سے چشم پوشی ہے۔ ہمارا خلعت یہ ہے کہ رخصتِ جہاد ہو، اجازتِ سفر خلد آباد [1] ہو، [2]۔"

بادشاہ نے کہا:

"یہ اجازت ضرور ملے گی، لیکن ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد۔!"

امیر المجاہدین گویا ہوئے:

"ثبوت کس چیز کا؟"

"مسجد کا! ——— آیا وہ متنازعہ جگہ مسجد ہے بھی یا نہیں؟"

"یہ وقت گزاری کی باتیں ہیں، ہزاروں نے اس مسجد کو دیکھا ہے، سینکڑوں ہر روز دیکھتے رہتے ہیں، " آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔!"

"لیکن اقدام و عمل سے پہلے ہمیں ضروری کارروائی کرنا لازم ہے۔ ہم نے علی نقی خاں کو اس کام پر مامور کر دیا ہے، اس کی رپورٹ آنے کے بعد ہم فیصلہ صادر کر دیں گے!"

"کیا آپ چاہتے ہیں میں عزمِ جہاد ملتوی کر دوں؟"

"صرف چند روز کے لیے!"

"مجھے یقین ہے مسجد کے وجود کا ثبوت مل جائے گا، اگر مل گیا؟"

"تو حکومت آپ کی پُشت پناہ ہوگی، ——— ہماری فوج آپ کے ساتھ ہوگی، خانۂ خدا کی حرمت پر، اور اُس کے دفاع و تحفظ پر جان قربان کر دینا، ہم فخر سمجھتے ہیں۔!"

"آپ بادشاہ ہیں، ذی جاہ ہیں، سلطان ہیں، والا شان ہیں، اور بے شک، آپ

---

[1]: یعنی اجودھیا،

[2]: حدیقۂ شہداء (مرزا جان)

علی نقی خاں کو رپورٹ مل گئی ! ۔

لیکن بہ حسب دل خواہ نہ تھی ،

تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے جو مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیانات ہوئے، مسلمانوں کا یہ بیان تو تھا ہی کہ یہاں مسجد تھی بھی اور ہے ، ! ——————— لیکن بعض ہندوؤں تک نے یہی بیان دیا [1] ،

علی نقی خاں نے یہ رپورٹ دبالی [2] !

اور ایک دوسری تحقیقاتی کمیٹی بنائی ، جس کے رکن کپتان قائم جنگ راجہ مان سنگھ ——————— بانئ فساد ، اور مدعا علیہ ——————— اور تہور علی رسالدار تھے ، اس کمیٹی نے جھٹ پٹ رپورٹ پیش کردی کہ مسجد کا وجود مشتبہ ہے ، بیانات

---

[1] : چھیدی لال :

" بارہا مسجد را بہ چشم خود دیدہ ام "

وصنی سنگھ :

" برھنو مان گڑہی رفتہ بودم مسجد واقع ھنو مان گڑہی بہ چشم خود دیدہ ام "

(حدیقۂ شہداء)

[2] : افضل التواریخ (رام سہائے)

ہے کہ بادشاہ سلامت نے آج تک جھوٹ نہیں بولا، اور چونکہ وہ خود بھی مذہبی آدمی ہیں، اس لیے، اس باب میں ان کا جذبہ وہی ہے جو ایک عام مسلمان کا ہونا چاہیئے، اور ہے، !"

پھر حاجی صاحب نے وہ گفتگو دوہرادی جو جنرل اوڈرم سے اور بادشاہ سے ہوئی تھی، اور فرمایا :

"گفتگو کی یہ رپورٹ اس لیے صحیح ہے کہ جس آدمی نے مجھے یہ تفصیل بتائی، وہ اس گفتگو کے وقت موجود تھا، اور میرا دیرینہ دوست ہے، اور اس کے بارے میں میرا تجربہ یہ ہے کہ اس نے کبھی کوئی غلط رپورٹ مجھے نہیں دی !"

◎

"وہ کیا ؟"

"وہ یہ کہ : "رپورٹ بادشاہ کے سامنے پیش کی جائے، اس کے بعد ان کا سارا جوش سرد ہو جائے گا۔ ہم آسانی سے اجازت لے لیں گے کہ امیر علی کے جہادی لشکر کو غارت کر دیا جائے!"

"یقیناً، یقیناً، بہت مناسب رائے ہے!"

"لیکن آپ کا تعاون ضروری ہے، !"

"ہم ہر طرح سے تعاون کو تیار ہیں!"

"میں چاہتا ہوں یہ رپورٹ آپ کے سامنے، بادشاہ کی خدمت میں پیش کروں، اور ان سے امیر علی کے خلاف حکم حاصل کر وں!"

اس سے کیا فائدہ ہوگا ؟"

"بڑی مصلحت ہے اس میں!"

"کل ہم گورنر جنرل کا ایک پیغام لے کر بادشاہ کے پاس جانے والے ہیں۔ اسی وقت تم بھی آجاؤ، سارا معاملہ ہمارے سامنے طے ہو جائے گا، !"

"میری یہی خواہش ہے!"

دوسرے روز جنرل اوٹرم صاحب بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ گورنر جنرل کا پیغام دیا، خیریت مزاج پوچھی، اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، ——— اتنے میں علی نقی آگیا، !

اسے دیکھتے ہی اوٹرم صاحب نے کہا :

"نواب صاحب، وہ آپ کی تحقیقاتی کیٹی کیا ہوئی ؟ یہاں خون خرابے کا اندیشہ بڑھتا جارہا ہے، اور آپ کا کام ختم نہیں ہوتا ؟"

علی نقی خاں نے کہا : ——— "میرا کام ختم ہوگیا، رپورٹ

سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کبھی مسجد نہیں تھی [1]

علی نقی خاں دونوں رپورٹیں لے کر جنرل اوٹرم ریذیڈنٹ کے پاس گیا۔

پہلی رپورٹ پڑھ کر، اوٹرم چکرا گیا، اس نے کہا :

"ہندو تک شہادت دے رہے ہیں کہ یہاں مسجد تھی؟"

"جی ہاں، ———"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"جو ارشاد ہو۔۔!"

"کمپنی بہادر موجودہ حالات میں ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتی اور اس رپورٹ کی روشنی میں تو خون خرابہ ہوکر رہے گا۔!"

"جی ہاں اندیشہ تو ہے!"

"تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"ضرور کر سکتا ہوں، ارشادِ عالی کی دیر ہے۔!"

"جو کچھ تمھارے بس میں ہو بے تامل کر گزرنا چاہیئے!"

علی نقی خاں نے یہ سن کر کہا :

"پہلی رپورٹ، جو ابھی آپ نے ملاحظہ فرمائی، مَیں نے دبالی، اور دوسری تحقیقاتی کمیٹی قائم کی ہے جس کی رپورٹ یہ ہے!"

یہ کہہ کر رپورٹ اوٹرم صاحب کے سامنے رکھ دی۔

جنرل اوٹرم نے وہ رپورٹ پڑھی، مسکرائے، اور فرمایا :

"اب تو کام بن گیا۔!"

"بس ذرا سی کسر ہے!"

---

[1] : تاریخ اودھ   دوسری کتابوں میں بھی یہ واقعہ مرقوم ہے۔

بھی معقولیت ہے تو مان جائیں گے ؟"

"جانِ عالم اصل دشواری تو یہی ہے کہ ان میں ذرا بھی معقولیت نہیں ہے !"

"پھر بھی اپنی طرف سے اشتعال نہ پیدا کیجیے۔ اگر وہ عزمِ جہاد سے باز نہ آئیں تو شاہی فوج اُن کی ناکہ بندی کر لے، اور راستہ روک لے، لیکن ہم اسے پسند نہیں کرتے کہ ان لوگوں کو قتل کیا جائے، !"

اوٹرم صاحب نے علی نقی خاں سے کہا :

"جانِ عالم بالکل بجا فرماتے ہیں، ایسا ہی ہونا چاہیئے، !"

آگئی ہے ،!"

بادشاہ نے اشتیاق کے ساتھ سوال کیا :

" کہاں ہے وہ ؟ ہماری خدمت میں پیش کیوں نہیں کی گئی ،؟"

علی نقی خاں نے نہایت ادب کے ساتھ وہ رپوٹ پیش کردی ، بادشاہ نے بنگاہِ غور اس کا مطالعہ کیا ، اور فرمایا :

" پھر تو جہاد کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ؟"

" بالکل نہیں ہوتا جانِ عالم ، لیکن مولوی امیر علی امیر المجاہدین بننے کے شوق میں جہاد پر تلے ہوئے ہیں ،!"

" غلط ——— انھیں جہاد کی اجازت نہیں دی جاسکتی ،!"

" بجا ارشاد ہُوا ،!"

" انھیں اس رپورٹ کے مندرجات سے آگاہ کردیجیے ، اور ہماری طرف سے پیغام پہنچا دیجیے کہ اب اس معاملے کو ختم کردیں ، کیوں کہ ہندو بھی ہماری رعایا ہیں ، اور وفاداری میں مسلمانوں سے کم نہیں ہیں ،

" جی ، بے شک ، بے شک !"

" ہم ہرگز اسے پسند نہیں کرتے ، حکومت چونکہ مسلمان ہے ، اس لیے ان پر ظلم ہو ،!"

اوٹرم صاحب نے کہا :

" یہ بات صرف جانِ عالم جیسا غیر متعصب ، اور انصاف پسند شخص ہی کہہ سکتا ہے ،! نواب صاحب اب آپ مولوی امیر علی کو کچل دیں ،!"

" اس کی بھی ضرورت نہیں ،!"

" پھر عالی جاہ ؟"

" یہ رپورٹ دے کر انھیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کیجیے ، اگر ان میں ذرا

چلیں، یکایک یارلو نے فائر کرنے کا حکم دے دیا، گولی چلنے لگی، مولوی صاحب زخمی ہوئے، لیکن مجاہدین کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اسی اثناء میں کمیار کے تعلقہ دار ٹھاکر سنگھ کے آدمی مجاہدین کے عقب سے وارد ہوئے، ظہر کے وقت لڑائی شروع ہوئی تھی، شام تک جاری رہی، پانچ سو ہندو قتل ہوئے۔ مسلمان بھی لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ ان شہیدوں میں امیرالمجاہدین مولوی سید امیر علی بھی تھے۔ قتل کے وقت مولوی صاحب کا سرالگ گرا، دھڑ جدا گرا [1]، راجہ کمیار نے میدان چھوڑنے والوں کا تعاقب کیا، اور چُن چُن کر قتل کیا، مولوی صاحب کے ہاتھ سے تلوار جُدا نہ ہوتی تھی، لہٰذا کلائی کو ہاتھ سے کاٹ دیا، ریذیڈنٹ کے حکم سے لاش قصبۂ جنہٹ میں لب تالاب دفن کردی گئی [2] کپتان بارلو کے حکم سے راجہ شمشیر بہادر کے آدمیوں نے دس کوس تک مجروحین کا تعاقب کیا، اور جو جہاں ملا، اسے شہید کر ڈالا، صرف میر عباس کوتوال لشکر بہ صد دقت جان بچا کر گھر پہنچے

---

[1] : اس قتل کی تاریخ یہ ہے :

گفت از روے ہمت ازلی

قتل شد مولوی امیر علی ،

۱۲۷۲ھ

مولوی صاحب نے شہادت سے متعلق خود ہی اپنی تاریخ وفات بھی کہی تھی ،

بہ ذکرِ حق سراپا گوش دارم

مے ، مہرِ علی در جوش دارم ، !

شنو تاریخ من قبل از شہادت

سرمیداں ، کفن بر دوش دارم

۱۲۷۲ھ (نقش سلیمان)

[2] : افضل التواریخ (رام سہائے)

(۳)

علی نقی خاں کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ امیرالمجاہدین سے ملتا، یا ان کی خدمت میں اپنی مصنوعی رپورٹ پیش کرتا، البتہ اس نے یہ پیغام بھیج دیا کہ :

"جانِ عالم اس رپورٹ سے مطمئن ہیں، اور ہرگز پسند نہیں کرتے کہ مسلمانوں کا کوئی گروہ اجودھیا کی طرف جائے۔"

مولوی صاحب نے اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ کا فرمان سن کر بہت سے لوگ لشکر چھوڑ چکے تھے، پھر بھی جو آدمی رہ گئے تھے وُہ جان دینے کو تیار تھے۔ بچے کچھے لشکر میں کُوچ کا نقارہ بجا، شاہی فوج نے روکنا چاہا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لکھنؤ شہر میں تشدد کی پالیسی پر عمل بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دریاباد میں ڈاک بنگلے کے قریب لشکرِ مجاہدین نے پڑاؤ کیا، نماز جماعت کے ساتھ ہوتی تھی جس میں بہ تعدادِ کثیر شاہی لشکر کے افسر اور سپاہی شریک ہوتے، اور سید صاحب کی امامت میں اُن کے پیچھے نماز پڑھتے تھے [1]

ایک طرف مولوی صاحب کی امامت میں نماز، دُوسری طرف ان کے قتل کی تدبیر اور سازش!

۲۶ صفر ۱۲۷۳ھ (۷ر نومبر ۱۸۵۵ء) کے دن مولوی صاحب اپنا "لشکر" لے کر آگے بڑھے، جو اب صرف تین سو ملے آدمیوں پر مشتمل تھا۔ کپتان بارلو نے چار کمپنیوں اور دو توپوں کے ساتھ تعاقب کیا، تین کمپنیاں گلابی پلٹن کی، حاجی مرزا حسین کی ماتحتی میں

---

[1] : قیصر التواریخ ۱؛

[2] : تاریخ اودھ ،

(۴)

امیر المجاہدین کا حادثۂ شہادت ایسا نہیں جو یُوں ہی بالا بالا گزر جاتا، پورے اودھ میں عام طور پر اور شہر لکھنؤ میں خاص طور پر کہرام مچ گیا، شیعوں اور سُنّیوں کی طرف سے متفقہ اور متحدہ مظاہرے ہُوئے اور احتجاج کیا گیا۔ بادشاہ سے بھی یہ خبر کب چھُپی رہ سکتی تھی۔ انھیں بھی اس کی اطلاع ملی، یہ خبر سُنتے ہی انھوں نے ہاتھ ملتے ہُوئے کہا :

"بس اب کچھ نہیں ہو سکتا، !"

منّن خاں اور صمصام پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، منّن خاں نے پُوچھا :

"جانِ عالم کیا نہیں ہو سکتا ؟"

بادشاہ نے کفِ افسوس ملتے ہُوئے جواب دیا :

"اب تباہی اٹل ہے !"

صمصام الدّولہ نے تسلّی اور دل دہی کے لہجے میں کہا :

"خدا نہ کرے جانِ عالم، !"

واجد علی شاہ حسرت و افسوس کے لہجے میں کہنے لگے :

"اودھ کی سلطنت کو تباہ ہونے سے اب کوئی نہیں بچا سکتا، جسے تم جانِ عالم کہتے ہو اس کی بربادی اب یقینی ہے، ————"

منّن خاں سہم گئے، کہنے لگے :

"للّٰہ ایسا نہ فرمائیے، !"

میں کامیاب ہوئے ، بعد میں مولوی صاحب کا مقبرہ بھی بن گیا ، جہاں ہر جمعرات لوگ جمع ہوتے ہیں ، اور مرادیں مانگتے ہیں ، [۱] !

○

[۱] : قیصر التواریخ ،

اس حادثے کی خبر جب دہلی پہنچی ، تو مولوی امام بخش صہبائی نے ایک دلدوز اور طویل مرثیہ لکھا ، جس کے دو شعر ذیل میں درج ہیں :

سیدِ مظلوم را کردند بے دیناں شہید
تُف بہ اہلِ لکھنؤ ، لعنت بہ کارِ لکھنؤ

ہر در و دیوارِ او از شش جہت نفریں کند
بر صغارِ لکھنؤ و بر کبارِ لکھنؤ !

(۵)

کافی دیر تک سکوت کا سناٹا چھایا رہا، پھر بادشاہ نے منّن خاں، اور صمصام الدولہ کو مخاطب کر کے کہا :

"زندگی میں کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں، جب زندگی وبال بن جاتی ہے، ایک ایسا بوجھ جو اٹھائے نہیں اٹھتا، !"

منّن اور صمصام خاموش رہے، کسی نے جواب میں کچھ نہیں کہا، کچھ دیر سکوت کے بعد، بادشاہ نے فرمایا :

"یہ ایسا ہی موقع ہے، ہمیں زندہ رہتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ اگر ہم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ لشکرِ مجاہدین میں شریک ہو کر، مسجد کی حرمت پر جان قربان کر دیتے، تو کم از کم اتنا حوصلہ تو ہونا چاہیئے تھا کہ تختِ حکومت سے دستبردار ہو جاتے، ———"

صمصام اور منّن یہ سنتے ہی لرز گئے، دونوں نے یک آواز کہا :

"جانِ عالم یہ کیا فرما رہے ہیں آپ؟ یہ سلطنت تو آپ کی موروثی ہے، اس سے دستبرداری کے کیا معنی؟"

جانِ عالم نے ایک آہِ سرد کے ساتھ کہا :

"یہ نہ کہو، اگر ہم وراثت کی حفاظت نہیں کر سکتے تو اس کے مستحق بھی نہیں ہیں، ——— کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم حفاظت کرنے میں ناکام رہے؟ کیا صفدر جنگ اور واجد علی شاہ میں کوئی فرق نہیں؟"

بادشاہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا :

"میں تو نوشتۂ تقدیر سنا رہا ہوں ، !"

صمصام الدولہ نے سہگیں لہجے میں پوچھا :

"نوشتۂ تقدیر جانِ عالم ؟"

وہ بولے : "ہاں نواب صاحب ، ــــــ غور تو کیجئے ، اودھ کی حکومت ایک مسلم سلطنت ہے مگر ایک مسجد کو غیر مسلموں کا ہدفِ ستم بننے سے نہ بچا سکی ، اس سلطنت کا فرماں روا ، ایک مسلمان شخص ہے ، اور اپنے مسلمان ہونے پر فخر بھی کرتا ہے ، مگر اتنا بزدل ہے کہ اس موقع پر بھی اپنی جان دینے کی سعادت نہ حاصل کر سکا ، اب فرشتے گرز لے کر بڑھیں گے ، اس فرماں روا کے تکے بوٹی کر دیں گے ، اور اس سلطنت کو فنا کر دینگے ، دونوں نے زندہ رہنے کا حق کھو دیا ہے ، یہی ہونا چاہیئے ، اور بلاشبہ یہ ہو کر رہے گا ، !"

یہ کہتے کہتے جانِ عالم کا گریہ گلوگیر ہو گیا ، اور وہ رونے لگے ، انھیں روتا دیکھ کر مِتن خاں اور صمصام الدولہ کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ، سب کو اپنی بے بسی کا احساس تھا ، اور یہی احساس اس وقت آنسو بن کر آنکھ سے خونِ جگر کی صورت میں ٹپک رہا تھا ، !

◎

کچھ دیر تک غرقِ فکر رہنے کے بعد، صمصام نے عرض کیا :-
" لیکن جہاں پناہ، آپ کی رعایا آپ کو بہت چاہتی ہے۔ وہ آپ کی جُدائی، یا علیحدگی، برداشت نہیں کر سکے گی، !"
جان عالم نے طنز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :
" ہاں صمصام الدّولہ ہماری رعایا ہمیں بہت چاہتی ہے اور ہمارے جانے کے بعد بھی ہمیں چاہتی رہے گی، بس اس کے پاس یہی ایک چاہت کی پُونجی ہے اس کے سوا کچھ نہیں، !"
" کیا اس کے بعد بھی کچھ چاہیئے ؟"
" ہاں، ـــــ ہمّتِ مردانہ، سرفروشی کا جذبہ، مر مٹنے کی آرزو، دلیری، شجاعت، بہادری، ایک عظیم مقصد کے لیے ہر چیز داؤں پر لگا دینے کا حوصلہ، منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی ہر رکاوٹ دُور کر دینے، یا فنا ہو جانے کی سکت، ـــــــــــ
صمصام الدّولہ سے کوئی جواب دیتے نہیں بن پڑا، بادشاہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :
" کیوں صمصام الدّولہ کیا ہماری محبوب اور ہمیں، چاہنے والی رعایا میں یہ اوصاف ہیں ؟"
اس مرتبہ بھی صمصام الدّولہ کا قفلِ سکوت نہیں ٹوٹا، یہ حقائق تھے اور ان کا جواب دینا آسان نہیں تھا، اسے عافیت اسی میں نظر آئی کہ خاموش رہے، لیکن بادشاہ پر اس وقت ایک کیفیت طاری تھی، انھوں نے کہا :
" تمھیں ماننا پڑے گا۔ ہماری رعایا ان اوصاف سے محروم ہے، جس سلطنت کے امراء

"لیکن، ——————

"لیکن ویکن کچھ نہیں، صاف بات یہ ہے کہ ہم میں انگریزوں سے لڑنے کی سکت نہیں! اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم بزدل ہیں، اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی وفادار رعایا کا خون نہیں چاہتے کہ رائیگاں بہے، اس وقت پوزیشن یہ ہے کہ ہم کسی درجے میں بھی فرنگی استعمار کے حریف بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لہٰذا ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ اس ذمّے داری سے جو خدا اور خلق کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہے دست کش ہو جائیں، پھر جو کچھ بھی ہوگا، اس کی ذمّے داری ہم پر نہیں ہوگی، اور ہم اب یہاں رہنا بھی نہیں چاہتے، ارادہ ہے کہ زیارت کو جائیں، اور سرکارِ دو عالمؐ کے قدموں میں اپنی نامراد زندگی کے باقی دن گزار دیں، !"

◎

متن خاں اور صمصام الدّولہ جان عالم کے انتہائی معتمد مصاحب اور جلوت و خلوت کے رفیق تھے ان کے سامنے جان عالم کی زندگی کے شب و روز تھے، جو عبارت تھے، عیش و نعم سے، انھوں نے آج تک بادشاہ کی زبان سے ایسی حکیمانہ، عارفانہ، اور مبنی برحق، باتیں نہیں سُنی تھیں۔ ایک ایک لفظ موتیوں میں تولنے کے قابل، ایک ایک بات آویزۂ گوش بنانے کی مستحق، ایک ایک حرف سچائی، اور بہترین سیاسی تجزیے کا حامل، وہ حیران تھے، اور سوچ رہے تھے :

"کیا واقعی یہ جان عالم ہی فرما رہے ہیں ؟"
لیکن اپنے کانوں کو کس طرح جھٹلا دیتے ؟
اپنی آنکھوں کو کیوں کر مبتلائے فریب سمجھ لیتے ، ؟"

آواز جان عالم کی تھی، لب و لہجہ جان عالم کا تھا، سانچے میں ڈھلے ہوئے الفاظ جان عالم کے تھے، ——— کس کس چیز کی تردید کرتے ؟ کس کس چیز کو غلط فہمی پر محمول کرتے ؟

آخر بہت سوچ بچار کے بعد متن خاں نے عرض کیا :

"جان عالم کے ارشادات، حقائق و معارف کا دفتر ہیں !"

جان عالم نے ذرا تلخی کے ساتھ ارشاد فرمایا :

"متن خاں یہاں مشاعرہ نہیں ہو رہا ہے، نہ میں نے کوئی غزل سنائی تھی، جس کی تم داد دے رہے ہو، ———

عیش و عشرت اور جام و مینا سے سرمست رہتے ہوں، جہاں کے عوام پتنگ بازی، مُرغ بازی، بٹیر بازی اور دوسری بازیوں میں اپنے شب و روز صرف کرتے ہوں، جہاں کے باشندے مذہبی اقدار سے محروم ہو چکے ہوں، جنھیں مسجد کی اذان کے مقابلے میں پازیب کی جھنکار زیادہ پسند آتی ہو وہ کچھ نہیں کر سکتے، وہ صرف اس لیے ہیں کہ موت کا پنجہ ان کی طرف بڑھے، اور ان کی رُوح قبض کر لے!"

ذرا دیر رک کر جانِ عالم نے فرمایا:

"مردوں کے لیے رونا وصف نہیں عیب ہے۔ ان کی شان تو یہ ہے کہ حق، سچائی، اور دین کی سربلندی کے لیے، جب پکار بلند ہو جان و تن کی بازی لگا دیں، لکھنؤ کے اشراف اور فن کاروں، اور لہو و طرب کے رسیا عوام سے تم یہ توقع نہیں کر سکتے، !"

امیرالمجاہدین کی شہادت کے حادثۂ فاجعہ کے بعد سے جانِ عالم نے مجلس آرائی، اور محفل طرازی یکسر بند کر دی تھی، ملنے جلنے کا سلسلہ بھی تقریباً منقطع تھا۔!———— دلچسپ مشاغل سے انھیں نفرت سی ہوگئی تھی، نہ اب نغمہ سرائی سے دلچسپی رہ گئی تھی، نہ رقص سے، نہ ناٹک سے، نہ رہس سے،———— وہ اپنے کمرے میں خاموش بیٹھے رہتے، مقربینِ بارگاہ، حاضر ہوتے، بادشاہ کو خاموش دیکھ کر، اور اپنی کسی بات کا جواب نہ پاکر مایوس اور منفعل واپس چلے جاتے، بادشاہ پر خاموشی کی مہر لگی ہوئی تھی، ہر وقت عالمِ فکر میں غرق رہتے۔!

معلوم ہوتا، کچھ سوچ رہے ہیں،———— لیکن کیا سوچ رہے ہیں؟ یہ کسی کو پتہ نہ چلتا۔!

بادشاہ کی اس کیفیت کا سب سے زیادہ اثر حضرت محل پر تھا، وہ ہر چیز———— برداشت کر سکتی تھی، لیکن بادشاہ کی اس چیز کا برداشت کرنا اس کے بس سے باہر تھا، ایک مرتبہ وہ حاضر تھی، اور بادشاہ سلامت خاموش بیٹھے تھے۔!

حضرت محل نے کہا:

"جانِ عالم اس طرح تو آپ اپنی صحت تباہ کر لیں گے۔!"

بادشاہ نے محبّت بھری نظروں سے حضرت محل کو دیکھا، اور کہا:

متّن خاں بے چارے نے بے بسی کے ساتھ صمصام الدّولہ کی طرف دیکھا، اور نظریں جھکالیں۔!

صمصام الدّولہ نے، اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے عرض کیا:

"ہم لوگوں کا مقصد یہ ہے جانِ عالم کہ اس صورتِ حال کا مداوا تلاش کیا جائے۔!"

جانِ عالم نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فرمایا:

"مداوے کا وقت گزر چکا۔!

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

یہ کہتے کہتے جانِ عالم کی آواز بھرّا آئی۔ !متّن صمصام سے کچھ بولا نہ گیا۔!

"جب تمھاری یہ کیفیت ہے کہ براہِ راست امورِ مملکت کی ذمّہ دار نہیں ہو، تو ہمارا دل خون کیوں نہ روئے؟ ہمارے جگر کے ٹکڑے آنکھوں کے راستے کیوں نہ بہیں؟"

"یہ تو سچ ہے جانِ عالم۔ لیکن آپ کی زندگی بھی تو بڑی قیمتی اور عزیز ہے، وُہ سلامت رہی تو بگڑے ہوئے کام کسی نہ کسی دن سنور جائیں گے۔!"

"ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے حضرت محل، اب حالات بگڑتے ہی جائیں گے، سنور نہیں سکتے۔!"

حضرت محل نے روہانسی آواز میں کہا:

"جانِ عالم، ———"

پھر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رونے لگی۔!

◎

"پھر کیا ہوگا ؟" ———— یہی نا، کہ ہم مرجائیں گے ، سو آرزو یہی ہے البتہ فکر صرف ایک ہے ،

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مرکے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے !

اور حضرت محل ہم سے وہ گناہ ہُوا ہے کہ مرکر بھی چین نہیں پا سکتے ، !"

حضرت محل کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ، اس نے دو پٹّے سے آنسُو پونچھتے ہُوئے کہا :

"ایسا نہ کہیئے جانِ عالم ، آپ کے دم سے کتنے بے آسرا لوگ ہیں ، جنھیں سہارا حاصل ہے کتنے درماندہ اور خستہ حال ہیں ، جو آپ کو دعائیں دیتے ہیں ، اور بے فکری کی زندگی بسر کر رہے ہیں !"

جانِ عالم نے فرمایا :

"تم چاہتی کیا ہو ؟"

وہ بولی :

"میں آپ کو خوش دیکھنا چاہتی ہُوں ۔ ———— ہنسیئے ، بولیے ، دلچسپیوں میں حصّہ لیجئے ، !"

"تاکہ قبر سے روسیاہ ہوکر اُٹھوں ؟"

"ہائے اللہ ، خدا نہ کرے یہ کیا فرمایا آپ نے ؟"

"اتنے مسلمانوں کی شہادت کے بعد ، اور مسجد کے قبضۂ اغیار میں چلے جانے کے بعد ، مجھے خوش رہنے کا حق ہے ، ———— حضرت سچ کہو کیا تم خوش ہو ؟"

"نہیں جانِ عالم ———— میرا دل اس حادثے پر خون رو رہا ہے ، ایک انجانا سا خطرہ محسوس کر رہی ہوں ، !"

منّن خاں اور صمصام الدولہ بھی بہت پریشان ہوئے، اور پاس ہی آ کر بیٹھ گئے۔ صمصام الدولہ کے اضطراب کا تو یہ حال تھا کہ اس کا بدن کانپنے لگا، نازو نے ساری کہانی اوّل سے آخر تک سنا دی، صمصام نے کہا:

"جانِ عالم کے جذبات ایک سچے مسلمان کے جذبات ہیں،!"

منّن خاں نے کہا:

"بے شک، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جانِ عالم کے یہ جذبات اودھ، اور لکھنؤ کے مسلمانوں کی صحیح ترجمانی پر مبنی ہیں۔ ———— سارے ملک میں عام طور پر اور سارے شہر میں خاص طور پر حد درجہ اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص پریشان، بد دل، مایوس، مغموم، اور بے انتہا مشتعل نظر آ رہا ہے۔ مجھے تو آثار اچھے نظر نہیں آتے، نہ جانے کیا ہونے والا ہے، نہ جانے کیا ہو جائے؟"

زمرد چمک کر بولی:

"بس باتیں بہت ہو لیں۔ سوال یہ ہے کہ تم بھی کچھ کر سکتے ہو یا نہیں؟ اگر کچھ نہیں کر سکتے تو کیا جان بھی نہیں قربان کر سکتے اپنے بادشاہ پر؟ میں کہتی ہوں اگر کوئی قتل کرنے کو نہیں ملتا تو خود اپنے گلے پر چھری پھیر لو، حق وفا تو ادا کر و کسی طرح؟"

منّن خاں جذبۂ ایمانی بھی رکھتے تھے، اور جذبۂ رضا بھی، اگر زمرد ان کی بیوی نہ ہوتی تو شاید بڑی آسانی سے جان دینے کو بھی ہمہ وقت آمادہ رہتے۔ اس کمبخت نے شریکِ حیات بن کر ان کے دل میں زندہ رہنے کا ولولہ پیدا کر دیا تھا، موت کا تصور کرتے ہوئے انھیں دہشت ہوتی تھی، پھر بھی اپنے آپ کو بہت سنبھالا، اور کچھ کہنے والے تھے کہ صمصام الدولہ بول پڑے:

"ہم لوگ ایک اسکیم بنا رہے ہیں، ———— ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہیں،!"

(۹)

حضرت محل کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر جان عالم بے قرار ہو جایا کرتے تھے، مگر اس وقت انھوں نے اس کے گریۂ بے اختیار پر کوئی توجہ نہیں کی اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد حضرت محل بھی لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ، اپنی محلسرا میں پہنچی، وہاں نازو نے اس کا یہ رنگ دیکھا تو لپٹ گئی، اور باچشم تر سوال کیا :

"یہ کیا؟ آنکھوں میں آنسو کیسے؟"

حضرت محل نے ساری رُوئیداد سنادی، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نازو نے اسے گلے سے لگایا، پیار کیا، اور کہا :

"گھبراؤ مت، ہم سب جان عالم کے قدموں پر تصدق ہو جائیں گے!"

پھر اس نے ایک قاصد بھیج کر فوری طور پر صمصام الدولہ، منّن خاں اور زمرّد کو طلب کیا۔

یہ لوگ فوراً آ گئے۔ صمصام الدولہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا :

"خیر تو ہے، آخر اس طلبی کا مقصد؟"

نازو نے حضرت محل کی سُوجی ہوئی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

"کیا اب بھی بتانے کی ضرورت ہے؟"

بیک وقت زمرّد، منّن خاں، اور صمصام الدولہ کی نگاہ حضرت محل پر گئی، زمرّد تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی، کہنے لگی :

"میری ہزار جانیں قربان، آخر ہُوا کیا؟"

اس واقعہ کو کئی دن گزر چکے تھے، مٹن خاں اور صمصام الدّولہ بادشاہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ وزیرِ حضوری نے اطلاع دی :

"علمائے شہر کا ایک وفد باریاب ہونا چاہتا ہے ،؟"

بادشاہ نے جواب دیا :

"بلالو ،!"

ذرا دیر میں علمائے کرام کا ایک وفد حاضر ہُوا، یہ کوئی بارہ نفوس پر مشتمل تھا، اس میں شیعہ اور سُنّی دونوں فرقوں کے علما شامل تھے، بادشاہ نے خندہ جبینی سے ان کا استقبال کیا، اور فرمایا :

"ہمارے لیے یہ بات موجبِ فخر و مباہات ہے کہ آپ نے قصرِ شاہی میں قدم رنجہ فرمایا۔ —————— اگر ہم کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں تو بسر و چشم اسے انجام دینے کو حاضر ہیں ،!"

مولانا فخرالدین نے جو کہ اس وفد کے ترجمان تھے، فرمایا :

"جانِ عالم ، ہمارے دل میں آپ کی منزلت ہے ، صرف اس لیے نہیں کہ آپ بادشاہ ہیں بلکہ اس لیے کہ آپ سچّے مسلمان بھی ہیں ،!"

"خدا ایمان پر میرا خاتمہ کرے ، یہی دعا اور یہی آرزو ہے !"

"امیرالمجاہدین کی شہادت کی خبر تو سمعِ مبارک تک پہنچ چکی ہوگی ؟"

نازو نے وار کیا :

" تم اسکیم ہی بناتے رہ جاؤ گے ، یہاں نہ جانے کیا ہو جائے گا ، وہی بات ہوئی :

سودا خمارِ عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا سر تو کھو سکا ،
کس منھ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا ؛

میں نہیں جانتی کچھ ، جان عالم کو اس پریشانی سے نجات دلاؤ ، ورنہ مجھے منھ نہ دکھانا۔ میں پہلے حضرت محل کی ہوں پھر کسی اور کی ، چاہے وہ شوہر ہو ، یا ماں ، یا باپ ، ہاں ! "

"علی نقی خاں کو اطلاع دے دو کہ وہ برخاست کر دیا گیا ہے اپنے منصب سے۔ اسے یہ بھی بتا دو کہ اس کی جاگیر ضبط کر لی گئی ہے اور یہ بھی کہہ دو کہ تا حکمِ ثانی وہ گرفتار اور نظر بند رہے گا، فوج کے ایک دستے کا پہرہ اس کے گھر پر بٹھا دیا جائے۔ نہ اس سے کوئی شخص مل پائے، نہ وہ خود باہر نکل سکے۔!"

پھر مولانا فخرالدین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

"ہمارا یہ اقدام انگریزوں کو اور "کمپنی بہادر" کو چراغ پا کر دے گا، ممکن ہے پوری طاقت سے وُہ ہم پر ٹوٹ پڑیں، لیکن اس کے لیے ہم تیار ہیں، ہر طرح کے نتائج بھگتنے کے لیے ہم آمادہ ہیں، ——— بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے!"

◎

"ہاں اس حادثۂ جگر خراش کا حال معلوم ہو چکا ہے ۔!"

"مسلمانانِ شہر حد درجہ مضطرب اور مشتعل ہو چکے ہیں ۔!"

"ضرور ہوں گے ۔!"

"انتہا یہ ہے کہ آپ سے بڑھ کر انھیں محبوب کوئی نہ تھا، مگر اب آپ پر بھی کئی لوگوں نے طعن اور اعتراض و ایراد کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے ۔!"

"وہ اپنے اس طرزِ عمل میں بالکل حق بجانب ہیں ۔!"

"لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے ہیں، اور کہتے ہیں، اگر اجودھیا کی مسجد بابری کے ساتھ یہ کچھ ہو سکتا ہے، تو سلطنت کی کس مسجد، اور امام باڑے کو محفوظ تصور کیا جا سکتا ہے؟"

"یقیناً کسی کو نہیں ۔"

"یہ صورتِ احوال قطعاً ناقابلِ برداشت ہے ۔!"

"ہونا چاہیئے، ——— مگر اب سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے؟ مَیں بادشاہ ہوں، لیکن میری حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں، انگریزوں کا غلبہ اور تصرف ہر چیز پر قائم ہو چکا ہے۔ بادشاہ کی حیثیت سے مَیں کچھ نہیں کر سکتا، ——— ایک مسلمان کی حیثیت سے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ آپ ایک لشکرِ مجاہدین تیار کیجیئے، تخت اور تاج کو ٹھکرا کر مَیں اس میں شریک ہو جاؤں گا، اور میرا حُسنِ ظن اپنے بارے میں یہ ہے کہ جو پہلا شخص جامِ شہادت نوش کرے گا، وہ مَیں ہوں گا ۔!"

"جزاکم اللہ، ——— خدا آپ کی عمر اور اقبال میں ترقی دے ۔!"

"یہ دعا نہ دیجیئے، عمر کی ترقی، مسجد کے اس حادثے کے بعد مجھے منظور نہیں، اور اقبال کا خاتمہ مَیں خود کر رہا ہوں ۔!"

یہ کہہ کر جانِ عالم نے وزیرِ حضوری سے فرمایا :

"میں نے آپ کا پیغام جہاں پناہ کو پہنچا دیا، ——— انھوں نے فرمایا ہے کہ پہلے سے وقت مقرر کیے بغیر ملاقات ناممکن ہے، وہ اس وقت ضروری کام میں مشغول ہیں، آپ اگر چاہیں تو کل دوپہر کو دو بجے تشریف لا سکتے ہیں؟"

یہ الفاظ سُن کر جنرل اوٹرم پر لرزہ طاری ہوگیا!

"کمپنی بہادر" کے سفیر کبیر کی اتنی بڑی توہین!

یہ ریذیڈنٹ ہی تو تھا، جو جب قصرِ شاہی میں ہر وقت حاضر ہو سکتا، اور بادشاہ سے اپنی ہر بات منوا سکتا تھا، آج وہ مل بھی نہیں سکتا۔

لیکن جنرل صاحب تھے بڑے حوصلے کے آدمی، انھوں نے چہرے سے اپنی برہمی اور اشتعال کا اظہار نہیں ہونے دیا، مسکرا دیئے، اور فرمایا:

"میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں، کل اسی وقت حاضر ہو جاؤں گا!"

یہ کہہ کر وہ رخصت ہوئے، اور سیدھے علی نقی خاں کی حویلی میں پہنچے۔ انھیں یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ بادشاہ نے علی نقی خاں کو معزول کر دیا، اور اس کی جاگیر ضبط کر لی ہے، لیکن یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ وہ نظر بند بھی ہے۔

حویلی کے پھاٹک پر، انھیں شاہی فوج کا ایک مسلّح دستہ نظر آیا، یہ منظر دیکھ کر وُہ دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

جیسے ہی وہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچے اور اپنی سواری سے اُترے، شاہی فوجی دستے کا کماندار حاضر ہُوا، اس نے نہایت تہذیب اور ادب کے ساتھ پوچھا:

"میرے لائق کوئی خدمت؟"

جنرل صاحب نے سراپا حیرت بن کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر کہا:

"ہم علی نقی خاں سے ملیں گے!"

کماندار نے اسی شائستہ لہجے میں جواب دیا:

(۱۱)

بادشاہ کے اس اقدام نے ایک مرتبہ پھر انھیں محبوبِ عوام بنا دیا، !
علی نقی خاں کی برطرفی، اور نظر بندی نے اہلِ شہر کو جوشِ مسرت سے معمور کر دیا۔ وہ جانتے تھے، بانیٔ شر و فساد یہی ہے، اور دیر ہی سہی۔ لیکن بادشاہ سلامت نے بالکل صحیح اقدام کیا ہے، ———— وہ یہ بھی جانتے تھے۔ کہ انگریز ملک اور بعت پر چھائے ہوئے ہیں، اور بادشاہ کو انھوں نے شکنجہ میں کس رکھا ہے، اس کے باوجود بادشاہ کا یہ دلیرانہ اقدام، ہر شخص کی زبان سے خراجِ تحسین وصول کر رہا تھا۔

جنرل اوٹرم بہادر کو، جب یہ خبر ملی تو وہ آگ بگولہ ہو گئے، انھیں ہرگز یہ امید نہیں تھی کہ بادشاہ اتنا بڑا اقدام کر گزریں گے، ———— اور علی نقی خاں جیسے شخص کو، جو انگریزوں کا سب سے زیادہ معتمد، اور دوست تھا، یوں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے، !

چنانچہ یہ خبر ملتے ہی، جنرل اوٹرم، پہلے سے وقت مقرر کیے بغیر قصرِ شاہی میں پہنچے، اور وزیرِ حضوری سے فرمایا :

"ایک بہت ضروری مسئلے پر بادشاہ سے، ———— ابھی اور اسی وقت گفتگو کرنی ہے۔"

وزیرِ حضوری نے بادشاہ کے پاس سے واپس آ کر اطلاع دی، :

دوسرے روز، وقتِ مقررہ پر، ——————— جنرل اوٹرم خدمتِ شاہ میں باریاب ہوتے، !

آج واجد علی شاہ کا مُوڈ بدلا ہُوا تھا۔ نہ وہ تپاک، نہ گرم جوشی، نہ اخلاص کا اظہار، نہ طاعت کا پیماں۔ تیوریاں چڑھی ہوئیں، تکدر کے آثار چہرے سے عیاں، جنرل اوٹرم جس وقت کمرے میں داخل ہوئے تو جانِ عالم ٹہل رہے تھے، وہ اسی طرح ٹہلتے رہے، نہ بیٹھے، نہ جنرل صاحب سے بیٹھنے کو کہا !

زندگی میں پہلی مرتبہ ریذیڈنٹ کو، اس برتاؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا، ورنہ اب تک تو یہ کیفیت رہی تھی کہ جب چاہا آیا، ——————— جو چاہا کہا ——————— جو چاہا منوایا، ——————— عملی طور پر وہ بادشاہ کو اپنا ماتحت خیال کرنے لگا تھا، اس وقت کمرے میں کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ ——————— کچھ دیر بادشاہ سلامت یُوں ہی ٹہلتے رہے، اور ریذیڈنٹ کھڑا رہا۔ پھر وہ اس کے پاس آکر رُک گئے، اور فرمایا :

" ہاں۔ آج آپ کو شرفِ باریابی حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ ——————— فرمایئے کیسے زحمت کی ؟"

یہ اکھڑے اکھڑے الفاظ واجد علی شاہ کے ؟ ——————— یہ سرد مہری ! !

"یہ تو ناممکن ہے، بادشاہ کی تحریری اجازت کے بغیر ان سے کوئی شخص نہیں مل سکتا، نہ وہ گھر سے باہر قدم نکال سکتے ہیں،!"

جنرل اوڈرم کو پسینہ آ گیا، اس نے کہا :

"اس کے معنی یہ ہیں کہ نواب صاحب نظر بند ہیں،!"

کمانداز نے جواب دیا :

"آپ بالکل صحیح سمجھے، امر واقعہ یہی ہے۔!"

◎

" ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو ، مگر اس سے ہماری آزادیٔ عمل تو مجروح نہیں ہوسکتی !"

" جی بے شک ، ——————— لیکن جانِ عالم کو یاد ہوگا ، کہ ایک مرتبہ آپ نے علی نقی خاں سے استعفے کا مطالبہ کیا تھا ، مگر میری درخواست پر یہ مطالبہ واپس لے لیا تھا ، !"

" ہاں یاد ہے ، ———————"

" پھر اب ، ————"

" اب کہ غدّاروں ، نمک حراموں ، ملک و ملّت کے دشمنوں ، بادشاہ کے ناوفاداروں ، دین کی بے حُرمتی کرنے والوں کو ہم ہمیشہ معاف نہیں کر سکتے ، !"

" لیکن کمپنی بہادر کے نزدیک بہ حیثیت وزیرِ اعظم ——— اُن کا وجُود از حد ضروری اور لازمی ہے ، !"

" اگر کمپنی بہادر کو وہ اتنے ہی مرغُوب ہیں تو اسے چاہیئے کہ آپ کو واپس بلا لے ، اور انھیں ریذیڈنٹ کا منصب تفویض کر دے ۔ !"

" (سخت متحیّر ہو کر) جی ، ——————"

" جن لوگوں کی دین اور ملک اور بادشاہ سے دشمنی ثابت ہو چکی ہے ، انھیں سزا دی جا سکتی ہے ، سرفراز نہیں کیا جا سکتا ، !"

" لیکن علی نقی خاں تو جانِ عالم کے انتہائی مخلص اور وفادار ہیں !"

" یہ آپ کی غلط فہمی ہے ، ——— ہم نے اسے حکم دیا تھا کہ لشکرِ مجاہدین پر تشدّد نہ کیا جائے مگر اس نے آپ کی شہ پر اس حکم کی پروا نہ کی ، سب کو اس طرح بھُون ڈالا ، جیسے چنے بھاڑ میں بھُونے جاتے ہیں ، !"

" مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ گیا تھا ، !"

" اس کا فیصلہ ہمارا کام تھا ۔ ہمیں اطلاع دی گئی ہوتی ۔ !"

بے رُخی، اور نخوت کا اظہار، واجد علی شاہ کی طرف سے؟ —————— جنرل اوٹرم دنگ رہ گیا تھا، اپنے آپ کو کبھی اتنا "ناخواندہ مہمان" نہیں پایا تھا، —————— جتنا آج، —————— وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، کہ بادشاہ سلامت کا برتاؤ اس کے ساتھ یہ ہو سکتا ہے،!

اس نے کہا:

"عالی جاہ سے بعض ضروری امور پر تبادلۂ خیال کرنا ہے،!"

بادشاہ نے بے رُخی کے ساتھ جواب دیا:

"فرمائیے، ہم سُن رہے ہیں،!"

جنرل اوٹرم نے ایک نظر واجد علی شاہ کے سراپا پر ڈالی، اور کہا:

"گزشتہ چند روز کے اندر کچھ عجیب قسم کے واقعات رُونما ہوئے ہیں!"

جانِ عالم نے پوچھا:

"کس قسم کی عجیب واقعات؟ —————— مثلاً؟"

"علی نقی کی معزُولی،!"

"اور ——————"

"علی نقی کی جاگیر کی ضبطی!"

"اور ——————"

"علی نقی خاں کی گرفتاری اور نظر بندی،!"

"ہاں یہ سب کچھ ہمارے حکم سے ہُوا ہے!"

"لیکن، —————— عالی جاہ، اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے، کہ "کمپنی بہادر" ان پر بے انتہا اعتماد کرتی ہے، سلطنتِ اودھ اور کمپنی بہادر کے درمیان وہ بہترین وسیلہ ہیں،!"

اتفاق کی بات جس وقت ریذیڈنٹ اندر گیا ہے، اسی وقت منّن خاں اور صمصام الدّولہ بھی بادشاہ سے ملنے آ گئے، وزیرِحضوری نے صورتِ حال سے انھیں مطلع کر دیا۔

صمصام الدّولہ نے کہا :

"یارِ حقِ دوستی ادا کرو !"

وہ بولا :

"فرمائیے، حاضر ہُوں !"

صمصام الدّولہ نے کہا :

"ہم لوگوں کو کسی ایسی جگہ بٹھا دو کہ دونوں کی گفتگو اچھی طرح سُن سکیں !"

منّن خاں نے کہا :

"یہ صرف حقِ دوستی ہی نہیں ہے، حقِ وفا بھی ہے، !"

وزیرِحضوری نے پوچھا :

"حقِ دوستی تو خیر، حقِ وفا کیسے ؟"

منّن خاں نے سمجھایا :

"آج کل حالات بڑے نازک ہو رہے ہیں ——— بے انتہا نازک، امیرالمجاہدین کی شہادت سے جانِ عالم بہت متاثر ہیں، اور تخت و تاج سے دستبردار ہونے کو تیار ہیں، وہ بھرے بیٹھے ہیں، اس وقت ریذیڈنٹ سے نہ جانے کیا باتیں ہوں، ہم سُن لیں گے، تو کچھ اُن کا

"بہرحال کمپنی بہادر کی طرف سے آپ کے طرزِ عمل پر سخت احتجاج کرتے ہوئے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ علی نقی خاں کو فوراً بحال کر دیا جائے !"

"نہ آپ کا احتجاج قابلِ قبول ہے، نہ مطالبہ، بلکہ ہم تو کمپنی بہادر سے سرکاری طور پر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ چونکہ آپ ہمارے لیے غیر پسندیدہ شخص ہیں، اس لیے آپ کو پندرہ دن کے اندر اندر واپس بلا لے، اور کسی دوسرے شخص کو ریذیڈنٹ نامزد کر کے لکھنؤ روانہ کرے، !"

پھر بادشاہ نے یک بیک مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"آپ کو جو وقت دیا گیا تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ —— خدا حافظ !"

◎

کی دس دس کمپنی بہادر کو کہے گا، پھر نہ جانے کیا ہو؟"

بادشاہ نے متّن خاں کو جھڑکتے ہوئے کہا:

"بڑے بزدل ہو، ——— ہوگا کیا؟"

متّن خاں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ خود بادشاہ نے فرمایا:

"زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم سے حکومت چھین لی جائے، سو ہم اس کے لیے تیار ہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں گرفتار کر کے پابندِ سلاسل کر دیا جائے، اس کا بھی ہمیں کوئی دکھ نہیں، یہ ہو سکتا ہے کہ ریذیڈنٹ بہادر کی توہین کے جُرم میں ہماری گردن اُڑا دی جائے، سو اُس گردن کو باقی رکھنے کی پروا کیا ہے ہمیں؟ ——— نہیں متّن خاں ڈرنے کی کوئی بات نہیں، نتائج بھگتنے کو ہم تیار ہیں،!"

"لیکن جانِ عالم، ———"

"اب لیکن کا وقت گزر چکا ہے، ایمان کا سودا کر کے ہمیں تاج و تخت منظور نہیں!"

"اس سے مسلم قوم کو نقصانِ عظیم بھی پہنچے گا،!"

"وہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"اتنی بڑی سلطنت سے وہ محروم ہو جائے گی،!"

"وہ تو محروم ہو چکی، ——— (مسکرا کر) ——— اب کیا رہا ہے جس پر رقیبوں کا ڈر کریں؟"

صمصام الدّولہ نے کہا:

"ریذیڈنسی جا کر جنرل اوٹرم کو ایک اور دل دوز خبر ملی ہوگی،!"

"وہ کیا؟"

"بارلو، ——— جس کے حکم سے لشکرِ مجاہدین پر گولی چلی، اور مولوی صاحب شہید ہوئے، جہنّم میں پہنچ گیا،!"

توڑ تو سوچ لیں گے ، !"

وزیرِ حضوری نے کچھ دیر تامّل کے بعد کہا :

" آیئے تشریف لائیے !"

دُوسری طرف سے لے جاکر اُس نے کمرۂ شاہی سے متصل ، ایک اور چھوٹے کمرے میں بٹھا دیا ، اور یہ لوگ ریذیڈنٹ اور بادشاہ کی باتیں اطمینان سے سُننے لگے ، اس کے جانے کے بعد صمصام نے کہا :

" یار یہ تو غضب ہو گیا ، ــــــ تم نے جان عالم کی باتیں سُنیں ؟"

متّن خاں نے جواب دیا :

" ہاں بھئی سُن لیں ، ہول ہو رہا ہے ، دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے ان باتوں کا ، تُم نے اُس کا چہرہ دیکھا تھا ؟"

" ہاں دیکھا تھا ، ــــــ لال بھبھوکا ہو رہا تھا ، بہت غصّے میں گیا ہے ، ضرور کوئی تازہ فتنہ سر اٹھائے گا ، !"

صمصام الدولہ نے جواب دیا :

" ہاں اندیشہ مجھے بھی ہے ، چلو بادشاہ کے پاس چلیں ، اِس وقت اُن سے گفتگو کرنا بے حد ضروری ہے ، !"

دونوں پھر وزیرِ حضوری کے پاس پہنچے ، اس سے مل کر بادشاہ کے کمرے میں گئے ، ان دونوں کو دیکھ کر بادشاہ نے کہا :

" اچھا ہُوا تم آ گئے !"

پھر خود ہی اپنی اور جنرل اوٹرم کی گفتگو کی ساری روئیداد سنا دی ، صمصام نے عرض کیا :

" جان عالم نے حق ادا کر دیا اپنے ایمان اور اسلام کا ، !"

متّن خاں بولے : " لیکن یہ اُلّو کا پٹھا ریذیڈنٹ خاموش نہیں بیٹھے گا ، ایک ایک

جنرل اوٹرم اسی روز کلکتہ روانہ ہوگئے وہاں گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کی، کورٹ آف ڈائریکٹرس کا جلسہ ہوا، گورنر جنرل کی رائے یہ تھی کہ بادشاہی قائم رکھی جائے لیکن اختیارات لے لیے جائیں[۱] لیکن کورٹ آف ڈائریکٹرس کی اکثریت نے یہ بات نہ مانی اور طے کر لیا کہ ملکِ اودھ ضبط کر کے انگریزی علاقہ بنا لیا جائے۔ لارڈ ڈلہوزی، اور بعض دُوسرے ڈائریکٹروں کا خیال تھا کہ بادشاہ نے اور اس کے آباؤ اجداد نے انگریزوں سے کبھی بے وفائی نہیں کی، عہد شکنی نہیں کی، ہر نازک وقت پر ساتھ دیا۔ جب روپے کی ضرورت ہُوئی تو کروڑوں روپیہ نذر کیا[۲]۔ لیکن اکثریت اپنے فیصلے پر قائم رہی۔

لارڈ ڈلہوزی نے جنرل اوٹرم کو پروانۂ ضبطی دے کر، روانہ کر دیا۔ وہ خوش خوش لکھنؤ آئے، اور ۳۰ جنوری ۱۸۵۶ء کو اپنی فوج ظفر موج کے ساتھ قصرِ شاہی میں داخل ہُوئے۔

بادشاہ کو اطلاع ہوئی کہ جنرل اوٹرم اس شان سے آ رہے ہیں، انھوں نے حکم دیا توپیں اُتار دی جائیں، مقابلہ نہ کیا جائے، اوٹرم کو اندر آنے دیا جائے۔

اوٹرم صاحب آئے، اور پروانۂ ضبطی اودھ پیش کرنے کے بعد، ایک عہد نامہ پیش کیا، اور بادشاہ سلامت سے استدعا کی:

"آپ اس معاہدے پر دستخط کر دیں، کمپنی بہادر آپ کو پندرہ لاکھ روپے سالانہ

---

[۱]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

[۲]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

"(حیرت سے) ایں یہ کیا کہا تم نے؟"

"جی ہاں۔ ——— ابھی کوئی گھنٹہ بھر کا واقعہ ہے، جس وقت ریذیڈنٹ جان عالم سے گفتگو کر رہا تھا۔ بارلو، اکڑتا ہُوا گھوڑے پر، چوک کی طرف سے گزرا۔ کسی دل جلے نے ایسا تاک کر خنجر مارا کہ وہیں ڈھیر ہو گیا،!"

"(خوش ہو کر) اچھا ہُوا، ——— ہم اسے پسند نہیں کرتے لوگ انفرادی طور پر قانون ہاتھ میں لیں، لیکن بارلو کو ہلاک ہونا ہی چاہیئے تھا،!"

◎

اوڈرم کے جانے کے بعد، صمصام الدّولہ اور متّن خاں کو بادشاہ نے طلب کیا، وہ حاضر ہوئے تو ان سے فرمایا :

"تمھارے چہرے میں غم والم کے اثرات دیکھ رہا ہوں، لیکن دیکھ لو، مَیں خوش ہوں، بوجھ اُتر گیا میرے سر سے، مجھے اب لکھنؤ میں رہنے کا حکم نہیں ہے، کلکتہ میں قیام کا حکم دیا گیا ہے۔ تم نازو، اور زمرد کو حضرت محل کے پاس بھیج دو۔ وہ بہرحال عورت ہیں اور انھیں بے حد صدمہ ہوا ہوگا، ان سے کہو حضرت محل کو سمجھائیں۔ رات کو تم لوگ بھی آ جاؤ۔ ہمیں کچھ ضروری امور پر مشورہ کرنا ہے، سب سے اہم بات تو قابلِ مشورہ یہ ہے کہ اپنے خاص خاص لوگوں میں سے کسے لکھنؤ میں چھوڑیں، کسے کلکتہ لے جائیں۔؟"

دونوں نے سر جھکا کر عرض کیا :

"زمرد، اور نازو تو یہ خبر سُنتے ہی آ چکی ہیں، ——— ہم دونوں وقتِ مقررہ پر حاضر ہو جائیں گے۔!"

◎

نذر کیا کرے گی ۔!"

بادشاہ نے برہمی کے عالم میں جواب دیا :

"معاہدہ کیسا ؛ معاہدہ دو برابر کے فریقوں میں ہوتا ہے [1] یہاں برابری کا یہ عالم ہے کہ آپ لشکر لے کر آئے ہیں ، اور میں نے اپنے سپاہیوں کو غیر مسلح ہو جانے کا حکم دے دیا ہے [2] !"

پھر بادشاہ نے سر سے تاج اتارا ، اور ریذیڈنٹ کی طرف پھینکتے ہوئے کہا :

"دولت ، اور اقتدار پر آپ نے پہلے قبضہ کر لیا ہے ، یہ تاج باقی رہ گیا تھا ، سو حاضر ہے [3] ، یہ معاہدہ اپنے ساتھ لے جائیے ، نہ میں اس معاہدے کا کوئی فریق ہوں ، نہ اس پر دستخط کروں گا ۔!"

ریذیڈنٹ واپس جا رہے تھے ، جب بادشاہ کی والدہ کی محلسرا کی طرف پہنچے تو والدۂ شاہ نے کہا :

"خوب ہے تم لوگوں کا انصاف بھی ، واجد علی شاہ پر الزام بد انتظامی کا ہے ، حالانکہ حکومت کا کاروبار خود تمھارے ہاتھ میں تھا ، سزا دینا ہے تو اپنے آپ کو دو ، یا ان لوگوں کو جو مجرم ہوں اور وہ لوگ تمھارے ہی رکھے ہوئے ہیں ، اور یہ بھی خوب رہی ہے کہ بد انتظامی کے الزام میں کسی کا گھر چھین لیا جائے ، اپنے آپ کو بدلو ، اپنے آدمیوں کو بدلو ، انتظام خود بخود ٹھیک ہو جائے گا ۔!"

جنرل صاحب کوئی جواب نہ دے سکے ، اشتہارات کے ذریعے ملکِ اودھ کی ضبطی کا اعلان کر دیا ، علی نقی خاں رہا کر دیئے گئے ، لیکن اب حکومت کہاں تھی کہ انھیں وزارت ملتی ، جیسا کیا تھا ویسا پایا ۔!

---

[1] : تاریخ اودھ (نجم الغنی)

[2] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

[3] : قیصر التواریخ ،

غدر :

حضرت محل کا اعلانِ آزادی اور تحریکِ حرّیت کی رہنمائی

(۱)

واجد علی شاہ سلطنت سے معزول ہوکر کلکتہ چلے گئے، وہاں مٹیا برج کے نام سے ایک الگ بستی بسالی، اور وہاں زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔

حضرت محل پر اس حادثے کا ایسا اثر ہُوا کہ وہ چارپائی سے لگ گئیں، اور واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتہ جانے سے انکار کر دیا۔!

انھوں نے کہا :

"جس ہستی کو اب تک مَیں صاحبِ تاج و تخت دیکھتی رہی ہُوں، یہ اب کن آنکھوں سے دیکھوں گی کہ وہ بادشاہ نہیں، ایک معزز شہری ہے، ——— نہیں یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، میں کسی طرح بھی کلکتہ نہیں جا سکتی، نہ اپنے بادشاہ کو الوداع کہہ سکتی ہُوں۔!"

وہ نہیں گئیں۔!

غم نے انھیں بیمار کر دیا، ———

نازو، اور زمرد نے، اپنی حویلیاں چھوڑ دیں، اور ——— حضرت محل کے ہاں اُٹھ آئیں۔!

ان دونوں کا فیصلہ یہ تھا کہ :

جب تک حضرت محل کی طبیعت بحال نہیں ہو جاتی، وہ ہر وقت یہیں رہیں گی،

ان کا تخت و تاج چھن چکا ہے، ان کی سلطنت پر دشمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے، میں خوشی مناؤں؟ تمہیں جشن منانے کی تیاریاں کرنے دوں؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔!"

حضرت محل نے یہ بات کچھ ایسے تیور کے ساتھ کہی کہ نازو اور زمرد دھیر کچھ نہ کہہ سکیں، اُن پر اوس سی پڑ گئی، اور وہ خاموش ہو گئیں!

اس موقع پر نواب صمصام الدولہ، اور نواب منّن خاں بھی موجود تھے، ! حضرت محل نے طنز بھرے لہجے میں پوچھا:

"کہئے، آپ کی وہ خفیہ تحریک کیا ہوئی؟ کیا وہ بھی جان عالم کا تخت و تاج تھی، کہ انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا؟"

دونوں پر شرمندگی کی کیفیت طاری ہو گئی!

نازو نے صمصام الدولہ سے کہا:

"کیا سانپ سونگھ گیا ہے جواب کیوں نہیں دیتے۔!"

زمرد نے منّن خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے صمصام الدولہ سے کہا:

بھائی صاحب، یہ (منّن خاں) تو صرف باتوں کے شیر ہیں، انکیمیں بنوا لیجیے، رات رات بھر باتیں کر لیجئے، لیکن آپ تو مردِ میداں ہیں، دلیر اور سورما ہیں۔ آپ تو کچھ کیجئے، ورنہ حضرت کی جان کو خطرہ ہے!"

صمصام الدولہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا:

"میں غافل نہیں ہوں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بھی نہیں بیٹھا ہوں، ہماری خفیہ تحریک بھی مر نہیں گئی ہے، کام ہو رہا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں، کہ عنقریب، ایک ایسی خبر آنے والی ہے، —————— جس سے ملکۂ عالیہ خوش ہو جائیں گی، ہو سکتا ہے، ہماری غلامی کی بیڑیاں بھی کٹ جائیں، ورنہ سر تو ضرور اس راہ میں کام آئے گا۔!"

خدمت کریں گی، اور جی بہلائیں گی،!

ان دونوں نے توقع سے کہیں زیادہ حقِ وفا ادا کیا، اور اپنی زندگی حضرت محل کے لیے وقف کردی،!

صمصام الدولہ، اور نواب منّن خاں نے بھی اس فیصلے میں کوئی مزاحمت نہیں کی، بلکہ دل و جان سے تائید کی،! ——— خود اپنی اپنی حویلیوں میں رہتے تھے، شام کو کچھ دیر کے لیے آجاتے تھے، اور حضرت محل کے دل سے غم کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

شہر پر، اور مُلک پر، انگریزوں کا پُورا تسلّط قائم ہو چکا تھا، کسی میں مجال دم زدن نہیں تھی، جو حکم نئی حکومت کی طرف سے صادر ہوتا تھا، اس کی تعمیل نئے، اور پرانے حکام و عمال کرتے رہتے تھے،!

واجد علی شاہ کی معزولی کا سب کو غم تھا، اور اس غم میں ہندو، مسلمان برابر کے شریک تھے۔ واجد علی شاہ پر اس اظہارِ وفاداری کا گہرا اثر ہوا، لیکن اب وہ اُس قابل کہاں تھے کہ کچھ صلہ دے سکتے، ——— اور ان لوگوں کی وفاداری صلے کی طالب کب تھی،!؟

کئی مہینے کے بعد،! حضرت محل کی طبیعت سنبھلی، نازو اور زمرد نے جشنِ صحت منانے کی زور شور سے تیاریاں شروع کردیں،!

لیکن، ———

حضرت محل نے منع کردیا،:

"میری بہنو! تم میری میّت پر آنسو تو بہا سکتی ہو، لیکن نشاط و مسّرت کا مظاہرہ میری زندگی میں نہیں کرسکتی، مجھے اب اس زندگی سے کچھ نہیں لینا ہے، ——— مجھے اس سے نفرت ہے، جانِ عالم ایک دور دراز مقام پر جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں،

اور ایک روز سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ ہندوستانی افواج نے، انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی، اودھ کے ایک شہر میرٹھ سے بغاوت کا آغاز ہُوا، اور آگ بڑی تیزی سے دِلّی تک پہنچ گئی، اودھ کا ایک جیالا، اور کار آزمُودہ مردِ میدان بخت خاں دِلّی گیا، اور شاہی فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی!

یہ خبر سُنتے ہی حضرت محل پر نشاط و مسرّت کی عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ اُس نے نازو، اور زمّرد سے کہا:

"ایک دن مَیں نے تمھیں جشنِ مسرّت منانے سے منع کیا تھا، اب حکم دیتی ہُوں کہ جشن مناؤ، محل پر چراغاں کرو، اور اسے گلزار بنا دو، نواب مَمّن خاں اور صمصام الدّولہ کہاں ہیں؟ انھیں بُلاؤ، ہم انھیں حکم دینا چاہتے ہیں کہ وہ ہماری بادشاہت کا اعلان کر دیں، بادشاہ میرا بچّہ برجیس قدر ہو گا، اور اس کی ریجنٹ مَیں بنوں گی!"

نازو نے خوش ہو کر کہا:

"مبارک میری ملکہ۔۔!"

زمّرد بھلا کیوں چُپ رہتی، کہنے لگی:

"اس اُجڑے ہوئے گلشن میں خدا کا شکر ہے پھر سے بہار آ گئی، ——————
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے۔۔!"

حضرت محل مُسکرا مُسکرا کر اپنی بچپن کی وفادار اور جاں نثار سہیلیوں کی باتیں سُنتی رہی۔

زمرد نے ایک جذبہ و جوش کے عالم میں پوچھا :

"لیکن وہ خبر کب آئے گی ؟"

نازو نے چھیڑا :

"جتنی راز کی باتیں نہ پُوچھا کرو ، !"

صمصام الدولہ نے اس طنز سے متاثر ہُوئے بغیر کہا :

"واقعی یہ راز ہے ، اور میں کسی قیمت پر اس کا افشا نہیں کر سکتا ، البتہ حضرت عالیہ کو ایک مرتبہ پھر اطمینان دلاتا ہُوں کہ موجُودہ صورتِ حال بہر حال قائم نہیں رہے گی ، شاید ہماری امید اور توقع سے پہلے وہ دن آجائے ، جب ہم جشنِ نشاط و مسرت منانے کے قابل ہو سکیں گے ۔ ـــــــ بس اس وقت اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا ، !"

○

احکام جاری ہوئے۔ :

"مُلک آبائی خدا نے ہم کو عطا کیا، کفّارِ فرنگ کو دفع کرنا لازم ہے، باہم شریک ہوکر، باقی ماندگان بیلی گارد کو قتل کردو، جو قتل کرے گا، اس کا نصف علاقہ اسے مُعاف ہوگا!" [1]

حضرت محل نے ایک سپاہی کی طرح تلوار سنبھالی، ایک فرماں رواں کی حیثیت سے حکومت کی، ایک مدبّر کی طرح سیاست کی گتھیاں حل کیں، انھوں نے رعایا کی یاس کو آس سے بدلا، سپاہیوں کی بددلی دُور کی، ان میں حوصلہ اور ولولہ پیدا کیا، افسروں کو ایثار و عمل کی ترغیب دی، دشمنوں سے مدارات کا برتاؤ کیا، دوستوں کو نوازا، وفاداروں کی سرپرستی کی۔ مخالفوں کو رام کیا، دشمنوں سے حُسنِ سلوک کا برتاؤ کیا، اور بہت ہی مختصر مُدّت میں ایسے عظیم و جلیل کارنامے انجام دیئے کہ تاریخ میں ایک مستقل اور باعظمت مقام حاصل کر لیا۔

۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو فوج میں منادی ہوئی، اور افسرانِ سپاہ راجہ جے لال سنگھ کی معرفت حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے، اور استدعا کی کہ برجیس قدر کو تخت نشینِ مملکت کردیا جائے، [2] اور حضرت محل کی نگرانی میں انجام دیں۔

برجیس قدر کی رسمِ تخت نشینی بڑی دھوم دھام سے عمل میں آئی۔ مسلمان تو مسلمان ہندو تک اس انقلاب سے بہت خوش تھے۔ ہندو عوام کی طرف سے ایک وفد حضرت محل کی خدمت میں باریاب ہُوا، اور عرض گزار ہُوا :

"جس طرح بھی ہوسکا ہم دھاوا کرکے بیلی گارد (ریذیڈنسی) میں میں گھس جائیں گے، رام چاہے تو کل انگریز نہیں یا ہم نہیں۔ جب تک بیلی گارد فتح نہ کرلیں گے، سرکار سے تنخواہ نہیں مانگیں گے۔ ہمارے برہمن

---

[1]: قیصر التواریخ، ص ۲۴۹

[2]: تاریخ اودھ، جلد پنجم (نجم الغنی) ص ۲۸۵

اتنے میں مٹن خاں اور صمصام الدولہ بھی آگئے، نازو نے اپنے شوہر سے کہا :

" دیکھ رہے ہو کیسی رونق ہے، آج ملکۂ عالیہ کے رُخِ انور پر، ——— بالکل ویسی ہی جیسی اُس دن جب دُلہن بنی تھیں، ! "

صمصام الدولہ نے ایک نظر حضرت محل پر ڈالی اور جھکالی، !

مٹن خاں نے زمرّد سے کہا :

" بڑی خوش خبری لایا ہُوں، ! "

وہ کہنے لگی :

" اپنی خوش خبری اپنے پاس رکھو، ہمیں معلوم ہے، آزادی کی تحریک نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، لیکن خوش خبری ہم سے سُنو، ! "

" ضرور سناؤ بھئی، ! "

وہ بولی :

" حضرت عالیہ شہزادہ برجیس قدر کی بادشاہت کا اعلان کرنے کا فیصلہ کریں گی۔ جب تک وُہ بالغ نہیں ہو جاتے خود کاروبارِ حکومت چلائیں گی، ! "

صمصام نے جوشِ مسرت سے بے قابو ہو کر کہا :

" بخدا ہم لوگ بھی یہی تجویز لے کر آئے تھے ! "

حضرت محل نے مُسکراتے ہُوئے کہا :

" بس تو کارروائی شروع ہو جانی چاہیئے، انگریزوں کی جوع الارض پر، اور احسان فراموشی پر، اور غداری پر ضربِ کاری لگانے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا، ! "

صمصام نے عرض کیا :

" بجا فرمایا حضرت عالیہ نے ! "

دوسرے روز عام بھرتی کا اعلان ہُوا، تمام تعلقداروں، اور زمینداروں کے نام

(۳)

جنگِ آزادی زور شور کے ساتھ جاری تھی!

دلی کی قوتِ مزاحمت و مقاومت کمزور پڑتی جارہی تھی، شکست کے آثار نمایاں ہو چلے تھے [۱] مگر لکھنؤ میں، آزادی کی جنگ، تمام قومیں اتحاد و اتفاق کے ساتھ شانہ بشانہ پورے جوش و خروش کے ساتھ جنگ کر رہے تھے،

حضرت محل کا یہ عالم تھا کہ کبھی گھر سے یا محل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، محل کی ساری زندگی پردے میں گزری تھی۔ مگر جوش اور ہمت کا یہ حال تھا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر گشت کو نکلتیں [۲] اور تمام امور کا بچشم خود معائنہ کرتیں۔ انھوں نے ایک کونسل بنادی تھی، جو حسام الدولہ، ممّن خاں، مولوی احمد اللہ شاہ، اور نواب ممّو خاں پر مشتمل تھی، تمام امور پر کونسل سے مشورہ کیا جاتا، اور اس مشورے پر عمل کیا جاتا۔ [۳]

حضرت محل کے تدبّر، اعلیٰ دماغی، قابلیت اور استقامت، اور ان کے مشیروں کے حسن تدبیر نے تحریکِ آزادی کو اس کامیابی سے چلایا کہ ملّت کا سپاہیانہ ذوق جو بے حسی اور جمود کی نذر ہوگیا تھا، تازہ ہوگیا۔ زنگ آلود ہتھیار صیقل کیے گئے، اور ان کی جھنکار فضائے آسمانی میں گونج گونج کر بستہ دلوں کو پھر سے گرمانے لگی۔

---

[۱]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

[۲]: مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۹۰

[۳]: ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ص ۵۶

اور پنڈت از روئے علمِ نجوم بتاتے ہیں کہ برجیس قدر کی سلطنت
کلکتہ تک وسیع ہو جائے گی ، بڑا صاحبِ اقبال ہے ، اچھی ساعت
میں گدّی پر بیٹھا ہے ، ! " [۱]

جنگِ آزادی زور شور سے جاری تھی ـــــ لوگ سر کٹا سکتے تھے ، مگر روپیہ نہیں پیدا کر سکتے تھے ، سب سے زیادہ کمی روپے کی تھی ، بعض فوجیوں نے لوٹ مار بھی شروع کر دی کہ کس طرح اپنے گھر والوں کا پیٹ بھریں ، حضرت محل کا اشارہ پا کر :

" برجیس قدر نے ایک دن سب تلنگوں اور افسروں کو بلوایا ، خود گھوڑے پر سوار ہوئے ۱۱ توپ کی سلامی چلی - آہستہ آہستہ سمجھانے لگے ، اے بہادرو ! ہم تم سے بہت خوش ہیں ، خوب لڑتے ہو ، مگر ہمیں ایک بات کا رنج ہے . تم اہالیانِ شہر کو لوٹنے لگے ہو ، یہ اچھا نہیں کرتے . یہ کام موقوف کرو ، ورنہ رعایا بددعا دے گی " افسروں نے دست بستہ عرض کی :

" جنابِ عالی ، اب شہر ہرگز نہ لٹے گا ، ! " [۲]

---

[۱] : قیصر التواریخ ، جلد دوم ، ص ۲۳۲

[۲] : قیصر التواریخ ، جلد دوم ، ص ۲۳۳

نازو اور زمرّد کا قیام اب بھی حضرت محل کے قصرِ شاہی میں تھا، لیکن اب وہ اتنی زیادہ مصروف تھیں، اور شب و روز امورِ مملکت کے انجام دینے میں ان کا انہماک اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ کئی کئی دن بات چیت تو درکنار ملاقات اور دیدار تک کی نوبت نہ آتی، نہ کھانے کا کوئی وقت مقرر تھا، نہ ناشتے کا، نہ آرام کی کوئی جگہ معین تھی، نہ تفریح کی، کبھی چوکھی محل میں جاکر، جہاں مولانا احمد اللہ شاہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کونسل کے اجلاس کی صدارت کرتیں، دوسروں کی سنتیں اپنی کہتیں، پھر باہمی افہام و تفہیم کے بعد کوئی فیصلہ ہوتا۔

ایک روز صبح صبح جب حضرت محل باہر جا رہی تھیں، نازو نے پکڑ لیا، اور کہنے لگی:

"کیوں حضور،

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا!

———!"

زمرّد بولی:

"ہم نے اتنی ڈھیر ساری دعائیں کامیابی اور نصرت کی اس لیے تو نہیں مانگی تھیں کہ صورت دیکھنے کو بھی ترس جائیں، نا بابا یہ نہیں ہو سکتا، کچھ وقت ہم لوگوں کو بھی روز مرحمت ہوا کرے۔——— چند منٹ ہی سہی!"

حضرت محل جاتے جاتے رُک گئی، اُس نے کہا:

"کمپنی بہادر" کے خلاف نفرت و حقارت کا جذبہ سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ صرف گیارہ روز میں اودھ کے کسی ضلع کے اندر برٹش گورنمنٹ کا کوئی حاکم موجود نہ رہ سکا، انگریزی عملداری ایک خواب معلوم ہوتی تھی" [۱] ۔ چنانچہ سرہنری لارنس نے لیفٹیننٹ کو جو چھٹی لکھی، اس میں اقرار کیا: "سارے ضلعے ہماری حکومت کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں، حالات لمحہ بہ لمحہ نازک تر ہوتے جارہے ہیں!" [۲] شہر تو شہر دیہاتوں تک کا یہ حال تھا کہ:

"اناؤ کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں جس کا رقبہ صرف پون میل تھا صرف جنگجو اور مسلح لوگ ہی موجود تھے، گاؤں کا ہر گھر ایک چھوٹا سا قلعہ بنا ہوا تھا، !" [۳]

⊚

---

[۱] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۸۱۸

[۲] : قیصر التواریخ، ص ۲۴۰

[۳] : مسلمانوں کا روشن مستقبل،

——— !"

حضرت محل نے یہ شعر سُن کر تقریباً چیختے ہوئے زمرد سے کہا :

"بس کرو، ——— میں نہیں سُن سکتی !"

یہ کہہ کر وُہ پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگیں ، نازو کا بھی یہی حال تھا۔ اُس نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا :

"واہ بہن ، جان عالم کے ایسے ہی اشعار رہ گئے تھے سُنانے کو ؟ جانتی تو ہو، وہ کتنی شوہر پرست اور حسّاس واقع ہُوئی ہیں !"

زمرد پر شرمندگی طاری ہو گئی ، کہنے لگی :

"مجھے کیا معلوم تھا ؟"

◎

"ظالمو، مَیں کہیں بھی ہوں، کوئی کام بھی کر رہی ہوں، کتنی ہی مشغولیت ہو، لیکن دل تم ہی دونوں میں اٹکا رہتا ہے، نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے تم دونوں نے مجھ بندی پر، !"

نازو بولی :

"کشتۂ سحر تو ہم ہیں کہ رات رات بھر جاگیں اور انتظار کریں، دن دن بھر یاد کریں، اور ٹھنڈی آہیں بھریں، لیکن نہ کوئی میٹھا بول، نہ کوئی جھلک، بس فراق اور ہجر ہے اور ہم ہیں، !"

زمرّد سے حضرت محل نے کہا :

"سُن رہی ہو اس پگلی کی باتیں ؟"

وہ بولی :

"سچ تو کہہ رہی ہے بے چاری، کیا جھوٹ ہے کچھ ؟"

حضرت محل بیٹھ گئی، اُس نے کہا :

"اچھا بھئی، لو بیٹھے جاتے ہیں، بڑے ضروری کام سے جا رہے تھے، لیکن کچھ دیر بعد چلے جائیں گے !"

نازو اٹھلاتی ہوئی بولی :

"شکریہ، !"

پھر کہنے لگی :

"کل ایک ہرکارہ جان عالم کا کوئی کام انجام دینے کلکتہ سے آیا ہے، نواب صاحب (مٹی خاں) سے بھی ملا تھا، اس نے ان کی تازہ غزل سنائی، کلیجہ تڑپ گیا، اور کئی شعر یاد ہو گئے، حضرت محل نے اشتیاق کے ساتھ کہا: "تو ہمیں بھی سناؤ، ——— لیکن لے کے ساتھ، !"

زمرّد نے گانا شروع کیا :

زمانہ تھا پیا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے

۸ : رگھناتھ سنگھ، تعلقدار کھجور گاؤں، ۲ ہزار سپاہی
۴ ضرب توپ

۹ : کلّو خاں، نان پارہ ۲ ہزار سپاہی [1]

یہ رپورٹ سُن کر حضرت محل کے چہرے پر مسرت کی خوشی دوڑ گئی، انھوں نے کہا :

" یہ تعاون تو بہت حوصلہ افزا ہے، !"

منّن خاں نے جواب دیا :

" بے شک ملکۂ عالیہ، لیکن مناسب یہ ہے کہ دُوسرے تعلق داروں کو بھی، اس طرف متوجہ کیا جائے۔ !"

حضرت محل نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا :

" آپ کی رائے سے ہمیں اتفاق ہے، برجیس قدر کی طرف سے کہ وہی بادشاہ اودھ ہے، ایک پروانۂ طلبی لکھ کر فوراً ہمیں سُنائیے۔"

فوراً ہی پروانۂ طلبی کا مسودہ پیش کیا گیا، !

" بفضلِ خدا سے مابدولت و اقبال نے مسندِ آبائی پر جلوس فرمایا تمھیں لکھا جاتا ہے کہ کوئی انگریز مع فوج و اہلکار تمھارے گھاٹ سے تمھارے علاقے میں نہ اُترنے پائے۔ جس طرح ہو مقابلہ کرنا، اور بغور دیکھنے حکمنامۂ ہذا کے مع فوج و توپ دردِ دولت پر حاضر ہونا تاکید جانو، !" [2]

حضرت محل نے مسودہ سُن کر اسے منظور کیا، اور حکم دیا کہ فوراً سب کو روانہ

---

[1] : قیصر التواریخ ، جلد دوم

[2] : قیصر التواریخ ، جلد دوم

باقی تعلقداروں نے جن میں ہندو زیادہ اور مسلمان کم تھے۔ اس حکم نامہ کی تعمیل نہیں کی، اور انگریزوں کا ساتھ دیا۔

(۵)

چونکہ محل میں مشیروں کی کونسل حضرت محل کی زیر صدارت جمع تھی۔
حضرت محل نے نواب صمصام الدّولہ اور مّمن خاں سے دریافت کیا :
"اب تک کون کون سے تعلقدار، اور رئیس مدد اور کمک کے طور پر اپنے آدمی بھیج چکے ہیں ؟"
مّمن خاں نے فہرست پڑھنا شروع کی :
"راجہ محمود آباد، راجہ نان پارہ کے علاوہ :

۱ : راجہ دیبی بخش سنگھ، راجہ گونڈا،	۳ ہزار سپاہی ۲ ہزار سپاہی
۲ : راجہ خوش حال تعلقدار گوشائیں گنج	۷ ہزار سپاہی
۳ : راجہ سکھ درشن، زمیندار سمروتہ	۲ ہزار سپاہی
۴ : بہرام بخش	۳ ضرب توپ
۵ : راجہ لال مادھو سنگھ	۵ ہزار سپاہی، ۴ ضرب توپ، ۲۰۰ سوار
۶ : حشمت علی تعلقدار سندھیلہ	۴ ہزار سپاہی
۷ : میر منصب علی تعلقدار رسول آباد	ایک ہزار سپاہی

کارنمایاں کرنے والوں کو انعامات دینا ہیں، اسلحہ خریدنا ہے، دُوسری ضروری جنگی تیاریاں کرنا ہیں، یہ سارے کام بغیر روپے کے کیسے ہو سکتے ہیں، ؟"

نواب ممدو خاں نے بھی جو افواج سرکاری کے نگہدار تھے، نواب صمصام الدولہ کی تائید کی :

" نواب صاحب نے بڑی اہم، اور بہت بروقت بات کی ہے، اس پر فوری غور ہونا چاہیئے اور فیصلہ بھی فوری ہونا چاہیئے، اور عملدرآمد بھی، !"

حضرت محل نے ایک گھنٹہ کے لیے کونسل مُلتوی کر دی کہ لوگ آپس میں غور کر لیں، پھر کوئی فیصلہ کیا جائے، !

◎

کردیا جائے ۔ !

اب نواب صمصام الدّولہ کھڑے ہوئے ، اُنھوں نے حضرت محل سے مخاطب ہوکر عرض کیا :

" سرکار عالیہ ، غلام بھی کچھ عرض کیا چاہتا ہے !"

حضرت محل نے ممنونیّت ، اور شفقت کے ساتھ نواب صمصام الدّولہ پر ایک نظر ڈالی اور کہا :

" ضرور فرمایئے ، ـــــــ آپ جیسے جاں نثاروں اور وفاداروں کی ہمارے دل میں بڑی قدر بھی ہے ، عزّت بھی ، ہم گوش ہوش سے سُن رہے ہیں ، !"

صمصام الدّولہ نے عرض کیا :

" کچھ فوج پہلے سے موجود تھی ، معقول سپاہ زمین داروں ، اور تعلقداروں نے بھیج دی ہے !"

" ہاں اس بات سے ہم بہت خوشنود ہیں ، !"

" لیکن اس چیز نے ایک بہت بڑا مسئلہ پیدا کر دیا ہے ، !"

" وہ کیا ؟ فرمایئے !"

" انگریزوں نے جب اودھ پر قبضہ کیا ، تو لکھنؤ ، اور دوسرے شہروں کے خزانۂ سرکاری پر بھی قبضہ کر لیا ، !"

" ٹھیک ہے ہم جانتے ہیں ، !"

" ہم نے جب جنگِ آزادی شروع کی تو ہمارا خزانہ بالکل خالی تھا ، !"

" یہ بھی درست ہے ، !"

" اب تک تو اِدھر اُدھر سے اور باہمی چندے سے ہم لوگوں نے کام چلایا ، لیکن مصارف اتنے زیادہ ہیں کہ بغیر رقمِ خطیر کے کام نہیں چل سکتا کسی طرح ، غور تو فرمایئے ، سپاہیوں کی تنخواہیں دینا ہیں

پر قربان ہو گئیں [1] (مُسکرا کر) لٰہذا ، مجھ پر اتنا ہی ٹیکس لگایا جائے ، جو میں دے سکوں ، اب گھر کے برتن اور کچھ قالین رہ گئے ہیں ، وُہی دے سکتی ہوں ، !"

حاضرین اس بیان سے بہت متاثر ہوئے !

سب نے بیک آواز کہا :

" اب تک یہ لڑائی درحقیقت آپ ہی کے روپے سے چلی ہے ، اب آپ کے پاس رہ کیا گیا ہے ، جو ٹیکس لگا کر وصول کیا جائے ، !"

صمصام الدولہ نے عرض کیا :

" میرے خیال میں ، ——————

حضرت محل نے صمصام الدولہ کو ٹوکتے ہوئے کہا :

" لوگوں سے اتنی رقم طلب کی جائے جو آسانی سے وہ ادا کر سکیں ، اس سلسلے میں کسی طرح کا جبر و جور نہیں ہونا چاہئیے ، !"

صمصام الدولہ بولے :

" سرکار عالیہ ایسا ہی ہوگا ! "

حضرت محل نے کہا :

" اچھا اب تجویز پیش کیجئے ، !"

صمصام الدولہ نے عرض کیا :

" میری تجویز یہ ہے کہ حسب ذیل حضرات وہ رقم جو ان کے نام کے ساتھ مندرج ہے ، بہ آسانی ادا کر سکتے ہیں ، !"

حضرت محل نے پوچھا :

" ہاں ، ——————— کون کون ہیں وہ لوگ ، اور جو رقم آپ نے صلاح مشورے

---

[1] : قیصر التواریخ ، جلد دوم ، ص ۲۳۳

(۶)

ایک گھنٹے کے بعد ، !
کونسل کا اجلاس پھر شروع ہُوا ، حضرت محل نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی ، اور پوچھا :

" آپ لوگوں نے باہمی مشورہ اور غور کر لیا ؟ "

صمصام الدولہ نے جواب میں عرض کیا :

" جی ہاں بہت اچھی طرح ، ! "

" تو کیا ہے آپ کی تجویز ، ؟ "

" غلام کی ، بلکہ ہم سب کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مال داروں پر مصارفِ جنگ کا ٹیکس لگایا جائے ! "

حضرت محل نے یہ سُن کر کہا :

" تجویز تو معقول ہے ، ! ——— مجھ پر بھی جو ٹیکس چاہیے لگا دیجئے لیکن پہلے ہی کہے دیتی ہُوں کہ جنگ شروع کرتے وقت میرے پاس کُل چار لاکھ روپیہ تھا ، وہ سب اس کام پر میں صرف کر چکی ہُوں ——— زیورات اور جنس ، اور قیمتی اشیاء کی صُورت میں جو چیزیں میرے پاس ، اور نواب حضور عالم کے پاس تھیں ، ——— وہ اٹھارہ لاکھ روپے کی تھیں ، ——— وہ بھی اس نیک کام

"غلام کی رائے یہ ہے کہ جو نئے سکّے ڈھالے جائیں، ان پر سرکارِ عالیہ کی تصویر اور نام کندہ ہو!"

"(مسکرا کر) آپ کی اس نوازش کا شکریہ، ——————— لیکن مجھے اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے!"

"پھر آپ کی تجویز کیا ہے؟"

"خدا رکھے برجیس قدر ہی مالکِ تخت و تاج ہے، اُسی کے نام کا سکّہ ڈھالنا چاہیئے!"

"بہت خوب، بہت مناسب تجویز ہے!"

"بس تو پھر کام شروع کر دیا جائے!"

"کل ہی سے شروع ہو جائے گا!" [1]

"ہماری خواہش یہی ہے کہ جو فیصلہ ہو اس پر عمل درآمد میں تاخیر نہ ہو۔ —— اور ہاں، آج ہم نے اُن سپاہیوں کو طلب کیا تھا، جنھوں نے اس جنگ میں کارِ نمایاں انجام دیئے ہیں، انھیں سندِ خوشنودی، اور پچاس پچاس روپیہ انعام دیا جائے!" [2]

اتنے میں اطلاع ملی کہ راجہ مان سنگھ حسبُ الطلب حاضر ہیں، وہ فوراً بُلا لیے گئے۔ حضرت محل نے اُن سے کہا:

---

[1] : برجیس قدر کے نام کے دو سکّے بنے :

۱ : سکّہ زد بر سیم و زر چوں مہر بدر
نیّرِ ایں میرزا برجیس قدر

۲ : سکّہ زد بر اشرفی مہر و بدر
اخترِ سلطانِ عالم میرزا برجیس قدر

(ملاحظہ ہو قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۲۳۵)

[2] : ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ (شرر) ص ۵۹

کے بعد متعین کی ہے، وہ کیا ہے ؟"

۱ : نواب اچھے صاحب	۵۰	ہزار
۲ : میر احسان علی خاں	۴۵	ہزار
۳ : منجھلی بیگم	۱۰	ہزار
۴ : محمد بخش داروغہ	۵	ہزار
۵ : چندی سہائے دیوان نواب صاحب	۵	لاکھ
۶ : اہالیانِ شہر	۵۵	لاکھ [1]

میرے خیال میں یہ رقم مذکورہ اصحاب بہ آسانی ادا کر سکتے ہیں، اور اُس سے ہمارا کام چل سکے گا۔!"

ہمیں آپ کی رائے سے اتفاق ہے، ان لوگوں کو حکم بھیجئے کہ جو رقم اُن پر عائد کی گئی ہے، فوراً خزانۂ شاہی میں داخل کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت دیں!"

"بہت خوب!"

"کوئی اور تجویز؟"

"غلام کی ایک تجویز اور ہے؟"

"فرمائیے، اجازت ہے!"

"صرف دوسروں سے روپیہ لینے پر ہمیں اکتفا نہ کرنا چاہیئے!"

"پھر ــــــ کیا کرنا چاہیئے؛

"جلد از جلد قدیم سرکاری ٹکسال چالو کی جاتے، اور وہاں روپیہ ڈھالنے کا کام شروع کر دیا جائے۔!"

"بہت معقول تجویز ہے!"

---

[1] : قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۲۳۲

مولانا احمد اللہ شاہ کی رفاقت سے حضرت محل کو بہت فائدہ پہنچا، بڑے پُر جوش، سراپا جہاد اور حرمتِ ملی پر کٹ مرنے کا جذبہ لے کر آئے تھے۔

اس جنگ کا تاریک ترین پہلو یہ تھا کہ جہاں وفاداروں، اور جاں نثاروں کا ایک انبوہ تھا، وہاں غداروں اور مفاد پرستوں کا بھی ایک جمِ غفیر تھا، یہ لوگ بظاہر ساتھ تھے، لیکن درحقیقت انگریزوں سے ملے ہوئے تھے، اور ان کے لیے کام کر رہے تھے۔ سامان ناقص لانا، جنگی ہتھیار نکمّے بنانا، گولہ بارود اور کارتوس میں بھوسی بھر دینا، سپاہیوں میں بد دلی پھیلانا، ان کا محبوب مشغلہ تھا، مولانا احمد اللہ شاہ ہر معرکے میں اور ہر مورچے پر کامیاب ہوتے اگر ان کے ساتھ غدار بھی دوستوں کا لباس پہنے ہوتے نہ ہوتے، بالآخر ایک ہندو تعلقدار راجہ پوربان نے انھیں دھوکا دے کر قتل کر ڈالا اور انگریزوں سے بہت بڑا انعام پایا۔

مولانا احمد اللہ شاہ کے سر میں جہاد کا سودا سمایا ہُوا تھا۔

بیلی گارد (ریذیڈنسی) پر حملے میں یہ پیش پیش تھے، یہ خود سراپا جوش، ساعتی دغا کے پُتلے، !

"بیلی گارد پر چھ دن اور چھ رات تک گولیوں کا مینہ برستا رہا، جمعہ کے دن عصر کی نماز پڑھ کر مولوی احمد اللہ نے دھاوا کیا، اور بیلی گارد کے زیرِ دیوار پھاٹک تک جا پہنچے، محصُورین بیلی گارد خود بیان کرتے ہیں، یہ منظر دیکھ کر ہمیں اپنی ہلاکت کا یقین ہوگیا، کیونکہ گورے اور کالے سپاہی لڑتے لڑتے تھک کر چُور ہو گئے تھے، میموں کی سراسیمگی اور اضطراب و اضطرار کی کیفیت دیدنی تھی، سب کے سب جنرل لوگ تہ خانے میں جا کر چھُپ رہے، سب کو موت کا دھڑکا تھا،

"معرکۂ عالم میں آپ نے جس جاں فشانی، فداکاری، اور ہمت و دلیری کا ثبوت دیا ہے اس سے ہم بہت خوش ہیں!"

راجہ مان سنگھ نے سر جھکا کر آداب عرض کیا اور کہا:

"بندہ نوازی ہے سرکارِ عالیہ کی، !"

حضرت محل نے راجہ مان سنگھ کو "فرزند خاص" کے خطاب سے سرفراز فرمایا، اور اپنے ملبوسِ خاص سے اپنا ایک دوپٹہ عنایت کیا اور فرمایا:

"فتح حاصل ہوئے، پھر انعام میں رقم خطیر اور جاگیر آپ کو دی جائے گی، !" [1]

◎

---

[1] : قیصر التواریخ، ۲۶۷

نے بھی دی ہے اور دُوسرے غیر ملکی لوگ بھی اس میں شریک ہیں :

" اگر محب وطن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے ملک کی چھنی آزادی کے لیے برسرِکار ہو، اور جدوجہد کرے اور جنگ لڑے، تو یقیناً مولوی احمد اللہ اپنے ملک کا سچّا دوست اور محب وطن اور وطن کا عاشق تھا۔ اس نے کبھی اپنی تلوار سے کسی بے گناہ کی گردن نہیں کاٹی، نہ کوئی ایسا کام کیا، جو شجاعت اور دلیری کے خلاف ہو، وہ بہادری اور ہمّت، اور جوش کے ساتھ میدان میں اُترا اور اپنے مُلک کے، غیر مُلکی حکمرانوں سے جنھوں نے اس کے ملک پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا، جنگ آزما ہُوا۔ بس دنیا کی ہر قوم کے وہ لوگ جو دلیری کی قدر کرتے، اور بہادری کی عزت کرتے ہیں، مجبور ہیں کہ اس بزرگ ہستی کا نام احترام کے ساتھ لیں اور ثابت کر دیں کہ ان کے دل میں ایک بہادر شخص کی عزّت ہے !" [1]

---

[1] : تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہندوستان) ذکاء اللہ، ص ۹۲

ہر ایک خوفِ مرگ سے نیم جان ہو رہا تھا، شاہ جی پھاٹک کی آڑ میں اپنے ساتھیوں کو پکارا کیے، کہ دوستو آگے بڑھو، مگر کوئی بھی آگے بڑھنے پر تیار نہ ہُوا۔ [1]

مولانا کی جنگی استعداد و صلاحیت شک و شبہ سے بالا تھی۔ انھوں نے متعدد معرکوں میں حصہ لیا اور ہر معرکے میں یہ ثابت کر دیا کہ وہ غیر معمولی طور پر صاحبِ تدبیر و شجاعت ہیں، ان کی دلیری اور شجاعت حد سے بڑھی ہوئی تھی، جنرل اوٹرم کو لکھنؤ سے نکالنے کے سلسلے میں انھوں نے جس تہوّر اور دلیری سے جنگ جاری رکھی، وہ انھی کا حصہ تھا، ایک مورّخ کا بیان ہے:

"مولوی احمد اللہ شاہ نے بڑی معقول تدبیریں جنرل اوٹرم کو لکھنؤ سے نکالنے کی کیں، اور اس کے لشکر کے قریب توپیں لگا کر گولے پھینکنے شروع کیے۔" [2]

مولانا کو دھوکے سے راجہ پوریاں، ایک ہندو تعلقدار نے قتل کر دیا، ان کا سر شاہجہان پور بھیجا گیا۔ راجہ نے توقع سے زیادہ انعام پایا، لیکن مولانا کی جنگی صلاحیت اور خلوص کار کی تعریف انکے بدترین دشمن بھی کرتے تھے۔

ایک انگریز میلی سن نے مولانا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مولانا ایک بہت بڑا تجربہ کار شخص تھا، اس کے سوا کوئی شخص فخر کے ساتھ یہ سچا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے کالن کیمبل کمانڈر انچیف ہند کو دو بار میدانِ جنگ میں شکستِ فاش دی، مولوی سچا محبِ وطن تھا، اس نے کسی بے گناہ یا نہتے کا خون بہا کر اپنی تلوار کو رسوا نہیں کیا، اس نے بہادری کے ساتھ ڈٹ کر کھلے میدان میں ان غیر ملکیوں کے ساتھ جنگ کی جنھوں نے اس کا وطن چھین لیا تھا اور اس پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا، ہر ملک کے بہادر اور شجاع لوگوں پر لازم ہے کہ مولوی احمد اللہ شاہ کو عزت اور احترام کے ساتھ یاد رکھیں۔" [3]

مولانا احمد اللہ شاہ کی شجاعت، دلیری، تدبر، جنگی مہارت اور حُسنِ تدبیر کی داد صرف میلی سن

---

[1]: قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۲۳۰

[2]: تاریخ ہندوستان (ذکاء اللہ) سوم، ص ۵۶

[3]: رسالہ معنف (علی گڑھ) دسمبر ۱۹۴۳ء

نواب ممدو خاں نے کہا :

" سرکار عالیہ نے بالکل بجا ارشاد فرمایا ۔ !"

حضرت محل بولیں :

" درحقیقت ہمارے خاندان کا منصب وزارت تھا ، اور اودھ کے فرماں روا نواب وزیر کہلایا کرتے تھے ، ——— بے شک ہمیں اختیاراتِ شاہی حاصل تھے ، لیکن ہمیں شہنشاہ ہند کی اطاعت اور وزارت پر فخر تھا ، اب کہ دِلّی کی بادشاہت پھر زندہ ہوگئی ہے ، اور بہادر شاہ نے اعلانِ آزادی تسلیم کرلیا ہے ——— ہمیں چاہیئے کہ برجیس قدر کو بادشاہ کے بجائے نواب وزیر کہیں ، اگرچہ اس کے اقتدار اور اختیار میں کوئی فرق نہیں آئے گا ، لیکن دہلی ، اور لکھنؤ میں جو بے گانگی پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوجائے گی اور ایک عظیم مقصد کے لیے ہم متحد ہوکر ، شانہ بشانہ جد و جہد کرسکیں گے ، !"

کچھ تامّل کے بعد !

سب نے یہ مدبّرانہ تجویز منظور کرلی ۔ !

اور ۵ ر جولائی ۱۸۵۷ء کو نواب احمد حسین کی تحریک اور نواب ممدو خاں کی تائید سے برجیس قدر تختِ واجدی پر متمکن ہوئے ، شہاب الدین اور سیّد برکات احمد سالار نے مند بل برجیس قدر کے سر پر رکھی ، تمام افسروں نے تلوار نذر گزرانی ، ۲۱ ضرب توپ کی سلامی سرہوئی سارے شہر میں منادی ہوئی :

" خلق خدا کی ، ملک بادشاہ دہلی کا ، حکم مرزا برجیس قدر کا ، !"

دوسرے روز تمام اہل و ملائق ، اور پنشن یافتگان قدیم وجدید دردولت پر حاضر ہوئے ، اور اپنے عہدوں پر از سرنو بحال ہوئے ، !" [1]

---

[1] : قیصر التواریخ ، جلد دوم ، ص ۲۲۷

(۸)

حضرت محل نہایت شان وشوکت، بیدار مغزی، تدبّر، معاملہ فہمی، اور حُسنِ تدبیر کے ساتھ دادِ فرماں روائی دے رہی تھیں۔ بادشاہ برجیس قدر تھے۔ ایک طفلِ نوخیز، لیکن در اصل سارے امورِ مملکت حضرت محل کے ہاتھ میں تھے، [1] اور وہ بڑی ہوشیاری اور دُور بینی کے ساتھ اپنے فرائض اور ذمّہ داریاں انجام دے رہی تھیں۔

ایک روز مشیروں کی کونسل کی وہ حسبِ معمول صدارت کر رہی تھیں ——— کہ انھوں نے خود کہا:

"برجیس قدر کو بادشاہ کہا اور مانا جا رہا ہے، گزشتہ کئی پشتوں سے بادشاہت ہی ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے،!"

نواب صمصام الدولہ نے دست بستہ عرض کیا:

"بجا ارشاد ہُوا،!"

حضرت محل نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہُوئے کہا:

"یہ جنگ، جو ہم لڑ رہے ہیں، اقتدار اور مفاد کی جنگ نہیں ہے۔ یہ آخری موقع قدرت نے ہمیں دیا ہے۔ اگر اس مرتبہ بھی ہم اپنے مفاد، اپنے اقتدار، اور اپنے اختیار کے چکّر میں گرفتار رہے تو ہماری تباہی اور بربادی پر مہر لگ جائے گی!"

---

[1]: تاریخ اودھ (نجم الغنی)

نے خلعتِ نیابت و دیوانی منگوا کر عنایت فرمایا۔ اسی طرح مہاراجہ بال کرشن کو وزیرِ مالیات کا منصب تفویض ہُوا ، [1]

حضرت محل کے اس اندازِ فرماں روائی نے ان کی مقبولیت اور محبوبیتِ عوام میں بہت اضافہ کر دیا تھا ، ان کے اندر کسی قسم کا تعصب نہیں تھا ، وہ صرف آدمی کی قابلیت اور خلوص کو پرکھتی تھیں ، اس طرف سے اگر اطمینان ہو گیا تو پھر وہ ہر منصب کا مستحق تھا ، کوئی قوت و طاقت بھی اسکی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی تھی ، !

صمصام الدّولہ اور ممّن خاں نے نواب شرف الدّولہ کو صدق دل سے مبارک باد دی ،

صمصام الدّولہ نے کہا :

" حق بہ حق دار رسید ! "

شرف الدّولہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ، تپاک اور گرم جوشی کے ساتھ معانقہ کیا اور یہ مجلس ختم ہو گئی !

---

[1] : قیصر التواریخ ، جلد دوم ، ص ۲۲۸

اس واقعے کے چند روز بعد، ایک اور بہت اہم مسئلہ اٹھ کھڑا ہُوا، !
مسئلہ یہ تھا کہ نیابت اور دیوانی کا منصب کسے تفویض کیا جائے ؟
یہ حد درجہ اہم اور کلیدی منصب تھا یعنی بادشاہ کی نیابت، اور وزارتِ عظمیٰ کے فرائض کون بجالائے ؟

حکومت شیعہ تھی، ارکانِ حکومت کی بڑی تعداد شیعہ تھی، حضرت محل شیعہ تھیں ——— برجیس قدر شیعہ تھے، قدرتاً یہ سب سے بڑا منصب کسی شیعہ ہی کو ملنا چاہیئے، ممّن خاں اور صمصام الدّولہ نے، نازو اور زمرّد کی وجہ سے خاندانِ شاہی سے، اور خاص طور پر حضرت محل سے بُہت قربت حاصل کر لی تھی، ان دونوں میں سے کوئی بھی اس منصب پر فائز ہو سکتا تھا، نواب ممّو خاں اور دوسرے ارکینِ سلطنت بھی اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔

حضرت محل نے ممبرانِ کونسل سے دریافت فرمایا :

" آپ حضرات کے خیال میں اس منصب کے لیے موزوں ترین شخص کون ہے ؟"

یہ سنتے ہی نواب حسام الدّولہ نے (جو شیعہ تھے) نواب شرف الدّولہ (سُنّی) کا نام اس منصب کے لیے پیش کیا۔

جواہر علی خاں نے مذہبی اختلاف" کی بنا پر اس نام کی تائید کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے لوگوں نے جواہر علی خاں کو جھاڑ بتائی، اور جملہ حاضرین نے نواب شرف الدّولہ کو، اُن کے اخلاص اور قابلیت کی بنا، سب سے بہتر اور موزوں تر خیال کیا۔

حضرت محل نے کہا :

" صرف شرف الدّولہ کا نام ایسا ہے، جس پر کسی قسم کا اختلاف ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ ہم انھیں اس منصب پر فائز کرتے ہیں۔"

حضرت محل کے اس فیصلے نے سب کو خاموش کر دیا۔

نواب ممّو خاں شرف الدّولہ کو اپنے ساتھ خاص مکان میں لائے، مرزا برجیس قدر

”مقابلہ تو دلِ ناتواںؔ نے خوب کیا“

اب اودھ کی عنانِ حکومت سر ہنری لارنس کے ہاتھ میں تھی، اوٹرم صاحب اپنی تمام خدماتِ جلیلہ کے باوصف پس منظر میں چلے گئے تھے۔

لکھنؤ میں جو انگریز تھے ان کا محاصرہ نئی شاہی فوج نے کر لیا، انگریز محصورین کی مدد کے لیے جنرل اوٹرم اور جنرل ہیولاک نے لکھنؤ کی طرف پیش قدمی کی، لیکن نہ صرف یہ کہ محصور انگریزوں کو بچانے میں یہ کامیاب نہیں ہو سکے، بلکہ جنگِ آزادی کے سپاہیوں نے، اس جوش و خروش، اور ہمت و مردانگی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا کہ یہ خود بھی محصور ہو گئے۔

آخر کمانڈر انچیف سر کولن کیمبل ایک بڑا لشکر لے کر وارد ہوا، اس نے انقلاب پسند دل کی قوت میں رخنہ پیدا کر دیا، ایسے زور کا رن پڑا کہ خاص بازار کے در و دیوار خون سے رنگین ہو گئے، عالم باغ، دل کشا، اور سکندر باغ میں اتنا خون بہا کہ ہر پھول پر لالہ کا گمان ہوتا تھا [1]

ہر طرف جنگ کا بازار پوری شدّت کے ساتھ گرم تھا،

خیرآباد ڈویژن میں سیتا پور، خیرآباد، محمدی، اور ملاؤں میں ایک انگریز سپاہی بھی باقی نہیں رہ گیا تھا، شاہجہان پور میں اور محمدی میں انقلاب پسندوں اور انگریزوں کے مابین زبردست جنگ ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز بہ تعدادِ کثیر قتل ہوئے۔ [2]

لکھنؤ کے قریب ایک موضع چنہٹ پر سر ہنری لارنس اپنی فوج لے کر چڑھ دوڑے،

---

[1] : کمپنی کی حکومت، ص ۳۶۸

[2] : تاریخ ہند (ذکاء اللہ) ص ۵۴۶

میں نے دو دو دفعہ یہ الفاظ دُہرائے، تیسری مرتبہ پھر جب میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے نحیف آواز میں کہا :

" میں تو مارا گیا۔!"

اتنے میں ایک جھٹکے کے ساتھ پنکھا فرش پر آگرا، جب بتدریج گرد اور چونا کم ہوا تو میں نے دیکھا کہ سر ہنری خون میں تربتر پڑے ہیں۔

۳۲ رجمنٹ کے کچھ گورے کمرے میں آئے، انھوں نے سر ہنری کو کرسی پر بٹھایا، تو میں نے دیکھا سر ہنری مہلک طور پر زخمی ہوئے ہیں، پنکھا قلی کا ایک پاؤں گولے کے ایک ٹکڑے سے اڑ گیا ہے، علاج میں بڑی دوادوش کی گئی، مگر وہ بچ نہ سکے۔ [1]

سر ہنری لارنس کی ہلاکت نے انگریزوں کے حوصلے پست کر دیئے، یہ شخص ۴۰ سال سے اپنی حکومت کی خدمات انجام دیتا چلا آرہا تھا، بڑا مشاق، سرد و گرم چشیدہ، تجربہ کار اور باہمت شخص تھا، اس کی ہلاکت نے محصورین بیلی گارد (ریذیڈنسی) کی ہمت توڑ دی، اور ان پر یاس کا عالم طاری ہو گیا۔!

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۸۳۳

مگر جہاں انقلاب پسندوں کی موجودگی بتائی گئی تھی کوئی نظر نہ آیا، آخر واپسی کا فیصلہ کیا، یکایک درختوں کی اوٹ سے گولیاں چلنے لگیں، بہت سے انگریز، اور ان کے وفادار ہندوستانی سپاہی مارے گئے، بقیہ لوگوں کو سر ہنری لارنس بڑی مشکل سے نکال لانے میں کامیاب ہوئے۔ ؎

ریذیڈنسی کا محاصرہ بڑی سختی سے انقلاب پسندوں نے کر رکھا تھا، سر ہنری لارنس بھی یہیں اپنے سپاہیوں کے ساتھ مقیم تھے۔ ان محصورین کا خیال یہ تھا کہ باہر سے کمک آجائے، تو باہر نکلیں اور انقلاب پسندوں کا مقابلہ کریں۔

انقلاب پسندوں کی ہمت اور جرأت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ریذیڈنسی کے محاصرے کے دوران میں انھوں نے سر ہنری لارنس کو ہلاک کر دیا، اس واقعہ کی تفصیل کیپٹن والسن نے بیان کرتے ہوئے کہا :

"ایک کمرے میں جہاں سر ہنری اور ان کے سیکرٹری بیٹھے کام کر رہے تھے، ایک گولہ آکر پھٹا۔ ہم نے انھیں ترغیب دی کہ یا تو ریذیڈنسی چھوڑ کر کہیں اور جا رہیں، یا نیچے تہ خانے میں چلے جائیں" مگر انھوں نے ہنس کر کہا :

"باغیوں کو میں اتنا اچھا نشانہ باز نہیں سمجھتا کہ دوسرا گولہ پھر اسی جگہ مار سکیں گے!"

"دوسرے روز ہم لوگ اسی کمرے میں کام کر رہے تھے، سر ہنری لارنس کا بھتیجا جان لارنس ایک صوفے پر لیٹا ہوا تھا، وہ بولتے جاتے تھے، میں لکھتا جاتا تھا، یکایک میں نے دیکھا کہ ایک شعلہ چمکا، خوفناک گڑگڑاہٹ ہوئی اور اندھیرا گھپ ہو گیا، میں فرش پر گر پڑا، اور چند منٹ تک بے دم پڑا رہا، پھر بہ مشکل کھڑا ہوا، مگر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، گرد و غبار اور دھویں سے بھرا ہوا تھا۔

سر ہنری اور ان کا بھتیجا جان دونوں خاموش تھے، میں نے چیخ کر پوچھا :

"سر ہنری کیا آپ کے چوٹ آئی ہے؟"

؎ : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۸۲۵

اور کاروبارِ حکومت انجام دینے لگے، خود بہادر خاں کی یہ خواہش نہیں تھی، بلکہ بریلی اور مضافاتی علاقوں کے لوگوں نے انھیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے، اور اُمورِ مملکت سرانجام دینے پر مجبور کر دیا۔

بہادر خاں نے دس مہینے تک حکومت کی، اس کے بعد گرفتار ہوئے، ——— اور پھانسی پائی،!

لیکن اس دس مہینے کی مدت میں اپنے زیرِ حکومت علاقے کو اس درجہ سرسبز و شاداب اور مرفہ حال بنا دیا، اور ایسا امن و امان قائم کیا کہ اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے، [1]

حضرت محل نے جن لوگوں میں آزادی کا ولولہ بھر دیا تھا، ان میں ایک مرہٹہ سردار تانتیا ٹوپے بھی تھا، ——— یہ جُون ۱۸۵۸ء سے دسمبر ۱۸۵۸ء تک مسلسل انگریزوں کے لیے دردِ سر بنا رہا، کبھی کوٹہ میں ہے، کبھی جے پُور میں، کبھی لکھنؤ میں ہے کبھی جھانسی میں، متعدد بار انگریز فوجوں سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ لیکن یہ گوریلا جنگ کا سب سے زیادہ ماہر تھا۔ کبھی کُھل کر میدان میں نہیں آیا۔ لیکن جب انگریزوں سے ٹکر ہوئی انھیں بے حساب نقصان پہنچایا، انجام اس کا بھی بہادر خاں کا سا ہُوا ——— یعنی سوتے میں دشمنوں نے گرفتار کر لیا، اور پھانسی دے دی، لیکن مرتے مرتے بھی وہ یہ ثابت کر گیا کہ گوریلا جنگ میں اس کا کوئی حریف نہیں ہے، [2]

انہی دلدادگانِ حریّت میں ایک عظیم اللہ خاں تھا،!

ایک غریب خاندان کا فرد، لیکن حد درجہ ذہین، بہت جلد اُس نے ترقی کے مدارج طے کرنا شروع کیے، ناناصاحب کا معتمدِ خاص بن گیا، لندن گیا، فرانس گیا، ٹرکی گیا، اور

---

[1] : ایسٹ انڈیا کمپنی

[2] DISCOVERY OF INDIA.
(JAWAHER LAL NEHRU.)

(۲)

یہ عجیب اتفاق ہے، دِلّی کی جنگِ آزادی چند ماہ میں ختم ہوگئی، اور انگریزوں نے لال قلعہ پر قبضہ کر کے بہادر شاہ کو گرفتار کر لیا، مقدمہ چلایا، ——— اور جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا۔

لیکن، ———

لکھنؤ نے دس مہینے تک جنگ پُوری شدت اور شجاعت کے ساتھ جاری رکھی،!

بہادر شاہ ظفر کے اعلانِ آزادی سے ایک والئ ریاست بھی متاثر نہیں ہُوا، نہ انگریزوں سے بغاوت کرنے پر تیار ہُوا۔

لیکن حضرت محل کے اعلانِ آزادی نے، نہ صرف اودھ میں بلکہ پُورے یوپی میں حریت اور آزادی کی ایک لہر دوڑا دی، اور اکثر سابق فرماں روایانِ علاقہ کی اولاد، عوام کے امراء، خواہش اور استدعا پر اٹھ کھڑی ہُوئی۔ اس نے حکومت پر قبضہ کیا، اور صرف دس ماہ کی مختصر مدت میں ایسے عظیم و جلیل کارنامے انجام دیئے، جو تاریخِ حریّت کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن چکے ہیں،!

چنانچہ حضرت محل کے اعلانِ آزادی سے متاثر ہو کر میدان میں آنے والوں میں ایک بہادر خاں بھی تھے،

یہ حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے جو روھیل کھنڈ کے فرماں روا تھے۔

بہادر خاں نے بریلی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ ایک ہندو سابھورام کو وزیرِ اعظم مقرر کیا۔

اور اپنے معتمدین میں شریک کر لیا۔ جب انگریزوں سے لڑائی چھڑی تو سب سے زیادہ حتیٰ کہ خود بہادر خاں سے زیادہ جس شخص نے شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا، ——— وہ یہی فیروز شاہ تھے، لے

پھر بریلی سے دل برداشتہ ہو کر یہ سندیلہ آئے، سرکاری تھانہ لوٹ لیا۔ اکثر اضلاع، تھانہ جات، بانگرمئو، اور صفی پور وغیرہ کو غارت کیا، وہاں سے خیرآباد آئے۔ وہاں کے ناظم (کمشنر) ہر پرشاد کو اور مولوی محمد ناظم کو، راجہ پروا کی مدد کو بھیجا، اور خود جس ضلع کی طرف سے گزر جاتے آتش زنی کر کے اسے غارت کر دیتے، انگریزی فوج سے بھی کئی مرتبہ ٹکر ہوئی، اس کے چھکے چھڑا کر اس صفائی سے نکلے کہ کہیں سراغ نہ لگا، جب انقلاب پسندوں کو شکست ہوئی روس بھاگ گئے۔ لے

" کمپنی بہادر" نے کمزوروں پر اپنی "بہادری" کا سکّہ جمانے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ وسطِ ہند ایک چھوٹی سی ریاست جھانسی کی تھی، جس کا فرماں روا مر گیا تھا، مگر متبنیٰ، زندہ تھا اور رانی لکشمی بائی بھی۔

انگریزوں نے بغیر کسی معقول سبب کے یہ ریاست منبط کر لی، اور رانی کا گزارہ ساٹھ ہزار سالانہ مقرر کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ مہاراجہ کا سارا قرضہ بھی اسی پر ڈال دیا، کہ وہی ادا کرے۔!

لیکن جب میرٹھ سے انقلاب کی چنگاریاں بھڑکیں، اور لکھنؤ میں جنگِ آزادی کا آغاز ہوا، تو لکشمی بائی بھی مردِ میدان بن کر جنگ کے میدان میں وارد ہوئی۔!

لے : العلم، جنگِ آزادی نمبر

لے : قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۵۰۶

جواہر لال نہرو نے فیروز شاہ، اور تانتیا ٹوپے کو گوریلا جنگ کا بہترین ماہر تسلیم کیا ہے۔

جہاں گیا، انگریزوں کے خلاف زہر پھیلا تا گیا۔

نانا صاحب کی بعض ناقابلِ برداشت حرکتوں سے تنگ آکر ان کا ساتھ چھوڑ دیا، لکھنؤ آیا، اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ بیلی گارد (ریذیڈنسی) کے محاصرے میں بھی اس نے عملی حصّہ لیا، ؎۱، جب تک زندہ رہا، انگریزوں کے ساتھ دشمنی کرنے، اور انھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

مجاہدینِ آزادی میں ایک اہم ترین شخصیت فیروز شاہ کی تھی:

فیروز شاہ دلّی کے خاندانِ شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ نہ شاہی کی ہوس تھی، نہ سُلطانی کا شوق تھا۔ انگریزوں کے خلاف دل میں لاوا اپھٹ رہا تھا۔ جنگِ آزادی شروع ہوئی، تو آگرہ اور دوسرے مقامات پر تاریخی کارنامے انجام دیتے ہوئے لکھنؤ آئے۔

یہاں آنے کے بعد بعض لوگوں کو شبہ ہوا، خاندانِ شاہی سے تعلق رکھتے ہیں، کہیں خود ہی موقع پاکر تخت و تاج کے مدعی نہ بن جائیں۔ رائے دی گئی کہ انھیں لکھنؤ سے رخصت کر دیا جائے، لیکن حضرت محل نے یہ رائے رد کر دی، انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے لیے چھتر منزل وقف کر دی، کہ آرام سے رہیں، پانچ ہزار روپیہ نقد بطور نذرانۂ مہمانی کے دیا ؎۲

لیکن فیروز شاہ بدقسمت بھی تھے، ــــــــــــــ مولوی احمد اللہ شاہ سے ان کی نہ نبھ سکی، اور مولوی صاحب نے انھیں لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لکھنؤ سے رخصت ہو کر بریلی گئے، جہاں بہادر خاں حکومت کر رہے تھے۔ پہلے تو وہ بھی ڈرے کہ کہیں جہاد کے پردے میں حکومت کی ہوس کام نہ کر رہی ہو، بریلی میں داخلے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

لیکن ان کے اخلاص، اور صداقت کا یقین ہو گیا، تو بریلی آنے کی اجازت دے دی،

؎۱ : غدر کے چند علماء

؎۲ : قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۳۶۸

پست کر دیئے، مگر رانی کا میرِ آتش غوث محمد خاں، مغربی دروازے سے برابر توپیں چلاتا رہا۔ اس توپ زنی میں انگریزوں کو اپنے ایک بہترین توپچی سے ہاتھ دھونا پڑے، ——— رانی غوث محمد خاں کے اس کارنامے سے اتنی خوش ہوئی، کہ اپنی پازیب انعام میں پیش دی، [1]

غوث محمد خاں، اور خدا بخش خاں پر رانی سب سے زیادہ بھروسا کرتی رہی اور دونوں نے بھی اپنی جان نثار کر کے حقِ وفا ادا کر دیا، [2]

حالات سے مجبور ہو کر رانی جب جھانسی سے نکلی، تو تین سو افغانی سپاہی اسے جھرمٹ میں لیے ہوئے تھے، [3]

مہارانی لکشمی بائی نے جس وقت آزادی کی جنگ شروع کی، اور جس دن اِس دُنیا سے رخصت ہوئی۔ ——— اس ساری مدت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ جھانسی ایک ھندو ریاست نہیں ایک مسلم ریاست ہے!

اللہ اکبر کے نعرے!

مسجدوں میں اذانیں۔!

حملہ کرتے وقت یاعلی کا پُر جوش نعرہ!

خانقاہوں، عبادت گاہوں اور مسجدوں میں دعائیں۔!

مولویوں، عالموں اور حریفوں سے کامیابی و کامرانی کی دعا کے لیے نیازمندانہ اصرار، ظاہر ہے، جب ریاست ھندو تھی تو اس کے منصب داروں اور عہدے داروں، وزیروں اور مشیروں میں بھی ھندو ہی ھندو تھے، اس کے شوہر کے دور میں بھی یہی

---

[1] : تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

[2] : کمپنی کی حکومت۔

[3] : تاریخ بغاوتِ ہند (ذکاء اللہ)

لکشمی بائی نے جب آزادی کا اعلان کیا تو سارے شہر میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی ۔ اسے چونکہ مسلمانوں سے زیادہ تعلق خاطر اور ان پر زیادہ اعتماد ، اور اسلام کا احترام دل میں جاگزیں تھا ، اس لیے تخت نشینی کے موقع پر اس نے پنڈتوں کے بجائے ، مولویوں اور عالموں سے دعائے خیر اپنے لیے کرائی ، اور انھوں نے سچّے دل سے اسے دعائے کامیابی دی [1]

رانی لکشمی بائی نے بہت جلد اپنے میر آتش غوث محمد خاں کی مدد سے فوج مرتب کر لی ، چونکہ انگریزوں سے اور ان کی بدعہدی اور بدنفسی سے بہت جلی ہوئی تھی ، اس لیے جھانسی میں جتنے انگریز عہدے دار تھے ——— کو قتل کرا دیا ۔

انگریز لشکرلے کر آگے بڑھے ، لیکن وہ بھی ارادے کی پکّی تھی ، پیچھے نہیں ہٹی ۔ بہادری سے لڑتی رہی ۔ ایک مرہٹہ راجہ (گوالیار) بجائے اس کے کہ اس کی مدد کرتا ، انگریزوں کی مدد کرنے لگا ۔ ——— تاتیا ٹوپے وغیرہ کے مشورے سے رانی نے فیصلہ کیا کہ گوالیار قبضہ کر لیا جائے ، اور اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوگئی ، مہاراجہ گوالیار بھاگوں بھاگ آگرہ پہنچا اور اپنی بپتا سنائی ، اور وہاں سے ایک بڑی انگریز سپاہ لے کر لڑنے آیا ، اس جنگ میں اس کا گھوڑا ایک کھائی میں گر پڑا ، اور رانی ہلاک ہوگئی ، !

رانی جھانسی کی ساری کامیابیاں اور اس کے سارے کارنامے ، اس کے وفادار ، اور مخلص مسلمان ملازموں اور عہدے داروں کے تعاون ، فداکاری اور جاں نثاری کا نتیجہ تھے ۔

رانی کی فوج میں کالے خاں رسالدار ، محمد حسین تحصیلدار ، اور حکیم صالح محمد وغیرہ ، سراپا جوش و عمل بنے ہوئے تھے [2] ، قربانی ، اور جاں نثاری کا کوئی موقع ہو یہ سب میں پیش پیش اور سب سے آگے آگے ، !

جھانسی کا جب انگریزوں نے محاصرہ کیا ، تو ان کی توپوں نے انقلابیوں کے حوصلے

---

[1] : تاریخ بغاوتِ ہند (ذکاء اللہ)

[2] : تاریخ بغاوتِ ہند (ساوارکر)

آج ایک ہی میز پر حضرت محل، ممّن خاں، صمصام الدّولہ، نازو، اور زمرّد کھانا کھا رہے تھے، حضرت محل بہت خوش تھیں، انھوں نے ممّن خاں اور صمصام الدّولہ کی طرف دیکھ کر کہا :

" اور لوگ بھی بہت کام کر رہے ہیں، اور نہایت ممنونیّت کے ساتھ، مجھے اعتراف ہے کہ بہُت اچھا کام کر رہے ہیں، ان کا اخلاص، حبِ وطن، وفاداری، اور جاں نثاری ہر چیز شک و شبہ سے بالا ہے، لیکن آپ دونوں نے جس طرح خفیہ تحریک چلائی اور اب تک اس سے کام لے رہے ہیں، وہ تحسین و ستائش سے بے نیاز ہے، ! "

ممّن خاں نے کہا :

" ہم تو سرکار عالیہ کے جاں نثار ہیں، ——————— نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا، ! "

زمرّد چڑاتے ہوئے کہنے لگی :

" اے ہے، بڑے نیک، بڑے سیدھے، بیچارے کچھ جانتے ہی نہیں ! "

ممّن خاں بھڑک اُٹھے :

" ان باتوں کا بھلا یہ کیا موقع ہے ؟ "

وہ ایک ادا کے ساتھ گویا ہُوئی :

" جو بات جس وقت ہمارے منہ سے نکل جائے با موقع ہے ! "

حضرت محل ہنسنے لگی، اس نے زمرّد سے کہا :

ہو تا رہا تھا۔

لیکن !

مہارانی کے مشیر اور معتمد صرف مسلمان تھے ، !

غوث محمد خاں کے تدبّر ، بہادری اور بے جگری پر اسے ناز تھا۔

دُوسرے ملازمین سرکار بھی جاں نثاری میں کوئی دقیقہ فروگزاست نہیں کرتے تھے !

اور مسلمان رعایا نے بھی حقِ وفا ادا کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ، دونوں کے مذہب جُدا تھے ، لیکن مقصد ایک تھا ، اور مقصد کی وحدت نے ، سب کو یک جان دو قالب کر دیا تھا ، !

حضرت محل نے کہا :

" نواب صاحب یہ ایسا پھول ہے جو سر ہی پر زیب دیتا ہے !"

نازو بولی :

" سرکار عالیہ ایسا نہ کہیئے ، نواب صاحب بہادر کا بس چلے تو اس پھول کو پاؤں تلے روند ڈالیں ، ــــــــــــ مجھے بھی قسم ہے جو اب اس مردوے کی حویلی میں قدم رکھوں ، بس اب تو میں سرکار عالیہ ہی کے پاس زندگی بھر رہوں گی ، !"

صمصام الدولہ نے پریشان ہو کر کہا :

" واقعی خفا ہو گئیں ؟"

" جی نہیں غیر واقعی خفا ہوئی ہوں ، !"

" میں نے مذاق کیا تھا ، !"

" مجھے مذاق آتا نہیں !"

" کیا تمھارا خیال ہے سرکار عالیہ رکھ لیں گی تمھیں اپنے قدموں میں ، ؟"

" کیوں نہیں رکھیں گی ، ہمارا بچپن کا عہد ہے !"

حضرت محل نے مسکراتے ہوئے کہا :

" ہاں بھئی ، عہد تو ہے ، ــــــــــــ لیکن نازو اس وقت تو واقعی بے بات کی بات پر تم خفا ہو گئیں نواب صاحب سے !"

وہ بولی :

" سرکار عالیہ آپ نہیں جانتیں ، یہ میرا بہت جی جلاتے ہیں ، اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے !"

حضرت محل نے کہا :

" چل پگلی یہ بے چارے تو دشمن کا دل بھی نہیں جلا سکتے ، تیرا کیا جلائیں گے ، ؟"

وہ روٹھتی ہوئی بولی : " آپ کی ان ہی باتوں نے تو ان کا دماغ عرش پر پہنچا دیا ہے

"چُپ رہے گی یا نہیں ؟"

وہ بظاہر رُوٹھتی ہوئی خاموش ہوگئی !

حضرت محل نے شوخ نظروں سے نازو کی طرف دیکھا اور کہا :

"تعجب ہے، آج ہماری بلبل خوش نوا نہیں چہک رہی ہے، کیوں نواب صاحب آپ نے اسے خفا تو نہیں کر دیا ہے ؟"

صمصام الدولہ نے زیرلب تبسم کے ساتھ کہا :

"نہیں سرکار، مَیں انھیں کیا خفا کروں گا، ——— یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے !"

نازو اٹھلاتی ہوئی بولی :

"اچھا اب زیادہ نہ اتراؤ، ورنہ پھر مَیں بھی کچھ کہہ دوں گی، !"

صمصام الدّولہ نے کہا :

"ہم تو چاہتے ہیں، کچھ کہو، ——— واقعی تمھاری یہ خواہ مخواہ کی خاموشی کھل رہی ہے ؟"

"اے ہے بڑے آئے ہماری پروا کرنے والے !"

"تو کیا کوئی اور یہ فرض میری طرف سے ادا کر رہا ہے ؟"

"دیکھئے نواب صاحب، اس طرح کی باتیں نہ کیجئے، یہ ہماری نازو پھر واقعی خفا ہو جائے گی، ——— یہ تو بعض وقت مجھ تک سے خفا ہو جاتی ہے، اور مجھے منانا پڑتا ہے، !"

"ایں یہ گستاخی، ؟ یہ لغویّت ؟ یہ جرأت، ؟ ——— کم از کم مَیں تو یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتا، ——— سرکارِ عالیہ نے بہت سر چڑھا رکھا ہے انھیں، ———

باتوں باتوں میں صمصام الدولہ نے کہا :

"سرکار عالیہ کو یہ فدوی ایک بہت بڑی خوش خبری بھی سنانا چاہتا ہے!"

حضرت محل نے سراپا گوش بن کر پوچھا :

"کیا ہے وہ خوش خبری؟ ضرور سنایئے!"

صمصام الدولہ نے جواب میں عرض کیا :

"ایک بہت بڑی ہستی، ——————— جو علم و فضل میں یگانہ، منطق اور فلسفہ میں ایشیا بھر کے اندر منفرد، علوم عقلی و نقلی میں ماہر، حدیث و تفسیر میں یکتا، اور عمل و کردار کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے، ——————— ہمارے ساتھ شریک ہوگئی ہے!"

"(بے انتہا مسرور ہوکر) کون ہے وہ ہستی؟"

"حضرت مولانا فضل حق خیرآبادی[۱] دامت برکاتہم!"

"(بہت زیادہ خوش ہوکر) کیا واقعی؟"

"فدوی بھلا سرکار عالیہ سے غلط بات کہہ سکتا ہے؟"

"تو ان کی قرار واقعی منزلت ہونی چاہیئے!"

---

[۱] : غدر کے چند باغی علماء

لیکن میرا نام بھی نازو نہیں، اگر ایک ہی جھٹکے میں انھیں عرش سے فرش پر نہ پہنچا دوں!"

صمصام الدولہ نے کہا :

"فرش پر تو ہم بیٹھے ہوئے ہیں، عرش پر فی الحال جانے کا ارادہ نہیں، !"

نازو نے حضرت محل سے کہا :

"سرکار عالیہ انھیں روک لیجیے، ورنہ پھر مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا، !"

صمصام الدولہ نے چھیڑتے ہوئے کہا :

"نہ ہے نہ ہو سکتا ہے، !" ——— یہ تو ہمیں تسلیم ہے!"

حضرت محل، زمرّد، مٹھن خاں، سب ہی ہنسنے لگے، !

◎

"بلاشبہ، بے شک!"

"لیکن اس اعتبار سے اور زیادہ ہمیں اُن پر فخر و ناز ہے کہ وہ ہماری سلطنت کی ایک اہم نظامت (کمشنری) خیرآباد کے رہنے والے ہیں، ——— جہاں اس پایہ کے عالم، صوفی، مشائخ، اور بزرگ گزرے ہیں کہ اسے 'خیرآباد شریف' کہا جاتا ہے!"

"جی، بجا ارشاد ہُوا سرکارِ عالیہ!"

"ایک بات کا اور سختی سے خیال رکھیئے!"

"وہ کیا سرکارِ عالیہ؟"

"مولانا جب دربار میں تشریف لائیں تو دربار کی تمام رسمی پابندیوں سے انھیں مستثنیٰ کر دیا جائے، وہ اپنے معمولی لباس میں تشریف لائیں۔ ہم سرو قد کھڑے ہو کر، ان کی تعظیم کریں گے، اور انھیں مسند پر بٹھائیں گے، جب وُہ تشریف رکھ لیں گے، تب خود بیٹھیں گے!"

"ایسا ہی ہوگا، ——— سرکارِ عالیہ کی یہ علم پروری اپنا جواب نہیں رکھتی!"

"جس ملک میں علم، اور عالم کی قدر نہ ہو، وہ تباہی سے نہیں بچ سکتا۔"

نازو نے بڑی سادگی سے سوال کیا:

"سرکارِ عالیہ، یہ سوجھ بوجھ اور یہ باتیں آپ میں کہاں سے آ گئیں؟"

حضرت محل نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا:

بقیہ حاشیہ، صفحہ نمبر ۶۵۰

حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا دی۔ جہاں انھوں نے عربی زبان کا لافانی "قصیدہ غدریہ" لکھا اور وفات پائی، مگر نہ معافی مانگی نہ کسی سہولت کے طالب ہُوئے!

"بے شک، بالکل بجا فرمایا، !"

"کل انھیں دربار میں پیش کیجئے !"

"یہ فخر بھی حاصل کروں گا۔ !"

"انھیں ہم قاضی القضاۃ کا منصب عطا کریں گے !"

"حق بہ حقدار رسید !"

"اپنے مشیروں کی کونسل کی ممبری بھی انھیں عطا کریں گے، !"

"وہ اس اعزاز کے ہر طرح مستحق ہیں !"

"صرف یہی نہیں، ———— انھیں اپنا ذاتی مشیر باختصاص بھی بنائیں گے !" ؎

"بے شک وہ اس اعزاز کے بھی سزاوار ہیں، !"

"ہمیں معلوم ہے، ———— مولانا بہت نازک طبع ہیں، اور اس پائے کے عالموں کو نازک طبع ہونے کا حق بھی ہے، خبردار، کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف نہ ہونے پائے !"

"بہت خوب سرکارِ عالیہ !"

"مولانا فضل حق ہندوستان کے کسی مقام سے بھی تعلق رکھتے ہوں، بہ حیثیت مسلمان کے ہم اُن پر فخر کرتے ہیں، !"

؎ : مولانا فضل حق خیرآبادی، نہ صرف مذکورہ بالا علوم میں یگانہ، اور ماہر تھے، بلکہ عربی زبان پر بھی انھیں غیر معمولی دسترس حاصل تھی، انگریزوں نے انقلاب پسندوں پر فتح پانے کے بعد مولانا فضل حق پر مقدمہ چلایا، ان کی ساری ذاتی جائداد ضبط کر لی، جو لاکھوں کی تھی، کیوں کہ مولانا جتنے بڑے عالم، اتنے ہی بڑے تاجر بھی تھے، اور انھیں (باقی اگلے صفحہ پر)

(۵)

دلّی کو تو بڑی آسانی سے انگریزوں نے سکھوں، اور پنجابی رجمنٹوں، اور اپنے وفادار ہندو مسلم سپاہیوں کی مدد سے فتح کر لیا تھا۔

لیکن، ————

اودھ کے فتح کرنے میں لوہے لگ گئے، !

اس لیے کہ اودھ میں، ہر گاؤں ایک گڑھی بنی ہوئی تھی !

ہر شہر، ایک مستحکم قلعہ کی حیثیت رکھتا تھا، !

ہر شخص، جان ہتھیلی پر رکھ کر، دشمن سے لڑ کر اسے مارنے یا مرنے پر تیار تھا، !

انگریزوں کے مقابلے میں، اودھ کے مختلف شہروں کے اندر نئی نئی طاقتیں اُبھر رہی تھیں۔!

انہی طاقتوں میں !

ایک چٹان وہ بھی جس کا نام محمود خاں تھا، اور جس سے ٹکرا کر انگریزوں کے سر ٹوٹے، اور پھوٹے، اور وہ خود لہو لہان ہو کر رہ گئے، !

محمود خاں، ———— نواب نجیب الدولہ کا پوتا تھا، جن کی انگیخت پر احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں ———— "گریٹ مرہٹہ ایمپائر" ———— کے خوابِ شیریں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خوابِ پریشاں

"تجھے نہیں معلوم، ؟ ——————— رستے میں پڑی تھیں اٹھا لائی، شاید تجھے بھی کسی دن مل جائیں ؟"

وہ ایک مرتبہ پھر روٹھ سی گئی،

حضرت محل نے اسے گلے سے لگا لیا - !

"بھئی ہم سے خفا نہ ہوا کرو !"

وہ مسکرا دی، !

صمصام الدّولہ نے ہنستے ہوئے کہا :

"کیا طبیعت پائی ہے، کبھی ابر کاری، کڑک اور گرج کے ساتھ، کبھی بجلی ضو فشانی اور نور افشانی کے اعتبار سے، کتنی جلدی خفا ہوتی تھیں اور کس تیزی سے مسکرائی ہیں !"

نازو گھور کر رہ گئی، کچھ بولی نہیں !

◎

اپنے علاقے میں ممّو خاں نے بھی اتنا اچھا انتظام کیا، اور ایسا امن و اماں قائم کیا اور ہر قوم سے مساوات کا ایسا برتاؤ کیا کہ سب اُس کی درازیٔ عمر و اقبال کے دعاگو بن گئے"!

انگریزوں نے لاکھ سر پٹکا، مگر وہ ان کے دام میں نہ آیا! [1]

اسی طرح نانا نے کانپور میں اپنی حکومت قائم کر کے انگریزوں سے زبردست انتقام ان کی بد عہدی اور بے وفائی کا لیا!

"انقلاب پسندوں کے جلسے بالعموم صوبیدار ٹکا سنگھ یا سپاہی شمس الدین کے مکان پر ہوتے تھے۔ جس دن انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ ہُوا شمس الدین نے اپنی محبوبہ عزیزن کو بتایا کہ جنگ شروع ہونے والی ہے۔ عزیزن ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ناچنا گانا اُس کا پیشہ تھا، سب سپاہی اس پر جان نثار کرتے تھے۔ لیکن وہ دولت کے لیے اپنا حُسن نہیں فروخت کرتی تھی۔ ان سپاھیوں پر فدا تھی، جن کے دلوں میں حُبِّ وطن کی آگ بھڑک رہی تھی"! [2]

نانا کے ساتھیوں میں، عظیمُ اللہ خاں اور تانتیا توپے وغیرہ تھے۔ عظیم اللہ خاں نے اس کے لیے بڑی گراں بہا خدمات انجام دیں۔

انگریزوں نے آخر کار، کانپور فتح کر لیا، لیکن نانا کو گرفتار نہیں کر سکے، وہ روپوش ہو گیا"! [3]

جنگ پُوری شدّت کے ساتھ جاری تھی!

"کرسٹن صاحب کمشنر خیرآباد کا بنگلہ دریا کے کنارے تھا، مع میم صاحبہ سوار ہو کر لکھنؤ

---

[1] : تاریخ بغاوتِ ھند (ذکاء اللہ)

[2] : تاریخ بغاوتِ ھند (ساورکر)

[3] : تاریخ عروجِ عہدِ انگلشیہ (ذکاء اللہ) ص ۵۴۲

میں تبدیل کر دیا تھا، [1]

محمود خاں نے جنگِ آزادی شروع ہونے کے کچھ روز بعد، نجیب آباد پر قبضہ کر لیا، نگینہ، دھام پور، بجنور اور آس پاس کے دُوسرے مقامات پر بھی اس کا پرچم لہرانے لگا۔ یہاں کے کلکٹر مسٹر شیکسپیئر نے جب کوئی چارۂ کار نہ دیکھا تو ازخود یہاں کا نظم و انتظام محمود خاں کے سپرد کر کے رڑکی روانہ ہو گئے، [2]

بہت جلد محمود خاں نے اپنی حکومت مستحکم کر لی، وہ اگر چاہتا تو سرسید کو جو یہاں کے صدر امین تھے، ان کے رفقاء کو اور انگریزوں کو بہ آسانی تہ تیغ کر دیتا، مگر اُس نے ایسا نہیں کیا، اس نے کسی کی بھی جان نہیں لی،

انگریزوں نے جب پھر یہاں تسلط چاہا، اور کامیابی کی کوئی راہ نہ دیکھی، تو بلدور کے ہندو چودھریوں کو، ـــــــــــ "ھندو مسلم" سوال سے متاثر کر کے اپنا طرف دار بنا لیا، انھوں نے نہ صرف محمود خاں سے مقابلہ کیا، بلکہ آس پاس کے علاقوں کے مسلمانوں کا بے دریغ قتلِ عام بھی کیا [3] محمُود خاں نے پھر بھی عام ہندوؤں سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ البتہ ہندو چودھریوں کی ایسی سرکوبی کی، اور انگریزوں کا اس دلیری سے مقابلہ کیا کہ سب ششدر رہ گئے، [4]

---

[1] : احمد شاہ ابدالی (ڈنگا سنگھ)

[2] : تاریخ سرکشیٔ بجنور (سرسیّد احمد خاں)

[3] : تاریخ سرکشیٔ بجنور (سرسیّد احمد خاں)

[4] : محمود خاں نے آخر وقت تک نہایت شجاعت سے مقابلہ کیا، جب انگریزوں کا ہر طرف مکمل تسلط ہو گیا، تو محمود خاں کا علاقہ بھی ان کے تصرف میں آیا، محمود خاں گرفتار ہوا اور اسے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی، لیکن سزا کے نفاذ سے پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ (تاریخ سرکشی بجنور۔) سرسیّد احمد خاں

بھی نہ دیکھا" ۱؎

اسی جنگ میں ، ایک شہسوار نے پرے سے نکل کر سواروں سے کہا :

" تم میں سے کون ایسا ہے جو اس پار جا کر صاحب کا سر لائے ، سب چپ ہو رہے اس نے پکار کر کلمۂ شہادت پڑھا ، زیر بند گھوڑے کا کاٹ دیا ، دریا سے مثل عقاب ، صاحب کے سر پر پہنچ کر پہلے گولی گھوڑے کو ماری ، صاحب نے دو نالی بندوق سر کی ۔ اس نے طمنچہ مارا ، صاحب ہلاک ہو گئے " ۲؎

دس مہینے کی مدت کم نہیں ہوتی ، اتنے طویل عرصے تک ایک ایسی حکومت سے دلیرانہ اور تہورانہ مقابلہ ، جو بنگال ، مدراس ، پنجاب ، میسور پر قابض ، اور جملہ ریاست ہائے ھند کو اپنے زیر سایۂ اقتدار لے چکی تھی ، کوئی معمولی کام نہیں تھا ، لیکن یہ کام جو کسی سے نہ ہو سکا ، ایک عورت ———— حضرت محل ———— نے کر دکھایا ، !

گرچہ تھے صفحۂ ہستی پہ ہم اک حرفِ غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے !

۱؎ : قیصر التواریخ ، ص ۳۱۳
۲؎ : قیصر التواریخ ، ص ۳۳۱

روانہ ہوئے، ــــــــــ پیچھے سے تلنگوں نے بندوق ماری، گر پڑے، اور ڈھیر ہوگئے، [1]

جنگ کی شدّت، اور انقلاب پسندوں کی دہشت کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ :

" شاہ جہان پور میں دو انگریز ایک زمیندار کے مہمان ہوئے، پانی پیا، اور روٹی کھائی، ــــــــ کہنے لگے :

" تین میمیں ہم سے چھُٹ کر تمھارے گاؤں کی طرف آئی ہیں تلاش کر دو! "

چوکیدار ان میموں کو تلاش کرکے ایک دھوبی کے گھر سے لایا، لیکن اس عرصے میں " صاحب " دہشت کے باعث لکھنؤ چلے گئے، میمیں چوکیدار کے ساتھ بہ مشکل لکھنؤ گئیں " [2]

لکھنؤ کی جنگ میں :

" صاحبان عالی شان نے گھونگھٹ کھایا، چاہا اسماعیل گنج میں پناہ لیں، وہاں نہ جاسکے، فوج باغی نے گنج کو اپنی پشت پر لیا، داھنے بائیں سے توپ چلنے لگی، لوہے کے پُل تک بڑا کھیت رہا، لاش پر لاش گرنے لگی، کپتان اینڈرسن کا بیان ہے کہ :

" ۱۹۱ گورے جان سے مارے گئے، صاحبانِ عالی شان بگٹٹ بھاگے، بیلی گارد (ریذیڈنسی) میں داخل ہوگئے، اور پیچھے مڑکر

---

[1] : قیصرالتواریخ، ص ۲۰۲

[2] : قیصرالتواریخ، ص ۲۰۲

بُزدل دُشمن کی ظُلم آرائیاں اور شر انگیزیاں

(۱)

آج انگریز مظلوم تھے، پٹ رہے تھے، کٹ رہے تھے، ـــــــــــ مارے جا رہے تھے، !

لیکن، ـــــــــــ

جب تحریکِ انقلاب نہیں اُبھری تھی ! ان سے بڑھ کر :

احسان فراموش، ـــــــــــ

بدخصلت !

گستاخ، ـــــــــــ

پیکرِ نخوت و رعونت، اور ـــــــــــ

ظلم و تشدد میں یکتا کوئی نہیں تھا، !

واجد علی شاہ جب معزول کر کے لکھنؤ سے کلکتہ بھیج دیئے گئے !

ابھی انھیں لکھنؤ چھوڑے چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ اودھ کے چیف کمشنر کی طرف سے بیگماتِ شاہی کے نام فرمان آیا کہ :

"محلات خالی کر دیں !"

جب انھوں نے تعمیل میں تامل کیا، تو ایک رات پولیس کے سپاہی پہنچے، اور راتوں رات سارا سامان باہر نکال کر ڈھیر کر دیا کہ ـــــــــــ جہاں جی چاہے

انگریزوں کو شبہ آشوبِ چشم کا ہُوا،
مگر فیل بان نے کہا :

"ہم تیس برس سے نوکر ہیں، یہ فیل خاک اڑاتے اور روتے ہیں"، [1]

واجد علی شاہ کو کتابوں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ایک بہت اچھا کتب خانہ تیار کیا تھا، جس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں بہ کثرت موجود تھیں۔

میجر کارینگی نے ایک دن سارا کتب خانہ جو فرح بخش کی الماریوں میں سلیقے، اور ترتیب سے قائم تھا، باہر نکلوا کر پھکوا دیا، [2]

---

[1] : قیصر التواریخ ، ص ۱۷۱
[2] : قیصر التواریخ ، ص ۱۸۲

جاؤ اور لے جاؤ ۔ !

یہی نہیں ، ——————

بلکہ منگل سین کی کوٹھی میں شاہی اشیاء کا نیلام ہُوا ، جو کئی دن تک جاری رہا ۔ !

۲۶ ستمبر کو ایک سیف نکلی ، اس پر —————— " سرکار ابو المنصور صفدر جنگ " ——

آب زر سے لکھا تھا ، یہ کوڑیوں کے مول نیلام کردی گئی ۔ !

۲۴ تاریخ کو ابو المنصور صفدر جنگ کی ایک توڑے دار بندوق چھ روپے میں

نیلام ہُوئی ۔ !

ایک اور بندوق پر نواب شجاع الدولہ کا نام ، اور —————— دُوسری پر نواب

آصف الدولہ کا نام کندہ تھا ، یہ سارا مال اسی طرح نیلام ہُوا کہ سَو روپے کا مال ایک روپیہ

میں نیلام ہُوا ، [۱]

جب تحریکِ انقلاب نے زور نہیں پکڑا تھا ! اور انگریز ابھی ریذیڈنسی میں پناہ گزیں

نہیں ہوتے تھے ، بلکہ لکھنؤ پر قابض تھے !

مچھی بھون پر پھانسی قائم تھی ، ہر روز سرسری سماعت کے بعد ، گروہ کے گروہ

پھانسی پاتے تھے ، [۲]

واجد علی شاہ کے اصطبل میں ، جہاں —————— گھوڑے تھے ، اونٹ تھے

خچر تھے ، وہاں ہاتھی بھی تھے ۔ !

انگریزوں نے ، ایک اشتعال انگیز حرکت یہ کی کہ بادشاہ کی ان تمام چیزوں کو

سستے داموں نیلام کر دیا ۔

" اکثر ہاتھی ، وقتِ نیلام سر پر خاک اڑاتے ، آنسو آنکھوں سے بہاتے ، اکثر

---

[۱] : اخبار طلسم لکھنؤ ، ۵ ستمبر ۱۸۵۷ء

[۲] : تاریخ ہند (بغاوت) ص ۴۶

بڑے سکون، سنجیدگی، متانت اور وقار کے ساتھ حضرت محل نے جواب دیا :

" جنگ میں ایک ہارتا ہے، ایک جیت جاتا ہے !"

" ہاں یہ تو ٹھیک ہے !"

" بس تو ہار ہمارے حصّہ میں آرہی ہے، سوچو تو سہی، ہاریں بھی، اور جشن بھی منائیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے، دیکھو پریشاں ہوگئیں نا ؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ تم ٹھہریں ہمراز، دم ساز، تم سے کوئی بات چھپا بھی تو نہیں سکتی، !"

نازو اور زمرّد نے جواب میں ابھی کچھ نہیں کہا تھا کہ منّن خاں اور صمصام الدّولہ آتے نظر آئے۔ یہ دونوں خاموش ہوگئیں !

◎

(۲)

چونکہ محل میں جہاں حضرت محل مقیم تھیں، اس وقت ایک بالکل خفیہ کانفرنس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، انھوں نے فوری طور پر صمصام الدولہ اور ممّن خاں کو طلب کیا تھا، !

نازو نے کہا :

"کیا بات ہے سرکار عالیہ آج آپ بہت پریشان نظر آ رہی ہیں ؟"

حضرت محل نے ایک سوگوار تبسم کے ساتھ کہا :

"جب تک لڑائی جاری ہے پریشانیاں تو برداشت ہی کرنا ہوں گی !"

وہ بولی : "یہ مُوئی لڑائی آخر ختم کب ہوگی ؟ شیطان کی آنت کی طرح اس کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے !"

حضرت محل نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا :

"قرینہ یہ ہے کہ جلد ختم ہو جائے گی !"

زمرّد بولی :

"پھر تو ہمیں جشن منانے کی تیاریاں شروع کر دینی چاہئیں !"

حضرت محل نے محبّت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا :

"لڑائی تو ضرور ختم ہو جائے گی، لیکن جشن کے بجائے مجلسِ ماتم بپا کرنے کا انتظام کرو !"

یہ سُنتے ہی نازو اور زمرّد کے چہرے زرد پڑ گئے، دونوں نے تقریباً بیک آواز پوچھا :

"یہ کیوں سرکار عالیہ، ؟"

یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ جیت گئے، اور ہم ہار گئے، !"

"پھر، ——— ؛ کیا سوچا ہے آپ نے ؟"

"ہماری رائے یہ ہے کہ جنگ جاری رکھی جاسکتی ہے، دشمن پر کاری ضرب لگائی جاسکتی ہے اس اثناء میں ممکن ہے قسمت ساتھ دے اور ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ہم دشمن کی کمر توڑ سکیں !"

"یعنی حالات کی ناسازگاری کے باوجود ابھی تک آپ کا حوصلہ اور جوش قائم ہے ؟"

"بے شک سرکارِ عالیہ !"

"ہمیں آپ کے اسی جواب کی توقع تھی، میں نے یہ کہنے کو بلایا ہے کہ حالات کی ناسا عدت کی ذرا بھی پرواہ نہ کی جائے، اور بچی کھچی قوت مجتمع کر کے تخت یا تختہ کہہ کر ایک مرتبہ آخری وار دشمن پر کر دینا چاہیئے !"

"ایسا ہی ہو گا سرکارِ عالیہ !"

"بس تو تشریف لے جائیے، اور اپنے فرائض انجام دیجیے !"

◎

(۳)

دونوں آئے اور مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے، حضرت محل نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"تشریف رکھیئے!"

دونوں بیٹھ گئے اور سوالیہ نظروں سے حضرت محل کی طرف دیکھنے لگے، حضرت محل نے بغیر کسی ہراس کے کہا:

"جنگ کا پانسہ پلٹ چکا ہے!"

"بے شک سرکار عالیہ!"

"دہلی کے سقوط کے اتنے دنوں بعد تک اتنی بڑی طاقت سے ہم لڑے، جی بھر کے لڑے، اور اس طرح لڑے کہ دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے!"

"جی بے شک،!"

"اگر ہم میں جاسوس نہ ہوتے، اگر ہمارے بادشاہ اور ان کے بزرگوں نے خفیہ طور پر اپنی طاقت بڑھانے کا انتظام کیا ہوتا، اگر ہمارے پاس روپیہ اور ضرورت کے مطابق سامانِ جنگ ہوتا، تو بے شک ہم جیت جاتے،!"

"کیا شبہ ہے اس میں سرکارِ عالیہ؟"

"لیکن اب ہم ہار رہے ہیں!"

"سرکار عالیہ یہ تو نہ ارشاد فرمائیں ـــــ بے شک انگریزوں نے سکھوں، پنجابی پلٹنوں، اور اپنے ہندو مسلم وفادار سپاہیوں کے ساتھ اب پورا زور ہمیں تہس نہس کرنے میں صرف کر دیا ہے، لیکن اس کے

انگریزی فوج نے شہر کے گرد آگ لگا دی، اور شہر پر قبضہ کر کے سات ہزار سے زیادہ آدمیوں کو پھانسی دی۔

کان پور میں نانا صاحب کی شکست کے بعد انگریزوں نے جب قبضہ کیا تو تین ہزار سے زیادہ آدمیوں کو پھانسی چڑھایا، [1]

ایک طرف، انگریزوں کی کامیاب یورش اور یلغار تھی، فتح و کامرانی تھی، دوسری طرف انقلاب پسند اب بھی لڑ رہے تھے، اور لڑے جا رہے تھے، !

صوبہ سنگھ کی پلٹن خوب لڑی، ایک ہزار سے زیادہ آدمی کام آئے، !

میر بخت علی خاں داروغہ توپ خانہ، مرزا امام علی بیگ صوبہ دار اپنے اسلحۂ حرب سے مستعد کھڑے تھے، ! دفعتہً گوروں کی پلٹن آ گئی، اور رشل عقاب جھپٹ پڑی، — گولہ انداز بھاگ گئے، ——— مگر یہ دونوں اپنی بہادری سے نہ ہٹے، داد مردانگی دے کر مارے گئے، [2]

لکھنؤ ہار رہا تھا !

دشمن چڑھا چلا آ رہا تھا، !

لیکن، ———

انقلابیوں کے حوصلے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، !

انگریزوں کے داخلۂ لکھنؤ کے وقت :

"غلام حسین کی مسجد پر، ہادی حسن خاں، اپنے جاں نثاروں کے ساتھ موجود تھے، مقابلہ ہوا، خوب تلوار چلی، خونِ ناحق خدا کے گھر میں پانی کی طرح بہا، سب کے سب لڑ بھڑ کر مارے گئے، ——— پانچ سو مسلمان شہید ہوئے، ایک سو

---

[1] : قیصر التواریخ، ص ۲۵۱

[2] : قیصر التواریخ، ص ۲۶۸

(۴)

حضرت محل کا اندازہ غلط نہ تھا، واقعی انگریز اب پوری قوت سے اودھ کی، انقلابی تحریک کو ——— کپورتھلہ، پٹیالہ، جیند اور فرید کوٹ کی فوجوں، پنجابی پلٹنوں اور اپنے وفاداروں ——— جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، ——— کا لشکرِ گراں لے کر اودھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔

ریذیڈنسی سے مخبروں، اور جاسوسوں کی ٹولیاں ہر روز نکلا کرتی تھیں، ان میں سے کچھ پکڑ بھی لیے جاتے تھے، اور ان کے پاس سے انگریز افسروں کے خطوط برآمد ہوتے تھے جن سے ان کی تیاریوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا، [۱]

جہاں موقع ملتا تھا، انگریزوں کی طرف سے لوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری تھا، کار بنگی صاحب نواب عظمت الدولہ کی حویلی میں داخل ہوئے، وہ اطمینان سے لنگی باندھے مسہری پر بیٹھے تھے، ان کا سارا مال و اسباب جو کئی لاکھ روپے کا تھا، لے کر چلتے بنے، [۲] صرف لنگی، مسہری اور حویلی باقی رہ گئی، ——— وہ بھی عارضی طور پر، !

الہ آباد پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا، !

یہاں ایک مولوی نے محمدی جھنڈا بلند کر کے تمام لوگوں میں بغاوت کے جذبات ابھار دیئے تھے، یہ لوگ بڑی دلیری سے لڑے اور انگریزوں کے چھکے چھڑا دیئے،

---

[۱] : قیصر التواریخ، ص ۲۳۹

[۲] : قیصر التواریخ، ص ۲۱۹

کے خلاف عمل میں لائی گئی، نہ کسی پر ظلم کیا گیا، بلکہ اودھ کے باشندوں نے سوا چند مشتبات کے عام طور پر پناہ گزیں انگریزوں کو نہایت مہربانی اور شفقت سے اپنے ہاں پناہ دی، حالانکہ وہ ناانصافیوں کے شکار رہ چکے تھے،" ؎۱

لیکن جب انگریز گرداب سے نکلے، اور فاتح کی حیثیت سے اُبھرے تو حال یہ تھا کہ:

"لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد، ہر ایسے ہندوستانی کو جو ذرا بھی مشتبہ نظر آیا، بغیر کسی سماعت، اور تحقیق کے پھانسی دے دی گئی،" ؎۲

یہی نہیں، بلکہ یہ لٹیرے بھی ثابت ہوئے:

ڈاکٹر رسل نے لکھنؤ کی لوٹ کا چشم دید حال لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:

"انگریز سپاہیوں نے اور ان کے ساتھیوں نے، لکھنؤ میں مکانوں کے کواڑوں کو توڑا، گھر میں گھس کر، زربفت، زردوزی اور کمخواب کے لباس، چاندی، سونے کے ڈھیر، چاندی کے برتنوں کے انبار، شالیں، دوپٹے، رضائیاں، آلاتِ موسیقی، تصویریں، کتابیں، محرم کے بیش قیمت علم سب لوٹ لیے، انھوں نے تمام جامہ ہائے زرّیں میں آگ لگائی کہ ان میں سے سونا چاندی نکال لیں زیوروں میں سے جواہر اکھیڑے، چینی کے برتنوں اور گلاسوں کو توڑا، تصویروں کو نذرِ آتش کیا۔" ؎۳

"نگینہ میں جو لوگ باغوں میں چھپے ہوئے تھے ان کا شکار کیا گیا، قاضی محلے کے سب آدمی مارے گئے، دھام پور کی سڑک پر جتنے بھی آدمی سواری پر ملے قتل ہوئے، چند باغی دیہات بالکل زمین کے برابر کر دیئے گئے،" ؎۴

انہی حرکتوں پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ جان لینے کے نت نئے طریقے سوچے گئے!

؎۱: FOREST, I, P: 222

؎۲: MAJENDIE, P: 195

؎۳: تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند) ذکاء اللہ، ص ۶۱

؎۴: تاریخ سرکشی بجنور (سرسید)

انگریز ہلاک ہوئے، [1]

گورے سپاہیوں پر نہتی خلقت ڈھیلے مار کر دل کا غبار نکالتی، اور جام شہادت نوش کرتی تھی، برف خانے کے پُل کے پاس ایسا ہی ہُوا، [2]

پانچ سو نجیبوں نے انگریزوں کی یلغار کرتی ہوتی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، سب موت کے گھاٹ اُتر گئے، [3]

بشیر الدولہ کے دروازے پر ایک ـــــ لڑکا خدا بخش، اور دو دوسرے ملازموں نے گوروں پر اتنے گروب مارے کہ وہ پلٹ گئے، [4]

ایک سیّد زادہ ـــــ توپ کے تخت کے نیچے چھُپ گیا، جب گورے سامنے آتے، اس نے پھُرتی سے توپ چلا دی، کئی گورے مارے گئے، باقی اُلٹے پاؤں موتی محل کے پُل کی طرف بھاگ گئے، [5]

عظیم اللہ خاں کے مکان کے پاس ایک انگریز پلٹن سے مقابلہ ہُوا، پچاس گورے مارے گئے، دو مسلمان شہید ہوئے، [6]

گورے، مرزا سکندر حشمت کی ڈیوڑھی پر آئے، سپاہیوں نے پھاٹک بند کر لیا۔ طرفین سے گولی چلنے لگی، سارے ملازم شہید ہوئے، [7]

حالانکہ جب تک یہ گورے مظلوم تھے، مسلمانوں نے ان پر کوئی خاص ظلم نہیں کیا، جس کا اعتراف انگریز مؤرخوں تک کو ہے۔

"دس دن کے اندر تمام اودھ میں انگریزی حکومت بے نام و نشاں ہوگئی۔ فوجوں نے اور عوام نے بغاوت کا اعلان کر دیا، لیکن اس تمام عرصے میں نہ کوئی منتقمانہ کارروائی انگریزوں

---

[1] : قیصر التواریخ، ص ۲٦۸

[2]، [3]، [4] : قیصر التواریخ، ص ۲۸۹

[5]، [6]، [7] : قیصر التواریخ، ص ۲۷۱، ۲۷۲

"جاتے میں تیرے کوچہ سے قاتل خفا نہ ہو"

"جانسن کی رائے تھی کہ موت کی سزا اس طرح دی جائے کہ پہلے مجرم کی کھال اتار دی جائے پھر اسے زندہ جلا دیا جائے، کیونکہ پھانسی تو بڑی آسان موت ہے، بہت کم مسلمان ایسے تھے، جو سپاہی نظر آتے ہوں اور بچ گئے ہوں، پشاور سے لے کر، مشرقی و شمالی ھند تک کوئی مالدار، نمازی، اور مولوی ہوگا جو دھر نہ لیا گیا ہو۔" [1]

"پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں سے مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا، بہتوں کو مکان میں بند کر کے آگ لگا دی گئی۔" [2]

فتح پور کا پورا قصبہ زمین کے برابر کر دیا گیا!

◎

---

[1]: تاریخ عروج عہد انگلشیہ (ذکاء اللہ)

[2]: غدر کے ہیرو، ص ۶۲

(۱)

حضرت محل چولکھی محل میں اپنے خاص کمرے کے اندر غرقِ فکر و الم بیٹھی تھی، اتنے میں صمصام الدّولہ آیا۔!

حضرت محل نے ایک نظر اس پر ڈالی، اور پُوچھا :

"کوئی نئی خبر ——— ؟"

صمصام الدّولہ نے دل گرفتہ آواز میں کہا :

"سرکارِ عالیہ ! اب تو پانسہ بالکل پلٹ چُکا ہے، اور نئے حادثے نے تو رہی سہی کسر بھی پُوری کردی ہے !"

انتہائی حلم و سکون، اور وقار کے ساتھ حضرت محل نے دریافت کیا :

"حادثہ کیسا ؟ کیا کہنا چاہتے ہیں آپ ؟"

صمصام الدّولہ نے پریشان خاطری کے ساتھ جواب دیا :

"نیپال کا وزیرِ اعظم، ——— جنگ بہادر ——— جو عملاً وہاں کا فرماں روا ہے، اب انگریزوں کی مدد کو تیار ہوگیا ہے، چنانچہ اپنی تمام فوج اور جُملہ وسائل انگریزوں کو سپرد کردیئے ہیں، !" [1]

یہ سُن کر حضرت محل ذرا دیر چُپ رہی، ——— پھر اُس نے ہونٹ

---

[1] : تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند) ذکاء اللہ، ص ۴۶

اب تک ، !"

"آپ کا خیال درست ہے !"

"سرکارِ عالیہ ایک اور خبرِ بد بھی گوش گزار کرنا چاہتا ہوں ، ؟"

"ہم سب کچھ سُننے کو تیار ہیں ، فرمائیے !"

"مال کرشن ، جس پر سرکارِ عالیہ اس درجہ نوازش فرماتی تھیں ، غدّار ثابت ہُوا ، وہ انگریزوں سے مل گیا ہے !"

"اس دورِ ہلاکت میں سب کچھ ہو سکتا ہے ۔ ہماری بھی نگرانی رکھیئے ، کہیں ہم بھی (زہر خند کرتے ہُوئے) انگریزوں سے ساز باز نہ کر لیں ، !"

◎

چباتے ہوئے کہا :

" ٹھیک ہے ، جب قسمت بگڑتی ہے ، تو ہاتھ پاؤں دغا دے جاتے ہیں ، وہ تو پھر غیر تھا ، نہ ہمیں گلہ ہے نہ شکوہ ، ——————— ہاں تو ، اس کی فوج ظفر موج کب آ رہی ہے ؟ "

صمصام الدولہ نے عرض کیا :

" سرکارِ عالیہ ، ——————— وہ خود اپنی فوج کی کمان کرتا ہُوا داخل مُلک ہو چکا ہے ؟ "

" وُہ آ چکا ہے ؟ "

" جی ہاں ، ——————— گھاگھرا دریا سے پار اُتر کر ، ۲۵ فروری کو اودھ میں داخل ہُوا ، لیکن آتے ہی ایک حادثے سے دوچار ہُوا ، ! "

" کس حادثے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں آپ ؟ "

" جنگ بہادر تین ہزار نیپالیوں کے ساتھ کھٹمنڈو سے گورکھ پور کے شمال میں داخل ہُوا ، راستے میں ایک قلعہ مِلا ، ——————— جس پر ہمارے آدمی قابض تھے ۔ اس نے سوچا ، اسے فتح کر لینا چاہیئے ، کیوں کہ قلعے میں ہمارے صرف ۳۴ نفر تھے ۔ اس معمُولی تعداد کو زیر کر لینا کیا مشکل تھا ، نیپالی سپاہ نے حملہ کیا ، سات نیپالی ہلاک ہُوئے ، اور ۵۴ سخت مجروح ، ——————— "

" اور ہمارے اہلِ قلعہ پر کیا گزری ؟ "

" ان میں سے ایک ایک لڑتا ہُوا شہید ہُوا ، [1]

" ہمیں فخر ہے ان شہیدوں پر ، ان دین و ملّت کے شہیدوں پر ! "

" ایسے ہی جیالے ، اور جاں نثار تھے ، جن کی وجہ سے ہم جنگ جاری رکھ سکے

---

[1] : " تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند) ذکاء اللہ ، ص ۴۸

کوئی جگہ نہیں بچی تھی [1] بے شمار، اور لاتعداد، سامان لاکھوں کا آن کی آن میں لُوٹ لیتے تھے ۔ حضرت عباس کی درگاہ میں کئی پردہ نشین خواتین جاکر پناہ گزیں ہوگئی تھیں ۔ انھیں گوروں نے پکڑا ، اور آبرو ریزی کی [2] ، درگاہ کا سارا اسباب بھی لُوٹ لیا ، جتنے زیورات طلائی لُوٹے تھے وہ روپیہ تولہ مہاجنوں کے ہاتھ فروخت کردیئے ، [3]

غرض ہر طرف ایک قیامت برپا تھی ، الغیاث والامان کا شور برپا تھا ، لیکن گورے جوشِ انتقام میں ، وہ تمام ننگِ انسانیت حرکتیں کر رہے تھے جو صرف درندے کرسکتے ہیں ، !

◎

---

[1] ، [2] ، [3] : قیصر التواریخ ، ص ۳۴۶

(۲)

صمصام الدولہ کی اطلاع غلط نہیں تھی، واقعی جنگ بہادر کی تین ہزار سپاہ نے انگریزوں کا نہ صرف حوصلہ بڑھادیا، بلکہ ان کی دستگیری بھی کی۔ لارڈ کیننگ گورنر جنرل نے کہا تھا:

"اودھ، باغیوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔" [۱]

لیکن اب نیپالی سپاہ اور سکھوں کی تازہ دم کمک سے یہ مرکز کمزور سے کمزور تر ہوتا جارہا تھا۔ اب انگریزوں کے دب دبے کا یہ حال تھا کہ جہاں کہیں کوئی انگریز قتل ہوا تھا، وہاں کے لوگوں کو پکڑ کر حکم دیا تھا کہ زبان سے خون کے دھبے صاف کریں۔ پھر پھانسی دے دی جاتی تھی، [۲]

لکھنؤ میں جب انگریز فاتحانہ شان سے داخل ہوئے، تو آداب انسانیت اور احترام آدمیت، اور اپنی روائتی تہذیب و شرافت کو یکسر فراموش کر بیٹھے:

جس وقت انگریزوں کی فوج لکھنؤ میں داخل ہوئی ہے، حالت یہ تھی کہ:

"کوچہ بہ کوچہ قیامت برپا تھی۔ ——— پردہ نشین عورتیں، مائیں، نوجوان لڑکیاں، گوروں کی صورت دیکھتے ہی کنوئیں میں کود پڑیں، ——— اور ڈوب کر مرگئیں!" [۳]

شہر میں مسلسل کئی روز تک لوٹ کا سلسلہ جاری رہا، سکھوں، اور نیپالیوں سے

---

[۱]: "تاریخ عروج عہد انگلشیہ"، ص ۴۴

[۲]: "تاریخ عروج عہد انگلشیہ" (ذکاء اللہ)

[۳]: قیصر التواریخ، ص ۳۴۶

بیگم نے جواب دیا :

"بقا صرف خدا کی ذات کو ہے ، باقی سب کو فنا سے دو چار ہونا ہے ، اس کی فکر نہ کیجئے !"

ممّو خاں نے دست بستہ عرض کیا :

"اب تک تو ہم نے دشمن پر کاری ضربیں لگائیں اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا ، مگر اب ——— ؟"

"مگر اب وہ کاری ضربیں لگا رہا ہے ، اور ڈٹ کر مقابلہ کر رہا ہے ۔ ہماری بچی کھچی سپاہ میں بھی بددلی ، مایوسی اور دشمن کی دہشت پیدا ہو چکی ہے !"

حضرت محل نے ابھی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ ایک گولہ صحن میں آ کر چھٹا ، جس سے سارا محل ہل گیا ، بہت سی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے ، اور گرد و غبار بلند ہوا ذرا دیر کے بعد مطلع صاف ہوا تو حضرت محل نے ممّو خاں سے ، جو انور جنگ کا انچارج تھا ، کہا :

"بہرحال ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے !"

صمصام الدولہ نے خوشامدانہ انداز میں کہا :

"سرکارِ عالیہ ، آپ شور سُن رہی ہیں ، یہ آوازیں ؟"

حضرت محل نے جواب دیا :

"ہاں ، ——— میں بہری کبھی بھی نہیں تھی ۔ !"

"اس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن ہمارے بالکل قریب پہنچ گیا ہے !"

"میں جانتی ہوں ، !"

"جنگ محل کے ارد گرد یا آس پاس ہو رہی ہے ، !"

"یقیناً آپ کا خیال درست ہے !"

"تو اس صورت میں ———

(۴)

حالات کی ابتری بڑھتی چلی جارہی تھی، جنگ کی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے جو مشاورتی کونسل بنی تھی، وہ بھی اب عملاً ختم ہو گئی تھی۔ لکھنؤ پر ہر طرف سے انگریز سپاہ، اپنے حلیفوں اور دوستوں کی مدد سے یورش کر رہی تھی، لیکن لکھنؤ کے جیالے بھی ایسے تھے کہ ہر گلی میں، ہر کوچے میں، ہر سڑک پر، ہر گھر میں، ہر گھر کی سیڑھیوں پر دشمنوں سے کلّہ بہ کلّہ، جنگ کر رہے تھے،[1] قتل ہو رہے تھے، مٹ رہے تھے، برباد ہو رہے تھے، لیکن ہتھیار ڈال دیں، سپر انداز ہو جائیں، دشمن کی برتری تسلیم کر لیں، اسے اپنا آقا بنانے پر راضی ہو جائیں، ——— یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

اب حضرت محل کی مشاورتی کونسل صرف ممّن خاں، صمصام الدّولہ اور ممّو خاں پر مشتمل تھی، یہ بھی بڑا منچلا، دلیر اور حد درجہ وفادار شخص تھا۔ حضرت محل کو اس کی کارگزاری، اور اخلاص مکمل اعتماد تھا، !

لکھنؤ کی گرتی ہُوئی حالت، اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی یورش پر اس وقت یہ "کونسل" بیٹھی غور کر رہی تھی، چولکھی محل کے ہال کے سامنے ایک بہت بڑا برآمدہ تھا۔ حضرت محل یہیں رونق افروز تھیں۔ ممّو خاں، صمصام الدّولہ، اور ممّن خاں بھی حاضر تھے۔

ممّو خاں نے کچھ تامّل کرتے ہُوئے عرض کیا :

"سرکار عالیہ، اب لکھنؤ بچتا ہُوا نظر نہیں آتا، !"

---

[1] : جنگِ اودھ، ص ۷۰

چھتر منزل، پر بھی انگریز قابض ہو گئے، اس معرکے میں سپاہ انگریز کے ۹ سو آدمی مجروح و مقتول ہوئے، باغیوں کی تعداد اب بھی کم نہیں تھی، وہ برابر بڑھے چلے آرہے تھے، مگر انگریزوں کے پاس توپیں بہت زیادہ تھیں، اور باغیوں کے پاس بہت کم!" [1]

انگریزوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ چوکھی پر قبضہ کر لیں، یہ گویا فتح کامل تھی، انھوں نے سارا زور اسکو فتح کرنے میں لگا دیا، ایک کے بعد ایک مجاہد شہید ہو رہا تھا، مگر دشمن کے قدم روک رکھے تھے، لیکن کب تک؟ اب حالت یہ تھی کہ بظاہر چوکھی پر انگریزوں کا قبضہ چند منٹ کی بات تھی کہ عین وقت پر ممّو خاں، اپنے دست راست خان علی خاں کے ساتھ ایک ہزار سپاہیوں کو لے کر پہنچا، اور جنگ نے ایک مرتبہ پھر شدّت اختیار کر لی، اس معرکے میں جنگ بہادر بھی شریک تھا، خوب رن پڑا، خون کی ندیاں جاری تھیں، پیچھے سے جنگ بہادر نے باڑ ماری، سینکڑوں مجاہد خاک و خون میں لوٹنے لگے، خان علی خاں بھی زخمی ہوئے، مگر ممّو خاں نے اس فوج کی کمان اس طرح کی، قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود، چوکھی کو بچا لیا،!

چوکھی بچ گیا!

لیکن صاف معلوم ہو رہا تھا کہ چوکھی پر، پہلے سے بھی زیادہ شدید اور خوں ریز حملہ پھر ہوگا اور ضرور ہوگا آج نہ سہی، کل اگر نہیں تو پرسوں، انگریز اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف ہو چکے تھے کہ اب قدرت ان کے حق میں فیصلہ کر چکی ہے، بظاہر جنگ جاری ہے، لیکن اب یہ چند دن سے زیادہ جاری نہیں رہ سکتی۔ چوکھی صحیح سلامت ہے، لیکن کب تک؟ —— آخر وہ سر ہوگا، یہی وجہ تھی کہ ممّو خاں کی یلغار سے انگریز ہراساں نہیں ہوتے، جنگ بند نہیں ہوئی، رات بھر کے لیے، ملتوی ہو گئی!" ——

---

[1]: تاریخ ہندوستان (بغاوت ہند) ذکاء اللہ، ص ۵۹

"تو اس صورت میں بھی، مَیں ہتھیار ڈالنے، یا اس محل کی اقامت ترک کر دینے پر تیار نہیں ہُوں، آپ لوگ اگر لڑتے لڑتے تھک گئے ہیں تو تلوار میان میں کیجئے، دشمن سے امان طلب کر لیجئے، لیکن میرا جہاں تک تعلق ہے، مَیں تو آخر دم تک لڑتی رہُوں گی۔!" [۱]

صمصام الدولہ نے کہا :

" سرکارِ عالیہ کی یہ شجاعت، اور ہمّت ہمارے لیے باعثِ ناز اور سبق آموز ہے، مگر ہم آپ کو خطرے میں نہیں دیکھ سکتے۔!"

حضرت محل نے تیوری پر بل ڈال کر پُوچھا :

" تو کیا جنگ میں خطرے کے علاوہ بھی کچھ ہوتا ہے۔؟"

صمصام الدولہ شرمندہ سا ہو گیا۔!

ممّو خاں نے کہا :

" سرکارِ عالیہ کا ارادہ کیا ہے؟ اور اس پر کس طرح عمل درآمد ہو گا۔ اس پر بعد میں ہم گفتگو کر لیں گے، ــــ فی الحال میرا فرض یہ ہے کہ دشمن کو چولکھی محل تک نہ پہنچنے دُوں، خواہ میری جان ہی کیوں نہ کام آ جائے، لہٰذا مجھے اجازت مرحمت ہو، چولکھی محل اگر خطرے سے محفوظ ہو گیا، اور مَیں زندہ رہا تو رات کی جو مجلس مشاورت ہوتی ہے، اس میں شریک ہوں گا۔!"

یہ کہہ کر ممّو خاں بغیر جواب لیے رخصت ہو گیا۔

" بیگم (حضرت محل) کی کوٹھی (چولکھی محل) کے پاس بڑی سخت لڑائی ہوئی، ایسی کوئی لڑائی اب تک نہیں ہوئی تھی، ۹ گھنٹے تک مسلسل گولہ زنی ہوتی رہی، تب جا کر ایک دراڑ پڑی، پانچ سو باغی (مجاہد) مارے گئے، انگریزوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہُوا کہ ہڈسن صاحب ایسے زخمی ہوئے کہ زندہ نہ رہے اور ٹرم صاحب نے ایک مسجد پر قبضہ کیا، باغیوں کو گومتی کے کنارے تک بھگا یا آہنی پُل پر قبضہ کر لیا ــــ ۱۲ مارچ کو، چولکھی محل (کے ایک ذرا سے حصے پر) اور قیصر باغ کی درمیانی عمارت پر قبضہ ہُوا، تارا کی کوٹھی، موتی محل

---

[۱] : جنگِ اودھ، ص ۹۲

"اگر کوئی معجزہ رونما نہ ہوا تو چوکھی پر انگریزوں کا قبضہ ہو جائے گا!"

"مگر سرکارِ عالیہ؟"

"سرکارِ عالیہ کے لیے، میرے نزدیک اب ایک ہی راستہ کھلا ہے، لکھنؤ چھوڑ دیں، ——"

"ورنہ، ——"

"ورنہ دشمن انھیں گرفتار کرلے گا، !"

دفعتہً حضرت محل کی خشمناک آواز گونجی :

"خاموش !"

سب لوگ دہل کر خاموش ہو گئے۔ ——

حضرت محل نے ممّو خاں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :

"میرے دل میں آپ کی بڑی قدر و منزلت ہے، آپ کا خلوص، آپ کی جاں نثاری، آپ کی بہادری، ہر چیز شک و شبہ سے ماورا ہے، ——"

"بندہ نوازی ہے سرکارِ عالیہ کی!"

"نہیں، یہ حقیقت ہے، لیکن ایک بات سُن لیجئے، !"

"جی ارشاد سُن رہا ہوں!"

"میں ہار نہیں مانوں گی، ہتھیار نہیں ڈالوں گی، چوکھی کی اقامت ترک نہیں کروں گی، [1] بلا سے انگریز اس محل پر قابض ہو جائیں، مجھے گرفتار کرلیں، اور پھانسی پر چڑھا دیں، ! —— میں نے جس روز یہ جنگ شروع کی تھی، فیصلہ کر لیا تھا کہ دشمن کے سامنے شکست کا اعتراف نہیں کروں گی!"

نازو نے سوال کیا : "یہ آپ کا قطعی فیصلہ ہے سرکارِ عالیہ؟"

---

[1] : تاریخ ہندوستان (بغاوتِ ہند)

(۴)

رات کو مجلس پھر بیٹھی، ممّو خاں زندہ بچ گیا تھا، اس لیے وہ بھی حسبِ وعدہ آ گیا تھا۔ صمصام الدولہ نے نازو کو، ——— اور منّن خاں نے زمرّد کو، ——— الگ الگ سمجھایا کہ اب یہ جنگ ہاری جا چکی ہے، لہٰذا یہاں سے نکل چلنا چاہیئے۔ حضرت محل ہمارا کہا تو مانتی نہیں، شاید تمھارا مان لیں، !

چنانچہ اس مجلس میں زمرّد، اور نازو بھی بن بلائے آ گئی تھیں، اس سے پہلے بھی کبھی کبھی آ جاتی تھیں۔ مگر حضرت محل نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔

ابھی مجلس باقاعدہ شروع نہیں ہوئی تھی کہ نازو نے ممّو خاں سے پوچھا :

" آخر اب صورتِ حالات کیا ہے ؟"

ممّو خاں نے جواب دیا :

" صاف بات یہ ہے کہ اب دشمن ہم پر غالب آ چکا ہے، محفوظ فوج میں صرف ایک ہزار آدمی رہ گئے تھے، انہی کو خان علی خاں کی سرکردگی میں لے کر، ——— اور ان کی قربانی دے کر آج کی جنگ ملتوی کرانے، اور چونکہ محل کو دشمن کے قبضے سے، بچانے میں کامیابی ہو سکی ہے !"

" کل کیا ہوگا آپ کے خیال میں ؟"

" کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے ؟"

" ہاں ——— کچھ کہئے تو سہی ؟"

بات کا ہُوا کہ آپ نے ، مجھے اور میرے دوستوں کو اتنا ذلیل سمجھا کہ ہم اپنی جان بچانے کے لیے روپوش ہو جائیں ، اور آپ کو دشمن کے حوالے کر جائیں ، کیا ہماری غیرت اسے ــــــ گوارا کر سکتی ہے ؛ ہمارا مرنا جینا سب آپ کے ساتھ ہے !"

حضرت محل نے شفقت کے ساتھ ممّو خاں کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا :

" بھلا میں یہ خیال کر سکتی ہوں ؟ ــــــــــ لیکن یہ بات میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ محض اپنے لیے ، آپ جیسے وفاداروں اور سچّے دوستوں کی جان کا گاہک بنا جائے !"

نازو نے صمصام الدّولہ کی اور منّن خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا :

" ان دونوں کی کیا مجال ہے کہ آپ کا ساتھ چھوڑ سکیں ۔ میں اور زمرّد ان کا گلا گھونٹنے کو کافی ہیں !"

صمصام الدّولہ نے منّن خاں سے کہا :

نواب صاحب اپنے گلے کی خیر منائیے !"

وہ تن کر بولے :

" میری بہن نے ٹھیک کہا ، ! ــــــــ ہاں نازو ، ہاں زمرّد ، اگر ہمارے قدم ذرا دیر کو ــــــــ ڈگمگاتے دیکھنا ، تو بے شک ہمارا گلا گھونٹ دینا ، ہمیں زہر دے دینا ، ہمارے سر پر پتھر کھینچ مارنا ۔ ہم نے اپنا خون معاف کیا !!"

صمصام الدولہ نے ہنستے ہوئے کہا :

" واہ نواب صاحب ، اپنے ساتھ میرا بھی ! اسی کو کہتے ہیں :

" بخالِ هندوش بخشم سمرقند و بخارا را "

منّن خاں نے بڑا شگفتہ سا مذاق کیا :

" تو آپ سمرقند ہیں یا بخارا ؟"

حضرت محل کو بھی ہنسی آ گئی ۔ مگر ممّو خاں ویسے ہی خاموش بیٹھا ہُوا تھا ۔

حضرت محل نے بڑے تہور، اور استقلال سے جواب دیا :

" ہاں نازو !"

وہ بولی :

" تو پھر ہمیں بھی اب کچھ نہیں کہنا ہے، !"

" کیا مطلب ہے ؟ یعنی ؟"

" بس ہم اپنی سرکار عالیہ کے ساتھ ہیں، جان دے دیں گے ان کی رفاقت میں !"

" نہیں نازو یہ نہ کہو !"

پھر وہ ممّو خاں، صمصام الدّولہ اور منّن خاں کی طرف مخاطب ہو کر گویا ہوئی :

" ابھی رات کے ختم ہونے میں کچھ گھڑیاں باقی ہیں، ابھی وقت ہے، اعترافِ شکر وسپاس کے بعد میں آپ لوگوں سے التجا کرتی ہوں کہ آپ جدھر سینگ سمائیں چلے جائیں !"

ممّو خاں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایک حد تک گستاخی کے ساتھ کہا :

" بے شک ہم آپ کے خانہ زاد ہیں، لیکن نہ آپ کو ہماری توہین کرنا چاہیئے، اور نہ کم از کم میں اسے برداشت کر سکتا ہوں !"

حضرت محل نے نگاہ اٹھا کر ممّو خاں کی طرف دیکھا، اور سوال کیا :

" مَیں نے آپ کی توہین کی ہے یا آپ کی خدماتِ جلیلہ کا اعتراف کیا ہے ؟ (خفیف سے تامّل کے بعد) اب آقا اور خادم کا حجاب اٹھ چکا ہے، آپ جتنے سخت لب و لہجہ میں چاہیں، مجھ سے بات کر سکتے ہیں، !"

یہ کہتے کہتے حضرت محل کی آواز گلوگیر ہو گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

نواب ممّو خاں نے یہ کیفیت دیکھی، تو اٹھا، اور حضرت محل کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگا، اُس نے کہا :

" سرکار عالیہ زندگی کی آخری سانس تک میں آپ کا وفادار رہوں گا، مجھے صدمہ اس

فوج کا تسلّط ہوگیا!" [1]

ممّدو خاں نے صمصام الدّولہ اور ملّتی خاں سے کہا:

"آپ حضرات فوراً اٹھیئے، اور چو لکھی کے ملازم مردوں اور عورتوں کو مطلع کر دیجئے کہ فوراً محل خالی کرنا ہے، جی چاہے ہمارے ساتھ چلیں، ورنہ جہاں مرضی ہو چلے جائیں!"

پھر حضرت محل سے کہا:

"سرکارِ عالیہ، جتنا زر و جواہر آپ ساتھ لے سکتی ہیں لے چلیئے، اب یہاں ٹھہرنا خواہ مخواہ ذلت بخش موت کو دعوت دینا ہے، —— موت بُری چیز نہیں، لیکن ذلت بخش موت بُری چیز بے شک ہے!"

حضرت محل اٹھ کھڑی ہوئیں:

"آؤ نازو، آؤ زمرّد!"

---

[1] : قیصر التواریخ، ص ۳۳۳

حضرت محل نے اسے دیکھا، اور کہا :

" نواب صاحب آپ اب تک خفا ہیں ؟ ہم معذرت کرتے ہیں !"

ممّو خاں اٹھ کر آداب بجالایا، اس نے کہا :

" غلام کو کانٹوں میں نہ گھسیٹئے !"

حضرت محل بولیں :

" بہرحال یہ ساری جنگ آپ ہی نے بڑی سچائی اور بہادری کے ساتھ لڑی ہے، آپ جو مشورہ دیں گے ہمارے لیے قابلِ قبول ہوگا ۔!"

ممّو خاں نے دست بستہ عرض کیا :

" سب سے پہلے تو چولکھی خالی کر دیجئے، ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا یہ بعد میں سوچیں گے ؟"

حضرت محل نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا :

" آپ کہتے ہیں تو یہی سہی، ———— لیکن چولکھی کو چھوڑتے ہوئے بہت صدمہ ہوتا ہے۔ اس سے ایک طرح کا جذباتی تعلق پیدا ہوگیا ہے، یہیں ہماری مشاورتی کونسل کے جلسے ہُوا کرتے تھے۔ دشمن کو زک دینے کی تدبیروں پر غور ہُوا کرتا تھا، ملک کی آزادی کے پروگرام بنتے تھے، جہاد اور جنگ آزادی کو جاری رکھنے کے نئے نئے طریقے زیرِ بحث آتے تھے، اور اب اسے چھوڑنا پڑ رہا ہے،

بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دشمن کی یورش اور یلغار کا سلسلہ پھر شروع ہوگیا، کیونکہ اب صبح ہو چکی تھی۔!

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مسلسل حملوں کی تاب اب مجاہدین میں نہیں رہ گئی تھی۔ ملک کے تمام حصّوں پر اس کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا، اس نے کثیر تعداد میں آلاتِ حرب جن میں زیادہ تر توپیں تھیں۔ مع قواعد داں توپچیوں کے لکھنؤ روانہ کر دیئے، مجاہدین کے پاس جدید قسم کا اسلحہ نہ ہونے کے برابر تھا، صرف ایک معمولی سا توپ خانہ تھا، وہ کہاں تک مقابلہ کرتا، آخر شکست ہوئی اور انگریزی

جنگ کرنے کا یارا ہوتا تو لکھنؤ کیوں چھوڑتے ؟"

اب لکھنؤ میں حضرت محل کا قیام ناممکن تھا۔ چنانچہ ممّو خاں، صمصام الدولہ، منّن خاں، اور اپنے عملے اور بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ جن کی تعداد کئی ہزار تھی، حضرت محل لکھنؤ سے باہر نکلیں۔

"احمد آباد گئیں، راجہ نواب علی خاں کے گھر مہمان ہوئیں، پھر بھٹولی راجہ منور کی گڑھی میں رہیں، وہاں راجہ ہردت سنگھ کا وکیل حاضر ہوا، اس نے عرض کیا:

"ہم بہرحال آپ کے ساتھ شریک ہیں۔" چنانچہ وکیل کے ساتھ داخل بونڈی ہوئیں اور آس پاس کے علاقے پر فرماں روائی کرنے لگیں، چند روز میں جتنے لکھنؤ سے بھاگے تھے، مع سپاہ جنگی جمع ہوگئے۔ اور ملازمین قدیم وجدید آ پہنچے، جتنے اہل حرفہ اور اہلِ بازار تھے مع اجناس از خود جمع ہوئے، مثل لکھنؤ چوک آباد ہوگیا، مضافات کے زمینداروں اور تعلقداروں نے بلا طلب زرِ تحصیل بھیجنا شروع کردیا اس زرِ تحصیل کی عدم وصولیابی پر پہلے کیا کیا لڑائی ہوا کرتی تھی، سب متعجب تھے کہ ایسے وقت اضطرار و مایوسی و قطع امید میں ملک کی آمدنی کا اس طرح بے طلب پہنچنا ایک عجیب ہی بات تھی، اس مدتِ قیام میں جتنا سامان امارت شاہی تھا اور اسباب لوازمۂ ریاست سب طرح کا موجود ہوگیا، بلکہ اکثروں کے پاس جو اسباب سلطانی کسی طریق سے ہاتھ آگیا تھا، انھوں نے بے طلب، سرکار میں دے دیا، ہر شخص اپنے واسطے اس انبوہ کو صورتِ عافیت تصور کرتا تھا اور گزشتہ مصیبتیں جو لکھنؤ یا راستے میں پائی تھیں دل سے بھلا دیں[1]

لکھنؤ فتح کر کے انگریزوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جنگ ختم ہوگئی، حضرت محل کے لکھنؤ سے رخصت ہو جانے کو بھی انھوں نے اپنی کامیابی کی ایک دلیل سمجھا، لیکن انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس مسلم حکومت کی رعایا پروری مساوات، اور عدل و انصاف نے عوام خواص کے دلوں میں اس کی جڑیں کتنی دور تک پھیلا دی ہیں، کوئی بھی شکست خوردہ بادشاہ، اپنے کسی علاقے سے جان بھی سلامت نہیں لے جا سکتا۔ یہاں حضرت محل نے بونڈی میں پھر سے حکومت قائم کر لی، ایک نیا لکھنؤ آباد کر لیا اور اطمینان کیساتھ حکومت کرنے لگیں۔! اس غیر متوقع صورتِ احوال نے انگریزوں کو بے حد پریشان کر دیا۔ گورنر جنرل نے ایک نہایت

---

[1] : قیصر التواریخ، ص ۳۳۸

(۵)

حضرت محل دوسری بیگمات اور ملازم مردوں اور عورتوں کے ساتھ بھاٹک سے باہر نکلیں، اس طرح کہ وہ آگے تھیں، سب ان کے پیچھے صف بستہ، برجیس قدر ایک سپاہی کی گود میں تھے۔ پیادہ پائی کی وجہ سے ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتی اور گرتی تھیں۔ ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کر، پل مولوی گنج تک گئیں، رات کو غلام رضا کے ہاں قیام کیا، وہاں سے شرف الدولہ کے گھر گئیں۔ وہاں سے حسین آباد کی محلسرا میں آ گئیں، شام تک جتنا عملہ تھا سب حاضر ہو گیا، اسکی حفاظت کو پہرے کھڑے تھے۔

علی رضا نے حضرت محل کو ٹھہرایا تھا، اس لیے کہ وہ واجد علی شاہ کے نمک خوار تھے، ویسے انگریز بھی ان کی غیر جانبداری کے باعث ان سے بدگمان نہ تھے، چنانچہ جنرل اوٹرم کی طرف سے وہ پیام لے کر آئے:

"جنگ کا ارادہ ترک کیجیے، لکھنؤ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں، یہیں تشریف رکھیے، احترامِ شاہانہ ملحوظ رہے گا، اور شایانِ شان زندگی بسر کرنے کے مصارف نذر کیے جائیں گے!"

حضرت محل نے یہ بات نہیں مانی۔ [1]

وہ مسکرائیں اور قاصد سے کہا:

"اس پیش کش کا شکریہ، لیکن نہ اب لکھنؤ میں رعایا بن کر رہ سکتی ہوں، نہ دشمن کے خزانے سے روپیہ لے کر شاہانہ زندگی بسر کرنے کا شوق ہے، رہی جنگ نہ کرنے کی فرمائش، سو اگر ہم میں

---

[1] : قیصر التواریخ، ص ۳۳۴

مارا دیارِ غیر میں مُجھ کو وطن سے دُور

تہدید آمیز خط لکھنؤ کے چیف کمشنر کے نام بھیجا کہ آخر یہ کیا مذاق ہو رہا ہے؛ ساتھ ہی ساتھ ہر طرح کا سازو سامانِ جنگ بہ تعدادِ کثیر، اور بہت سی فوج بھی دہلی وغیرہ سے بھیج دی اور حکم دیا کہ یہ صورتِ حالات ختم ہونی چاہیئے، جو باغی شکست کھا کر بھاگے تھے، انھوں نے اگر پھر حکومت قائم کر لی ہے، تو یہ ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہے اور ہم اپنے اہلِ وطن کو اپنی اس نااہلی کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے !"

اس عتاب نامے کے بعد، کمانڈر انچیف جنرل کلائڈ فوج قاہرہ لے کر بہرائچ سے پونڈی پہنچے، حضرت محل کی بقیہ فوج اور علاقے کے زمیندار اور تعلقدار خوب لڑے، لیکن انگریزوں کی اتنی بڑی فوج کا مقابلہ مستقل طور پر کرنا اس کے لیے ناممکن تھا، آخر یہاں بھی شکست ہوئی۔!" [1]

---

[1] : قیصر التواریخ، ص ۳۴۰

(۱)

ممّو خاں نے حضرت محل سے کہا :

"سرکارِ عالیہ ہم نے یہاں بھی شکست کھائی ۔ !"

حضرت محل نے وقار کے ساتھ جواب دیا :

" جو ذرا بھی حیرت انگیز نہیں ہے !"

" میں یہی عرض کرنے والا تھا !"

" ہمارے پاس تھوڑے سے سپاہی تھے ، وہ بھی تھکے ہوئے ، زخمی ، چُور چُور ، مضافات کے زمینداروں اور تعلقداروں نے بڑے سچّے دل سے ہمارا ساتھ دیا ، لیکن ان کے پاس آزمودہ کار فوج تو تھی نہیں ، پھر ہماری یہ مختصر سی زخمی اور تھکی ہوئی ، انگریزوں کے کمانڈر انچیف کی زیرکمان لڑنے والی تازہ دم ، اور ہر طرح کے اسلحہ سے لیس فوج کا مقابلہ کب تک کر سکتی تھی ؟"

صمصام الدّولہ نے عرض کیا :

" بجا ارشاد ہُوا ۔ ہم نے ہار کر بھی ایک نقش بٹھا دیا ۔ دنیا پر ثابت کر دیا کہ آزادی کے متوالے ایسے ہوتے ہیں !"

"بے شک نواب صاحب !"

منّی خاں نے ممّو خاں سے پوچھا :

" اس آخری شکست کے بعد ہم یہاں بھی نہیں ٹھہر سکتے !"

" ظاہر ہے ۔ ——————

[illegible]

"بھلے سے وہ ہمیں کاٹ ڈالے، قتل کر دے، فنا کر دے، مگر ہم انگریز کی بالادستی نہیں قبول کر سکتے، !"

"بہت خوب، لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ جنگ بہادر نے احتیاطاً جابجا گھاٹیوں پر پہرے بٹھا رکھے ہیں، ؎ شاید اسے بھی اندیشہ ہے کہ ہم نیپال میں داخل ہونا چاہتے ہیں !"

"کوئی مضائقہ نہیں، ———— ان پہروں کے باوجود ہم نیپال میں داخل ہوں گے، !"

چنانچہ حضرت محل اپنے ہزاروں ساتھیوں کے ساتھ کوہ بٹول پر جہاں نواب آصف الدولہ کی بنائی ہوئی بارہ دری موجود تھی، پہنچ گئیں اور قیام پذیر ہو گئیں، !

دوسرے روز جنگ بہادر کا قاصد آیا، ! حضرت محل نے اسے شرفِ باریابی عطا کیا، اور پوچھا :

"کیا تم جنگ بہادر کا کوئی پیغام لائے ہو ؟"

"جی ہاں سرکارِ عالیہ !"

"تو کہو، کیا کہنا چاہتے ہو ؟"

"رانا جنگ بہادر نے سرکارِ عالیہ کے سامنے دو صورتیں اور ایک شرط رکھی ہے !"

"کہے جاؤ تم، ہم سن رہے ہیں !"

"انگریزوں سے صلح کر لیجئے، وہ اب بھی آپ کو ایک محل دینے کو، جملہ مصارف ادا کرنے کو، اور احترامِ شاہانہ ملحوظ رکھنے کو تیار ہیں !"

"(عزم و استقلال کے ساتھ) ناممکن، نامنظور، ———— اور ؟"

"دوسرے یہ کہ آپ نیپال میں سکون و خاموشی کے ساتھ اقامت اختیار کر لیں اور کسی فوجی سرگرمی کا اظہار نہ کریں !"

؎ : قیصر التواریخ، ص ۴۰۴

"پھر اب ہماری منزل کہاں ہوگی ؟"

حضرت محل نے ممّو خاں سے قبل جواب دیا :

"ہم اپنے کسی آدمی کو جو ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہو نہیں چھوڑیں گے، خواہ ایسے آدمیوں کی تعداد کتنی ہی ہو، جو ہمارا حشر ہوگا، وہی ان کا بھی ہوگا۔ ———"

"بجا ارشاد ہوا، لیکن ہم جائیں گے یہاں سے کہاں ؟"

"نیپال، ———"

نیپال کا لفظ سُن کر، ممّو خاں، صمصام الدّولہ، مَمّن خاں سب چونک پڑے، ممّو خاں نے کہا :

"یعنی دشمن کے گھر میں ؛ جنگ بہادر کے ملک میں جو ہماری شکست کا اصل سبب ہے ؟"

حضرت محل نے جواب دیا :

"ہاں نواب صاحب، بے شک نیپال نے ہمارے ساتھ دشمنی کی، جنگ بہادر نے انگریزوں کا ساتھ دے کر ہمیں برباد کیا، لیکن ہم وہیں جائیں گے !"

"لیکن اس کا سبب سرکار عالیہ ؟"

"وہ تو بالکل ظاہر ہے !"

"جی ———"

"انگریز غیر ملکی ہے، نیپال ہمارے ہی ملک کا ایک حصّہ ہے، بدیسی دشمن کے ہاتھوں ہم موت کا جام کیوں پئیں ؛ اپنے ہم وطن کا دیا ہُوا زہر کیوں نہ استعمال کریں ؟"

"بڑا قابلِ قدر جذبہ ہے !"

"مَیں انگریزوں کی صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتی !"

"ان کے اعمال ایسے ہی ہیں، لیکن ایک سوال اور ہے ؛"

"وہ کیا نواب صاحب ؟"

"کیا جنگ بہادر ہمیں نیپال میں گُھسنے دے گا ؛"

(۲)

نیپال کے ایک الگ تھلگ علاقے میں حضرت محل، اپنے ساتھیوں کے ساتھ سکوت اور خاموشی، کی زندگی بسر کر رہی تھیں، ہر وقت ان پر افسردگی سی چھائی رہتی۔ صمصام الدولہ، مَمّن خاں اور ممّو خاں، نازو اور زمرد کو اکساتے کہ کسی طرح ان کا دل بہلائیں۔ لیکن یہاں آنے کے بعد، ہنسنا تو درکنار انھوں نے مسکرانا تک چھوڑ دیا تھا، البتہ نازو اور زمرد کو اپنے پاس زیادہ سے زیادہ دیر تک بیٹھنے اور باتیں کرنے کا موقع دیتی تھیں!

لکھنؤ کے چیف کمشنر نے نیپال کے رانا کو لکھنؤ طلب کیا اور کہا :

"ہماری آپ کی دوستی میں حضرت محل کے نیپال میں قیام نے رخنہ ڈال دیا ہے، لیکن یہ رخنہ دُور ہو سکتا ہے اور ہم حضرت محل اور ان کے ساتھیوں کا وہاں قیام گوارا کر لیں گے، اگر ممّو خاں کو جو باغیوں کے کمانڈر انچیف کی حیثیت رکھتا تھا ہمارے حوالے کر دیا جائے!"

رانا کو یہ بات کھلی تو بہت کہ اس کی رفاقت کا انعام عتاب کی صُورت میں مل رہا ہے، لیکن اودھ کا حشر اس کے سامنے تھا، اُس نے کہا :

"ممّو خاں کو مَیں پیش کر دوں گا، لیکن حکمتِ عملی سے۔"

"اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"اگر ممّو خاں کو گرفتار کر کے مَیں نے پیش کرنا چاہا تو حضرت محل کی طرف سے سخت مزاحمت ہوگی، اور خون کی ندی بہ جائے گی، لیکن اگر مجھے موقع دیا جائے تو ایک مہینہ کے اندر وہ آپ کے قبضے میں ہوگا!"

"مگر یاد رکھیے اس مدت میں توسیع نہیں ہو سکتی!"

"مَیں اس کا مطالبہ بھی نہیں کروں گا!"

"کہہ دینا یہ دوسری بات ہمیں منظور ہے۔!"

"بہت خوب سرکارِ عالیہ!"

"لیکن تم کسی شرط کا ذکر بھی کر رہے تھے؟"

"جی وہ شرط یہ ہے کہ رانا نے فرمایا ہے وہ کسی قسم کی امداد و اعانت سے معذور ہیں!"

"اس کی ہم نے نہ ان سے درخواست کی تھی، نہ توقع رکھتے ہیں، بھلا ناخواندہ مہمان کی، امداد و اعانت کون کرے گا؟ —— اب تم جا سکتے ہو!"

رئیس احمد جعفری کے تاریخی ناول

الناصر

رئیس احمد جعفری

تقطیع ۵" × ۷½" ضخامت ۴۶۸ صفحات قیمت -/۶ روپے

" اندلس کی ایک تاریخی کہانی " ——— قصر الزہرا کی سربفلک دیواروں میں بیٹھنے والے کی ایک تاریخی داستان - جو ایک فسانہ ہے، کہانی ہے، اور اردو ادب کے لیے مستقل داستان ——— !

طباعت وکتابت نہایت ہی دلچسپ اور جاذبِ نظر ، !

ایک مہاجر

رئیس احمد جعفری

تقطیع ۵" × ۷½" صفحات ۳۶۸ قیمت -/۵ روپے

یہ گزشتہ انقلاب کی تاریخی روئیداد ہے ——— اس ایک کہانی میں لاکھوں مسلمانوں کی کس مپرسی، جسمانی، ذہنی اور مالی مشکلات کا عکس ہے - یہ ناول ایک پاکیزہ رُومان کو زمانے کے نشیب و فراز سے گزار کر آ... کار کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے ——— یہ ناول دل خراش بھی ہے اور جانبازی کا مرقع بھی -

سُلطانہ

رئیس احمد جعفری

تقطیع ۵½" × ۹" ضخامت ۳۰۰ صفحات قیمت -/۶ روپے

روس کے ایک مُسلمان سردارِ قبیلہ کی لڑکی نشاط خانم کی خود نوشت سرگزشت - اس کا قزاقوں کے ہاتھ لٹنا، اور ایک دن میں سارے ملک کی فرماں روا بننا، بڑا ہی غم انگیز، دردناک، دلچسپ اور دلگداز اندازِ بیان - نظر فریب سہ رنگا گرد پوش -

جنگ بہادر نیپال واپس آگیا ؛!

اب اسے ایک رکیک چال یہ سوجھی کہ ان سے ذاتی تعلقات بڑھانا شروع کر دیئے، تقریباً ہر روز ملاقات ہوتی، اور خوب خوب باتیں ہوا کرتیں۔ ایک روز ٹہلتے ہوئے یہ لوگ ایک پہاڑی کی طرف چلے، ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا، پہاڑی پر (طے شدہ پروگرام کے مطابق) ایک انگریز بیل صاحب عربی لباس پہنے چند آدمیوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا، یہ سب لوگ ممّو خاں پر ٹوٹ پڑے۔ گرفتار کر کے لکھنؤ لائے، جہاں انھیں کالے پانی کی سزا ملی۔ وہیں وفات پائی !" [1]

ممّو خاں جیسے وفادار اور جاں نثار شخص کی گرفتاری اور سزایابی نے حضرت محل کے اعصاب ہلا کر رکھ دیئے، اس حادثے کے بعد تو انھیں بالکل چپ لگ گئی۔ آخر کچھ عرصہ بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا، ——— دنیا کی بہت بڑی مجاہدۂ حریت اُٹھ گئی !

صمصام الدّولہ اور رمتی خاں اپنے ساتھیوں، سپاہیوں اور اہل وعیال کے ساتھ بدستور رہ رہے تھے، لیکن دل ان کے بھی بجھ چکے تھے، موت کے یہ بھی آرزو مند تھے، یہی حال نازو اور زمرد کا تھا کہ ہر وقت آنکھیں مینھ برساتی رہتیں، نہ وہ حاضر جوابی تھی، نہ زندہ دلی۔

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

---

[1] : تاریخ اودھ، جلد پنجم

بالاکوٹ
رئیس احمد جعفری

تقطیع ۵" × ۷½" صفحات ۵۳۰ قیمت -/۱۲ روپے

"ایک حسین وادی کے آنکھوں دیکھے حالات"

شاعر، ادیب یا آرٹسٹ اگر کسی حسین وادی سے متاثر ہو کر قلم اٹھائے تو کتنی جاذبیت ہوتی ہے اس کے الفاظ اور جنبشِ قلم میں ———— !

رئیس احمد جعفری نے موجودہ ناول بالاکوٹ کی سرسبز پہاڑیوں کے دل کش مناظر میں رہتے ہوئے ایک واقعے کے ماتحت لکھا ہے۔ یہ ناول بھی ہے اور تاریخ بھی ———— نہایت ہی دلچسپ اور مستند واقعات سے بھرپور۔

خون بہتا رہا
رئیس احمد جعفری

تقطیع ۵½" × ۹" صفحات ۵۳۶ قیمت -/۱۰ روپے

رئیس احمد جعفری صاحب کا یہ ناول ادب و انشاء کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک معرکۃ الآراء تاریخی موضوع کا حامل ہے۔ ایسا موضوع جو ہماری نئی نسلوں کے لیے ولولہ خیز بھی ہے اور حیات افروز بھی۔

مجاہد
رئیس احمد جعفری

تقطیع ۵" × ۷½" صفحات ۲۳۲ قیمت -/۶ روپے

اس ناول میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ان لرزہ خیز واقعات کو افسانوی قالب میں ڈھالا گیا ہے جنھیں ہندوستان کی سرزمین اور وہاں کے رہنے والوں کی تاریخ کا ایک خونی ورق کہنا چاہیئے۔ یہ ناول تاریخ بھی ہے اور رومانوی بھی ہے۔ سیاسی بھی ہے اور ادبی بھی۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، حیدر آباد، کراچی